جمہور مسلمانوں کے عقیدے کی خالصیت کے ساتھ
اردو زبان اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں پہلی کتاب

اِسلام، مسیحیت اَور مکالمۂ محبّت

قرآن مجید، احادیث نبوی ﷺ، اقوالِ صحابہ کرامؓ اور بائبل مقدس کے علاوہ تاریخ اسلام کی عظیم الشان بزرگ ہستیوں مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، امام غزالیؒ، شیخ ابوطالب مکیؒ، قاضی عیاضؒ، حضرت ابراہیم ادھمؒ، حضرت فریدالدین عطارؒ، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ، سر سید احمد خانؒ، علامہ محمد اقبالؒ اور پاکستان کے تمام مسالک کے قابلِ احترام علماء کرام مثلاً اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادیؒ، پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری وغیرہم کے افکار و نظریات کی روشنی میں ایک عاجزانہ کاوش۔

ڈاکٹر نعیم مُشتاق

نوریہ رضویہ پبلی کیشنز

اسلام، مسیحیت اور مکالمۂ محبت
ڈاکٹر نعیم مشتاق
نوریہ رضویہ پبلی کیشنز

بَلَغَ العُلیٰ بِکَمالِہٖ
کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمالِہٖ
حَسُنَت جَمیعُ خِصالِہٖ
صَلُّوا عَلَیہِ وَآلِہٖ

بسلسلہ مکالمۂ بین المذاہب

اِسلام، مُسیحیت اَور مکالمۂ محبّت

قرآن مجید، احادیث نبوی ﷺ، اقوالِ صحابہ کرامؓ اور بائبل مقدس

کے علاوہ تاریخ اسلام کی عظیم الشان بزرگ ہستیوں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، امام غزالیؒ، شیخ ابوطالب مکیؒ، قاضی عیاضؒ، حضرت ابراہیم ادھمؒ، حضرت فریدالدین عطارؒ، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ، سرسید احمد خانؒ، علامہ محمد اقبال اور پاکستان کے تمام مسالک کے قابل احترام علماء کرام مثلاً پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری وغیرہم کے افکار ونظریات کی روشنی میں ایک عاجزانہ کاوش۔

ڈاکٹر نعیم مُشتاق

نُوریَّہ رِضویَّہ پبلی کیشنز

۱۱۔ گنج بخش روڈ لاہور 042-7313885

بسلسلہ مکالمۂ بین المذاہب

اِسلام، مُسیحیت اَورمکالمۂ محبّت

قرآن مجید، احادیث نبوی ﷺ، اقوالِ صحابہ کرامؓ اور بائبل مقدس

کے علاوہ تاریخ اسلام کی عظیم الشان بزرگ ہستیوں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، امام غزالیؒ، شیخ ابو طالب مکیؒ، قاضی عیاضؒ، حضرت ابراہیم ادھمؒ، حضرت فریدالدین عطارؒ، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ، سرسید احمد خانؒ، علامہ محمد اقبال اور پاکستان کے تمام مسالک کے قابل احترام علماء کرام مثلاً پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی محمد شفیعؒ، ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری وغیرہم کے افکار و نظریات کی روشنی میں ایک عاجزانہ کاوش۔

ڈاکٹر نعیم مُشتاق

نُوریّہ رِضویّہ پبلی کیشنز
۱۱۔ گنج بخش روڈ لاہور 042-7313885

ISBN: 978-969-9133-00-8

نام کتاب: اسلام، مسیحیت اور مکالمہ محبت

تالیف: ڈاکٹر نعیم مشتاق

تعداد صفحات: 280

بار اوّل: جمادی الاوّل ۱۴۲۸ھ جون ۲۰۰۷ء

تعداد: 1100

کمپوزنگ: طاہر احمد عباسی، عادل نسیم

مطبع: اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور

ناشر: نوریہ رضویہ پبلی کیشنز لاہور

قیمت: 200 روپے

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

اے لوگو، ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد عورت سے پیدا کیا ہے اور اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو تو تمہاری جماعتیں اور قبیلے بنا دیے ہیں۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں سے بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے، یقین مانو کہ خدا دانا اور باخبر ہے۔

﴿سورۃ الحجرات ۴۹:۱۳﴾

کیا ہم سب کا ایک ہی باپ نہیں؟
کیا ایک ہی خدا نے ہم سب کو پیدا نہیں کیا؟

﴿ملاکی ۲:۱۰﴾

فہرست عنوانات ـ اجمالی

فہرست عنوانات ـ تفصیلی

انتساب

ہر محب وطن پاکستانی کے نام

خواہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم

جس طرح ہمارے ہاں طریقت کے سلاسل ہیں، قادری، چشتی، نقشبندی، سہروردی وغیرہ اور ہر سلسلہ کا کوئی بانی ہے، اسی طرح قائداعظمؒ سے ایک نئی طریقت کا آغاز ہوتا ہے اور وہ طریقت ہے ''پاکستانی''۔ اس طریقت میں تمام سلاسل اور تمام فرقے شامل ہیں۔ ہر ''پاکستانی'' پاکستان سے محبت کو ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔ ہمارے لیے ہمارا وطن خاکِ حرم سے کم نہیں۔

اقبال نے مسلمانوں کو وحدت افکار عطا کی اور قائداعظم نے وحدتِ کردار۔

واصف علی واصف

﴿دل دریا سمندر﴾

اظہارِ تشکر

یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتی اگر اس کے پیچھے چند مخلص احباب کی حوصلہ افزائی اور قیمتی مشورے نہ ہوے۔

محترم جناب سید ہدایت رسول قادری صاحب کی حوصلہ افزائی اور محبت نے اس کتاب کو لکھنے میں بہت مدد دی۔ اور پپلاں شریف سے محترم احسن بھائی کا مشکور ہوں کہ آپ نے کتاب پڑھ کر اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

محترم جناب تنویر احمد خان صاحب کے تخلیقی اور تنقیدی تجزیہ کی روشنی میں پوری کتاب، بالخصوص دوسرے باب میں شامل انتہائی حساس گفتگو کو ان کے مشوروں کی روشنی میں بحیثیت قاری سمجھنے کا موقع ملا اور بعض مقامات پر تو کئی صفحات ختم کر کے نئے سرے سے عبارت لکھنا پڑی تا کہ پڑھنے والے کسی بھی قسم کی اعتقادی وفکری غلط فہمی سے بچے رہیں اور کسی بھی جماعت اور مسلک کے رہنما و قائد کے حوالے سے گستاخی و بے ادبی کا تاثر نہ ابھرے اور بحث و تنقید تصوارت کے حوالہ سے ہو اور علمی تنقید کو کسی کی شخصیت پر کیچڑ اچھالنے کا بہانہ نہ بنایا جائے جیسا کہ ہمارے معاشرے میں علم و تحقیق کے نام پر یہ بیماری عام ہے۔

اس کتاب میں شامل مواد کی تخلیق میں جس قدر ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی وہ گھر میں اسی وقت میسر آ سکتی ہے جب آپ کی شریکِ حیات بھی موضوع کی ضرورت اور اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہو۔ الحمدللہ اس اعتبار سے ہم خوش نصیب ہیں کہ ہماری شریک حیات نہ صرف باصلاحیت ہیں بلکہ علمی وفکری اعتبار سے بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ کسی مزاح نگار نے لکھا ہے کہ شادی کے بعد یا تو آدمی مجذوب ہو جاتا ہے یا پھر فلسفی۔ ہم اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ہیں کہ ہماری شریک حیات کو اللہ نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ اس نے ہمیں بغیر ریاضت و مجاہدہ کے ان دونوں حالتوں سے نوازا ہے۔ بہر حال

مزاح سے قطع نظر اس کتاب کی پروف ریڈنگ، جملوں کی تراش خراش، اور حساس جملوں پر قلم کی گرفت مضبوط رکھنے میں ان کی بھی بہت محنت شامل ہے۔

ہم اُن علماء وفضلاء کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کو اپنی چشم التفات سے نواز کر اس پر تنقید وتبصرہ کیا اور اغلاط کی اصلاح فرمائی ہے۔ ہم ایسے حضرات کی خدمت میں سینٹ آگسٹین (St. Augustine) کے الفاظ میں یہ عرض کریں گے کہ ''جو شخص اس تحریر کو پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اسے خوب سمجھتا ہوں مگر مصنف کا قول درست نہیں ہے۔ بلکہ مصنف واقعات کو اپنے ذاتی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور میں اس کی رائے سے متفق نہیں۔ جو شخص ایسی بات از راہ محبت واخلاص ہمیں سمجھانے کی کوشش کرے تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے اپنی اس تالیف سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا ہے''۔

اس ضمن میں ہم بالخصوص محترم جنلب ڈاکٹر انوار حسین صدیقی، محترم جناب ڈاکٹر محمد خالد مسعود، محترم جناب احمد سلیم، محترم جناب پروفیسر محمد الیاس اعظمی، محترم جناب تنویر احمد خان اور محترم جناب خالد رحمٰن کے نہایت شکر گزار ہیں کہ اُنہوں نے اپنی نہایت مصروف زندگی میں سے قیمتی وقت نکال کر کتاب پر تبصرہ فرمایا اور اپنے تنقیدی اور تخلیقی مشوروں سے کتاب کی خامیوں کو دُور کرنے میں رہنمائی فرمائی۔

ہر مصنف کی زندگی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا کوئی براہ راست تعلق اُس کی کتاب سے نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کی رفاقت، محبت اور حوصلہ افزائی کے بغیر کتاب تو دور کی بات، شاید ایک باب بھی لکھنے کی توفیق نصیب نہ ہو۔ ہم بھی اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں کہ جن کو اللہ نے ایسے دوست احباب سے نوازا کہ اگر ان کی رفاقت اور محبت شامل حال نہ ہوتی تو یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتی۔

ان میں سب سے پہلے ہم محترم جناب عارف محمود خان صاحب کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ جن کی شفقت کے زیر سایہ یہ کتاب تکمیل کے مختلف مراحل طے کرتی رہی۔

محترم جناب ڈاکٹر عطاء اللہ کی محبت اور حوصلہ افزائی نے بھی اس کتاب کی تیاری میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

وہ دوست احباب کہ جن کے ساتھ ترکی کا سفر اور زیارات مقدسہ کی حاضری کا موقع ملا۔ ان دوستوں کی محبتوں نے سفری تکالیف سے بچائے رکھا۔ ان میں ہمارے ترکی کے میزبان اور دوستوں میں سے چند اہم نام یہ ہیں:

محترم جناب اسماعیل نازلی صاحب Mr. Ismail Nazli

محترم جناب ہارون کوکن صاحب Mr. Harun Koken

محترم جناب مہمت دُرمس صاحب Mr. Mehmet N. Durmus

محترم جناب سوات صاحب Mr. Suat Erguvan

اس کے علاوہ محترم جناب رضا خان صاحب، محترم جناب عالمگیر خان صاحب، محترم جناب اکبر صاحب، محترم جناب عارف حسین صاحب، محترم جناب کوثر اقبال صاحب، محترم جناب محمد راجہ عرفان صاحب، محترم جناب ملک اظہر صاحب، اور محترم جناب جاوید اقبال صاحب شامل ہیں۔

شریک سفر اہل محبت ہوں اور منزل بھی اعلیٰ ہو (مزاراتِ رومیؒ ومیزبان رسول ﷺ) تو ایسا سفر اپنے اندر کیسی فیوضات وبرکات کو سمیٹے ہوئے ہوگا۔ اللہ پاک نے توفیق دی تو کسی وقت یہ سفر نامہ لکھنے کا بھی ارادہ ہے۔ (انشااللہ)

ہم کرسچین سٹڈی سنٹر کے ڈائریکٹر محترم جناب محبوب صدا کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے کہ جنہوں نے کتاب کے متعلق مفید مشوروں سے نوازا۔ انہوں سٹڈی سنٹر کے پلیٹ فارم سے نفرت اور تعصب کے اندھیروں میں امن اور محبت کے پیغام کی شمع جلانے کی جرات کی ہے۔ یسوع مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ کشادہ راستہ سے داخل ہونے والے تو بہت ہیں مگر زندگی کو پہنچانے والا راستہ تنگ دروازہ سے ہو کر نکلتا ہے (متی ۷:۱۳-۱۴)۔ محبوب صدا وہ شخص ہے جس نے معاشرے میں امن اور محبت کے جذبوں کو پروان چڑھانے کے لئے تنگ دروازے کا انتخاب کیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ محبوب صدا اور اُس کی ٹیم کو اُن کی محنت کا اجر عطا فرمائے (آمین)۔

چند اور دوست جنہوں نے مسودہ پڑھ کر اپنے مفید مشوروں اور تخلیقی تجزیے سے اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مدد دی اُن میں محترم جناب منتظر سعید نوشاہی، محترم جناب مقصود احمد ڈوگر، محترم جناب منیر احمد اور محترم جناب فیض قاضی کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنے قیمتی مشوروں سے عبارتوں کو نکھارنے میں مدد دی۔ اللہ ان سب کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔

چھوٹے بھائی صابر حسین اور خالہ زاد بھائی محمود انور کا خصوصی شکر گزار ہوں کہ اُن کی ذاتی لائبریری سے کتابوں کے حصول سے تحقیق کے پریشان کن مراحل سے گذرنے میں آسانی رہی۔

اس کتاب کو چھاپنا بھی ایک جرات مندانہ فیصلہ تھا۔ مختلف مسالک اور مکاتب فکر صرف اپنے ہی مسلک کے علماء کرام کی کتابیں چھاپنا جائز سمجھتے ہیں۔ اگر کسی دوسرے مسلک کے عالم دین کی اچھی بات کا ذکر کتاب میں آ جائے تو تعصب اور نفرت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسی بات سے ملتی جلتی عبارت اپنے مسلک کے عالم کی تلاش کر کے دوسرے مسلک کے عالم دین کی بات کتاب سے نکال دی جاتی ہے تاکہ

اپنے مسلک کا ''مزاج'' خراب نہ ہو۔ محترم شجاعت رسول قادری صاحب نے اس کتاب کو چھاپ کر اپنے وسیع القلب ہونے کا ثبوت دیا ہے، اور یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ ہمیں مختلف افکار ونظریات پر بحث کرتے وقت مسلکی پہچان کو دینی پہچان کے تابع رکھنا چاہیے، اور نفرت وتعصب سے بچتے ہوئے حق اور سچ جہاں بھی ملے اسے کھلے دل و دماغ کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔

﴿پیش لفظ﴾

چراغ جلا کر پیمانہ کے نیچے نہیں بلکہ چراغدان پر رکھتے ہیں تو اس سے گھر کے سب لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے۔

﴿متی ۵:۱۵﴾

تمام تعریفوں کے لائق وہ ذات ہے جو اپنے بلند نام میں یکتا ہے: سب سے بے نیاز، سب پر فائق۔ نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ ہی وہ خود پیدا ہوا، اور نہ ہی کوئی اُس کی سلطنت میں شریک ہوسکتا ہے (سورۃ اخلاص)۔ پاک ہے وہ ذات جو رَبِّ الْعٰلَمِیْن ہے (سورہ الفاتحۃ) اور اُس کی ربوبیت کے دائرہ سے کوئی بھی باہر نہیں۔

کتنا رحیم و کریم ہے وہ رب جو ہمارے مانگنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ ہمیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے (متی ٦:٧) اور جس نے توریت اور تمام صحائف انبیاء کا مدار فقط ایک لفظ ''محبت'' پر رکھا (متی ۲۲:۳۴-۴۰)۔

فرعون کے لاکھوں نیزے موسیٰ علیہ السلام کی ایک لاٹھی نے توڑ دیئے۔ جالینوس کی لاکھوں طبّیں تھیں مگر یسوع علیہ السلام اور اُن کی پھونک کے سامنے بیکار تھیں۔ اشعار کے لاکھوں دیوان تھے جو اُس امی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے سامنے موجبِ ننگ تھے، ایسی اونچی شان والے خدا پر کوئی کیسے قربان نہ جائے۔ الغرض نقش نقاش کی کیا تعریف کرے گا جبکہ اِس کی سوچ و نگاہ اُسی کی بخشی ہوئی ہے۔

اور کیسی نرالی شان ہے اُس رب کریم کی کہ اُس نے اپنی رحمت کے اظہار کے لئے اپنے پیارے انبیاء میں سے ایک کو دل کا فروتن اور حلیم بنا کر (متی ۱۱:۲۹) تو دوسرے کو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْن (انبیاء ۲۱:۱۰۷) بنا کر ہمارے درمیان مبعوث فرمایا۔ کیسی اعلیٰ شان والے تھے وہ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْن کہ جنہوں نے اپنی پیروی اور محبت کی شرائط میں اولین شرط یسوع مسیح علیہ السلام سے محبت اور اُن پر ایمان رکھی۔

پاکیزہ و اعلیٰ ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے محبوب انبیاء پر توریت، زبور، انجیل اور قرآن نازل فرمائیں جنہوں نے یقین کے چہرے سے اپنی آیات کے دلائل سے نقاب اٹھا دی اور یقین کی جلوہ گاہ پر ہدایت کے جھنڈے نصب فرمائے تا کہ اپنے کلام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دیں اور ان کے دلائل کے بعد مخالفین کے دلائل بے کار ہو جائیں جو سطحیات کا سہارا لیتے ہیں اور اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھانا چاہتے ہیں، حالانکہ خدا اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا خواہ مخالفین کو یہ کتنا ہی ناگوار لگے۔

کتاب میں پیش کیے گئے خیالات ونظریات

یہ کتاب مندرجہ ذیل مواقع پر پیش کیے گئے خیالات ونظریات اور مباحثوں سے حاصل ہونے والے نتائج پر مبنی ہے۔اس میں راقم الحروف کے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مذہبی جماعتوں کے حالات کے چشم دید واقعات اور مشاہداتی تجربات بھی شامل ہیں۔بہرحال یہاں ان میں سے چند ایک مواقع کا مختصر ذکر درج ہے۔

۱۔اکتوبر ۲۰۰۴ء کو ہمیں ترکی کے شہر استنبول میں بدیع الزماں سعید نورسیؒ کی حیات وتعلیمات پر بین الاقوامی سیمپوزیم میں مقالہ پڑھنے کی دعوت آئی۔وہاں پر ہم نے ''مقصدِ حیات کی تلاش: بدیع الزماں نورسیؒ کی تعلیمات کی روشنی میں'' پر مقالہ پڑھا جو بعدازاں کتابی شکل میں ترکی سے شائع بھی ہوا۔وہاں پر بھی دیگر غیرمسلم اہل علم بالخصوص یہودی اور مسیحی علماء سے ہمیں مکالمہ بین المذاہب پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔اس کتاب میں اس گفتگو کے اہم نکات شامل ہیں۔

۲۔جون ۲۰۰۵ء میں امریکہ کی ریاست Connecticuit میں کیتھولک چرچ نے ''موجودہ دور میں اخلاقی اقدار کا تحفظ: یہودی، مسیحی، بدھ مت اور اسلامی نقطۂ نظر'' کے موضوع پر ایک سیمینار کروایا۔اس میں ہر مذہب کے اہل فکر ودانش بھی شریک ہوئے۔راقم الحروف نے اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔اس موقع پر بھی گفتگو بین المذاہب ہم آہنگی اور ڈائیلاگ کا رُخ اختیار کرگئی۔اس موضوع پر کی گئی گفتگو کے اہم نکات بھی اس کتاب میں شامل کردیے گئے ہیں۔

۳۔اکتوبر ۲۰۰۴ء میں ہمیں یونیسکو کے زیراہتمام امریکی یونیورسٹی University of Connecticuit میں انسانی حقوق کی سالانہ کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔بھارت سے بھی کئی اہل علم اس میں شریک ہوئے۔پاکستان سے صرف بندہ ناچیز شامل تھا جو نہ صرف ہمارے لیے بلکہ پاکستان کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی۔اس کانفرنس میں ہمیں دوسرے اہل علم حضرات سے بین المذاہب ڈائیلاگ پر گفتگو کا موقع ملا۔ہمارے مقالہ میں اکثر بحث اسی موضوع پر تھی۔اس کتاب میں اس کانفرنس سے حاصل ہونے والے تجربات بھی شامل ہیں۔

۴۔جون ۲۰۰۵ء میں ہمارے دورہ امریکہ کے دوران ہمیں امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر Arlington میں واقع بپٹسٹ چرچ (First Baptist Church) کی طرف سے ایک سیمینار میں شرکت کی دعوت آئی۔سیمینار کا موضوع تھا ''شخصیت یسوع مسیح علیہ السلام از روئے اسلام اور مسیحیت''۔سیمینار میں ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت از روئے قرآن واسلام بیان کرنا تھی۔مسیحی نقطہ نظر کی

وضاحت کے لیے کولمبیا انٹرنیشنل یونیورسٹی میں اسلامک سٹڈیز کے ڈائریکٹر وارن لارسن (Warren Larson) کو خصوصی طور پر بلایا گیا تھا۔ہم یہ ساری کارروائی شروع میں سیمینار کے حوالے سے سمجھتے تھے مگر وہاں سب انتظامات اور پروگرام کی ترتیب مناظراتی نکلی۔وارن لارسن سے پہلے سے کوئی واقفیت نہ تھی، لہٰذا فوراً کولمبیا یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر موصوف کے تعارف میں یہ لکھا تھا ''وارن لارسن کا تعلق کینیڈا سے ہے۔پاکستان میں تبلیغ مسیحیت میں بڑے سرگرم رہے ہیں۔بالخصوص ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں تبلیغ مسیحیت بڑی شدت اور گرم جوشی سے کرتے رہے ہیں۔اگست ۱۹۹۱ء میں انہیں اور ان کی فیملی کو پاکستان کے نیوکلیر مقامات کی جاسوسی، ان کی گاڑی سے حساس مقامات کے خفیہ نقشے برآمد ہونے اور عوام الناس میں سرعام شعار اسلام کی توہین کے الزام میں پاکستان سے فوراً نکال دیا گیا۔واللہ اعلم

ان صاحب کے رویے سے سب حاضرین نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ انہیں اسلام اور پاکستان سے شدید نفرت ہے۔اور اس نفرت کو وارن لارسن مسیحی ایمان اور غیرت کا حصہ سمجھتے ہیں۔اس سارے مناظراتی سیمینار کو جو دو دن جاری رہا کی ویڈیو بھی بنائی جاتی رہی۔اس مناظرے میں جو ہم نے مسیحی مسلم مکالمہ کی نوعیت اور مناظراتی رویوں پر جو تنقید کی اور جو متبادل طرز فکر پیش کیا اس کے بھی اہم نکات اس کتاب میں شامل کردیے گئے ہیں۔

۵۔محترم جناب سید ہدایت رسول قادری صاحب کے زیرانتظام فیصل آباد کی بغدادی مسجد، گلبرگ میں ہر سال ہونے والے ''اسلام اور قادیانیت'' کے موضوع پر تربیتی کورسز میں ''اسلام اور مسیحیت'' کے موضوع پر چند لیکچرز دینے کا اتفاق ہوا۔ان لیکچرز میں بھی جن خیالات ونظریات کو سامعین کے سامنے پیش کرنے کا موقع ملا وہ بھی اس کتاب میں شامل کردیے گئے ہیں۔

۶۔یہ کتاب سب سے پہلے ایک مختصر مضمون کی شکل میں اسی عنوان سے کرسچن سٹڈی سنٹر راولپنڈی کے تحت چھپنے والے علمی وتحقیقی مجلہ ''المشیر'' (۲۰۰۴ء) میں دو اقساط میں چھپی۔بعدازاں کرسچن سٹڈی سنٹر کے تحت ہونے والے مختلف سیمینارز اور ورکشاپس میں بھی اس موضوع پر جن خیالات وتصورات کو نکھارنے کا موقع ملا وہ بھی اس کتاب میں شامل کردیے گئے ہیں۔

۷۔اس کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں مسیحی مسلم مکالمہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے تحت ہونے والے مختلف سیمینار، سمپوزیم وغیرہ میں، ہم نے جن خیالات ونظریات کا اظہار کیا اس کے بھی اہم نکات اس کتاب میں شامل ہیں۔علاوہ ازیں خلوت وجلوت میں چلتے پھرتے غور وفکر سے جو کچھ سمجھ میں آیا وہ بھی اس کتاب کی نذر کردیا ہے۔

ہمارا عقیدہ و مسلک

اس کتاب میں آپ کو قرآن مجید، احادیث نبوی ﷺ، اقوالِ صحابہ کرامؓ، بائبل مقدس کے علاوہ تاریخ اسلام کی عظیم الشان بزرگ ہستیوں مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، امام غزالیؒ، شیخ ابوطالب مکیؒ، قاضی عیاضؒ، حضرت ابراہیم ادھمؒ، حضرت فریدالدین عطارؒ، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ، سر سید احمد خانؒ، علامہ محمد اقبال اور پاکستان کے تمام مسالک کے قابل احترام علماء کرام مثلاً اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ، پیر محمد کرم شاہ الازہری، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیعؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری وغیرہ کے افکار ونظریات کے حوالے بھی ملیں گے۔

اس قدر وسیع اور متضاد حلقوں سے علماء کرام کی تحقیقات سے اقتباسات نقل کرنے سے ہوسکتا ہے کہ قاری کو ہمارے عقیدہ و مسلک سے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ اپنا عقیدہ و مسلک بھی یہاں بیان کر دیں۔ ہم فقہ میں امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کے پیروکار ہیں اور اہلسنت والجماعت کے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری روحانی نسبت مجذوب ولی کامل حضرت بابا باقر سائیںؒ سے ہے۔ آپ کا مزار مبارک چونیاں (ضلع قصور) میں واقع ہے۔

مطالعہ اسلام اور مسیحیت: مسلکی یا دینی موضوع

اسلام اور مسیحیت کا تقابلی مطالعہ مسلکی نہیں بلکہ دینی موضوع ہے۔ اگر کوئی شخص محض اپنے مسلک کے علمائے کرام کے حوالے دے کر اور دوسرے مسالک کے علماء کی علمی خدمات کو یکسر فراموش کر کے تقابلی مطالعہ کرتا ہے تا کہ اس کے اپنے مسلک کی دیگر مسالک پر برتری ثابت ہو تو ہمارے نزدیک اس شخص سے بڑا جاہل اور تنگ نظر کوئی نہیں۔ یہ شخص حضور ﷺ کی رحمت کو دین کے وسیع دائرے سے نکال کر مسلک کے تنگ دائرے میں قید کر دینا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہم نے روایتی سوچ اور تحقیقی طرز فکر سے بچتے ہوئے اسلام اور مسیحیت کے حوالے سے بات کی ہے۔ دیوبندیت اور مسیحیت، بریلویت اور مسیحیت، وہابیت اور مسیحیت، شیعیت اور مسیحیت وغیرہ کو موضوع گفتگو نہیں بنایا۔ اس لیے کہ یہ موضوعات کسی دوسرے عنوان کے تحت تو شاید مطالعہ و تحقیق کے لیے قابل قبول ہوں مگر اسلام اور مسیحیت کے تقابلی مطالعہ کے عنوان کے تحت نہیں آ سکتے۔

ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام کے مختلف مسالک کے بزرگوں کے اختلافات اگر بزرگوں تک ہی

محدود رہیں اور انہیں عوام الناس کی سطح پر نہ لایا جائے تو معاشرے کی اکثر بیماریوں کا علاج با آسانی ممکن ہے۔ کم از کم ایک طالب علم (ہمارے سمیت) کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حصولِ علم اور خدمتِ دین کے مقصد سے توجہ ہٹا کر بزرگوں کی ذات پر کیچڑ اچھالنے میں مصروف ہو جائے۔ بزرگوں کے مسلکی اختلافات بزرگوں کی سطح پر تہذیب و تمیز کے دائرے میں رہ کر علمی اور تحقیقی طرز بیان اختیار کر کے بھی بیان کیے جا سکتے ہیں۔ انہیں عوام الناس کی سطح پر لا کر جلسے جلوسوں میں بیان کر کے ہم "مسلکی غیرت" کے نام پر اور کتنے معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیلیں گے۔ غیر مسلک کی بات تو بڑی دُور، قرآن مجید نے تو غیر مذاہب کے باطل عقائد و نظریات پر بھی اختلاف کرتے وقت تہذیب و اخلاق کے تقاضوں پر سختی سے عمل پیرا رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اسی جذبے کے تحت اس کتاب میں آپ کو کم و بیش سارے مسالک کے قابل احترام علماء کرام کے حوالہ جات ملیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ﴿وَعَنْ اَبِی ھریرہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکمۃ الحکمۃ ضالۃ الحکیم فحیث وجدھا فھو احق بھا﴾ حکمت مومن کی گمشدہ مطاع ہے، وہ اسے جہاں پائے، اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے (مشکوٰۃ شریف: باب العلم، حدیث ۲۰۴)۔ لہٰذا اچھی اور درست بات اگر غیر مسلم بھی کہے تو مسلمان کے لیے قابل قبول ہونی چاہیے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> یہ ضعیف العقل لوگوں کی عادت ہے کہ حق کو لوگوں کی نسبت سے پہچانتے ہیں، لوگوں کو حق کی وجہ سے نہیں اور عقلمند آدمی حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پیروی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حق و راستی آدمیوں سے نہیں پہچانی جاتی۔ تم پہلے حق کو پہچانو! پھر اہل حق کو بھی پہچان لو گے۔ (المنقدمن الضلال، ص۲۹)

انسان جب حق شناس ہو جائے تو اس میں مذہبی و مسلکی تعصب ختم ہو جاتا ہے۔ تفسیر و تشریح کے مسلکی اختلافات کے باوجود ذرا ایک دوسرے سے ادب و احترام سے پیش آ کر تو دیکھیں، اللہ تعالیٰ آپ کو کس قدر علم و حکمت کی دولت سے نوازتے ہیں، جبکہ بے ادب لوگ دین و مسلک کی بدنامی اور معاشرے میں فتنہ و فساد کا باعث بنتے ہیں۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

ازخدا جوئیم توفیق ادب — ہم خدا سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں
بے ادب محروم ماند از فضل رب — بے ادب خدا کے فضل سے محروم رہا
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد — بے ادب نے نہ صرف اپنے آپ کو خراب کیا
بلکہ آتش درہمہ آفاق زد — بلکہ اس نے تمام اطراف میں آگ لگا دی

کتاب کا عنوان، ابواب کی تقسیم اور حوالہ جات

ہم نے اس کتاب کے لیے ﴿اسلام، مسیحیت اور مکالمۂ محبت﴾ کا عنوان منتخب کیا ہے۔ پورے عنوان میں لفظ ''محبت'' کے اندر پوری کتاب کا پیغام شامل ہے اور پوری کتاب اسی تصورِ محبت کے ارد گرد گھومتی ہے جس کی تبلیغ حضور یسوع مسیح علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں فرمائی۔ اس کتاب میں مقدمہ کے علاوہ ۴ ابواب شامل ہیں جن کا مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

مقدمہ:

مقدمہ میں ہم نے پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی اُس مذہبی انتہا پسندی کا جائزہ لیا ہے جس کا قرآن وسنت سے ہرگز ہرگز کوئی تعلق نہیں، اور اپنے اس نقطہ نظر کو آیات قرآنی، احادیثِ مبارکہ اور پاکستان کے تمام مسالک کے قابل احترام علمائے کرام کے افکار ونظریات کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ یہ مخصوص مذہبی انتہا پسندی طالبان کے دورِ حکومت میں منظر عام پر آئی اور اس انتہا پسندی کو قرآن مجید کی بعض آیات اور احادیث نبویہ کی تفسیر میں معنوی تحریف کر کے جمہور مسلمانوں کا نقطہ نظر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

باب اول:

اس باب میں ہم نے ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کے دور کا جائزہ لیا ہے اور اُس کی روشنی میں موجودہ دور میں مسیحی مسلم مکالمہ کے عمل پر اس کے اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ برطانوی دورِ حکومت میں مسیحی پادریوں کا سرِعام اسلام اور بانی اسلام کی ذات پر رکیک حملے کرنے، مسلمانوں کو اعلانیہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کا چیلنج کرنا اور مسلمان علماء حق کی ایک جماعت کا سامنے آنا اور ان مسیحی مشنریوں کو شکست فاش دینے پر گفتگو شامل ہے۔ پادری فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کا اپنی کتاب کو لکھ کر مسلمان علماء کی بے بسی کے ڈھنڈورے پیٹنا اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا ''اظہار الحق'' لکھ کر ہمیشہ کے لے اس فتنے کا خاتمہ فرما دینے پر بھی گفتگو شامل ہے۔ ہمارے نزدیک دُنیائے تصوف میں جو مقام مثنوی مولائے رومؒ کا ہے وہی مقام مطالعہ اسلام ومسیحیت کے میدان میں رحمت اللہ کیرانویؒ کی کتاب ''اظہار الحق'' کا ہے۔ اسی باب میں ہم نے ۱۸۵۷ء کے دورِ مناظرات کے پس منظر میں موجودہ کاوشوں کا جائزہ لے کر ''مناظرہ'' اور ''مکالمہ'' کی اصطلاحوں میں فرق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز حضور

یسوع مسیح علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کے پیغام محبت کی روشنی میں مکالمہ محبت کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

باب دوم:

اس باب میں ہم نے مکالمہ محبت کی راہ میں رکاوٹوں اور پاکستان کی موجودہ مذہبی و معاشرتی صورت حال کا جائزہ لینے کی جسارت کی ہے۔ اس باب کے اندر مختلف عنوانات کے تحت ہم نے قرآن، حدیث اور بزرگان دین کے اقوالات وافکار کی روشنی میں پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے خود ساختہ مذہبی نظریات اور رویوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

یہ باب پوری کتاب میں سب سے زیادہ حساس گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں ہم یہاں ایک وضاحت کرتے چلیں۔ ہمارے نزدیک وہ تمام مذہبی جماعتیں اور افراد جو نیک نیتی اور خلوص دل سے اسلام اور پاکستان کی خدمت کر رہے ہیں، ہمارے ملک اور معاشرے کے لئے باعث افتخار ہیں۔ ہم اللہ کی بارگاہ میں دُعا گو ہیں کہ اللہ پاک اُنہیں اُن کے نیک مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ اس ملک اور معاشرے میں اللہ کے نیک بندے موجود ہیں تو اسلام پاکستان میں زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گا۔

مگر بعض اوقات اچھی جماعت میں بُرے افراد کی شمولیت نہ صرف کسی دینی جماعت کے image کو خراب کرتی ہے بلکہ کارکنوں میں بھی Frustation پیدا کرتی ہے۔ ہمارا یہ پورا باب ہمارے ذاتی مشاہدے اور غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اس سے کلیتہً اتفاق ضروری بھی نہیں ہے۔ بہرحال یہ صرف ایک دعوت فکر ہے۔ ہم اپنے تنقیدی تجزیہ کی وجوہات کو ساغر صدیقی کے ان خوبصورت اشعار میں یوں بیان کریں گے کہ:

تہذیب جنوں کار پہ تنقید کا حق ہے
گرتی ہوئی دیوار پہ تنقید کا حق ہے
ہاں! میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے
مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے
میں یاد دلاتا ہوں شکایت نہیں کرتا
بھولے ہوئے اقرار پہ تنقید کا حق ہے
مجروح جو کر دے دل انساں کی حقیقت
اس شوخی گفتار پہ تنقید کا حق ہے

باب ۳:

اس باب میں ہم نے مکالمہ محبت کیلئے قرآن مجید اور بائبل مقدس کے متفقہ عقائد ونظریات کی بنیاد پر چار تصورات پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر محبت و پیار کے رشتے استوار کئے جا سکتے ہیں۔ اسلام اور مسیحیت دونوں مذاہب انسان کو اشرف المخلوقات مانتے ہیں مگر صرف اُسی وقت جب وہ اللہ کی مخلوق کی بہتری اور بھلائی کے لئے زندہ رہے، وگرنہ دونوں کے متفقہ فتویٰ کے مطابق وہ جانوروں سے بھی بدتر مخلوق ہے۔

باب ۴:

اس باب میں ہم نے مغربی میڈیا میں 9/11 کے واقعہ کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف توہین آمیز جو مہم چلائی ہے اُس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ڈنمارک کے اخبار میں چھپنے والے کارٹون ایشو پر ہم نے پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر اس کے خلاف ردعمل کا جائزہ بھی لیا ہے۔ بالخصوص پاکستانی علماء و صحافی حلقوں کی طرف سے جو ردعمل سامنے آیا اس کو مکمل محفوظ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے تاکہ قاری کو ایک بھرپور تصویر نظر آ سکے اور بعد ازاں مسیحی مسلم مکالمہ کے میدان میں طالب علموں کے لئے راہنمائی بھی فراہم ہو سکے۔ اس کے علاوہ پوپ کے اسلام کے خلاف متنازعہ بیان کا بھی مختصر جائزہ لیا ہے۔

باب ۵:

اس پہلے ایڈیشن میں یہ باب ابھی آپ کو پڑھنے کو نہیں ملے گا۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ اس کتاب کے چار ابواب مکمل کرنے کے بعد ہم نے مسودہ اسلام آباد کے مختلف اہل علم حضرات کی خدمت میں بطور تبصرہ پیش کیا۔ انہیں میں سے ایک حضرت کی خدمت میں مسودہ برائے تبصرہ پیش کیا۔ آپ نے مسودہ کافی دن اپنے پاس رکھا اور کسی جواب کے نوازنے سے بھی درگذر کرتے رہے۔

بار بار ٹیلی فون پر رابطہ کرنے پر آپ نے ایک دِن اُکتاہٹ کے عالم میں فرمایا کہ ''ان دنوں قدرے مصروفیت ہے لہذا اگر ہو سکے تو کتاب چھپنے کے بعد آپ کو تبصرہ بھیج دوں گا''۔ ہم نے ادباً گزارش کی کہ حضور! پھر مسودہ ہی واپس کر دیں۔ آپ نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے جواباً فرمایا کہ مسودہ واپس لینے کی کیا ضرورت ہے، کیا آپ کے پاس دوسری کاپی موجود نہیں ہے؟ ہم نے بتایا کہ راقم

الحروف کافی غریب آدمی ہے اور تبصرہ کے لئے مسودات کی ایک سے زائد کاپیاں کروانا قدرت سے باہر ہے۔ اسی ایک مسودہ سے کام چل رہا ہے۔ آپ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ مسودہ اپنے دفتری ملازم کے ہاتھ بھجوا رہے ہیں۔ اس گفتگو کے کئی دن بعد تک بھی مسودہ موصول نہ ہوا۔

بالآخر تنگ آ کر میں ایک دن محترم کے دفتر میں سیدھا پہنچ گیا۔ آپ نے انتہائی ''عاجزی'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے مسودہ اپنے ڈسپیچ رائیڈر کے ساتھ باقی ماندہ ڈاک کے ساتھ مجھے بھجوایا تھا مگر راستے میں کہیں گر گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا دوسری ڈاک بھی ساتھ ہی گری ہے یا پھر یہ ''فضیلت'' صرف میرے مسودہ کو ہی حاصل ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں صرف مسودہ ہی گم ہوا ہے اور بقیہ ڈاک سلامت رہی ہے۔

یہ حضرت پاکستان کے ایک نہایت اعلیٰ حکومتی تعلیمی ادارے کے سربراہ ہیں اور پاکستان کے علمی حلقوں میں اپنا مقام رکھتے ہیں اور حکومت پاکستان ان کو اعلیٰ اعزازات سے بھی نواز چکی ہے۔

اپنے مسودہ کی ''گمشدگی'' کا حال سن کر ہمارے دل پر وہی بیتی جو اُس والد پر بیتی ہے جسے یہ بتایا جائے کہ تمہارا ایک بچہ گم ہو گیا ہے۔

کتاب چھپنے سے پہلے ہی اُس مسودہ کی گم شدگی نہایت ناگوار گزری۔ پانچواں باب ادھورا چھوڑ کر اسے جلدی جلدی چھپوانے کے انتظامات کئے۔ اس کا ISBN نمبر لگوایا، اخبار میں گم شدگی کی اطلاع چھپوائی اور اللہ سے دُعا کی کہ یہ ''گم شدہ'' مسودہ کسی ردی فروش کے ہاتھ تو لگ جائے کسی ''اہل علم'' کے ہاتھ نہ لگے۔

چنانچہ فیصلہ کیا کہ اسے پانچویں باب کے بغیر ہی چھاپ دیا جائے اور دوسرے ایڈیشن میں پانچویں باب کو مکمل کر کے شائع کر دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانچویں باب کے مکمل کرنے تک پوری کتاب کسی اور کے نام سے چھپ کر مارکیٹ میں آ جائے۔ کتاب میں اکثر خامیاں آپ کو اسی عجلت کی وجہ سے نظر آئیں گی۔

باب ۵ میں ہم نے 9/11 کے حادثے کے نام پر امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ کی حقیقت پر لکھا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق (جسے ہمارا پاکستانی میڈیا اتنی اہمیت نہیں دیتا کہ جتنی اس کی ضرورت ہے)۔ امریکہ کی موجودہ دہشت گردی کے خلاف جنگ درحقیقت ایک مذہبی جنگ ہے جو صرف اور صرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری ہے جس کے سیاسی مقاصد میں اسرائیلی ریاست کا مزید زمینی فروغ اور تحفظ ہے۔ حالیہ اسرائیل لبنان جنگ اور امریکی خارجہ پالیسی کا اُس میں گھناؤنا کردار اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکی خارجہ پالیسی اور وائٹ ہاؤس اس وقت صہیونی مسیحیت کے جنونی

وتشدد انتہا پسند طبقے کے ہاتھ میں ہے جو عالمی حالات و واقعات کو بائبل مقدس کی کتاب دانی ایل اور کتاب مکاشفہ کی پیشنگوئیوں کی روشنی میں پرکھتا ہے اور ان کتابوں کی پیشن گوئیوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ساری امریکی سیاست اور ذرائع کو استعمال کر رہا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور مغربی دنیا کے بے شمار اخباروں کے اداریے۔ دستاویزی فلمیں اور ہزاروں کتابیں اس پر واضح ثبوت ہیں۔ ایران کے جوہری پروگرام پر امریکی و برطانوی دباؤ بھی درحقیقت اسرائیل کی صیہونی ریاست کے تحفظ کے لیے ہے۔ صیہونی یہودی بڑی کامیابی سے امریکی اور برطانوی حکومتوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ اس باب میں ہم نے مختصراً اس موضوع پر بحث کی ہے۔ ہم اس پر اپنے انگریزی مضمون "America's War on Terrorism" میں قدرے تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ مزید تفصیل ہم اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن میں درج کریں گے، انشااللہ۔

ضمیمہ

آخر میں ضمیمہ کے تحت اپنا ایک طنز و مزاح پر مبنی مختصر مضمون ''تعلیم یافتہ نظر آنے کے جدید طریقے'' شاملِ کتاب کر دیا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے کی بے شمار معاشرتی بیماریوں میں سے ایک بیماری جو آج کل عروج پر جا رہی ہے کہ انگریزی زبان کے چند جملے بولنے کی صلاحیت حاصل کر لینے اور انگریزی ادب کی چند کتب پڑھ کر ہم لوگ اپنے آپ کو ''تعلیم یافتہ'' اور ''روشن خیال'' سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

آج ہمارے فریب نفس کا یہ حال ہے کہ چند جملے لکھنے آ جائیں تو خود کو غزالی اور رازی اور چند آنسوں آنکھوں سے ٹپک پڑیں تو اپنے آپ کو رومی و عطار سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار گدھے تعلیمی درسگاہوں میں اور نجی ٹی وی چینلز پر لیکچرز دینے میں مصروف ہیں۔ اہل علم وصحبت ان کی دولتی مارنے والی فطرت سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

ہم نے اپنے اس مضمون میں اس ''تعلیم یافتہ دولتی مار طبقہ'' پر طنز کیا ہے جو مشکلات کے حل میں مدد کی بجائے محض ان کو اچھال کر اپنی دکانداری چمکا رہے ہیں۔ اُمید ہے آپ کو یہ پسند آئے گا۔

کتاب کی چند خصوصیات

مجموعی طور پر ہمارے نزدیک اس کتاب کی چند ایک خصوصیات ہیں جنہیں ہم نہایت ادب اور احترام کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

۱۔ الحمدللہ ہم یہ دعویٰ کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ اس پوری کتاب میں آپ کو جمہور مسلمانوں کے عقائد و نظریات سے ہٹ کر کوئی بات نہیں ملے گی۔ باب دوئم میں پاکستان کی دینی جماعتوں کا ہمارا تجزیہ مشاہداتی اور تجرباتی ہے، اس سے اختلاف ممکن ہے اور یہ اختلاف نقطہ نظر کا ہی ہو سکتا ہے۔ ہم نے اپنی گفتگو کی بنیاد اپنے ذاتی قرآن وسنت کے فہم پر ہی رکھی ہے۔ قرآن وسنت پر ہم سے بہتر نظر رکھنے والے احباب ہم سے اختلافِ رائے کا حق رکھتے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر فقط اتنا ہے کہ شریعت کے متفقہ اور بنیادی عقائد کے خلاف ہم نے الحمدللہ کوئی بات نہیں لکھی۔ اس ضمن میں اگر کسی صاحبِ نظر کو ہماری کوئی کوتاہی نظر آئے تو ہماری ضرور رہنمائی فرمائیں۔

۲۔ اُردو زبان میں مسیحی مُسلم مناظراتی بحث و مباحثہ کی روایتی روش سے ہٹ کر اسلامی عقائد و نظریات کی خالصیت کے ساتھ (ہماری ناقص معلومات کے مطابق) یہ برصغیر پاک و ہند میں پہلی کتاب ہے۔ اس موضوع پر اس قدر تفصیل سے شرح و بسط کے ساتھ کوئی دوسری تحریر ہماری نظروں سے نہیں گزری۔ اگر کسی اہل علم کی نظروں سے کوئی ایسی تحریر گزری ہو تو راقم الحروف کو بھی اس سے فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب فرمائیں۔

۳۔ مسیحی عقائد و نظریات اور بائبل مقدس کے متن کا استعمال ہم نے خلوص نیت کی بنیاد پر کیا ہے۔ راقم الحروف مسیحی مذہب پر اظہار رائے کی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہم نے کتاب میں جہاں بھی بائبل مقدس اور مسیحی علمائے دین کے حوالے دیئے ہیں، ہمارا نقطہ نظر مسیحی علمائے دین کو بھی پسند آئے گا۔ البتہ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہماری کسی کوتاہی کی صورت میں ہماری راہنمائی ضرور فرمائی جائے گی۔

حوالہ جات:

قرآن مجید اور بائبل مقدس کے حوالہ جات عبارت کے ساتھ ہی درج کر دیے گئے ہیں۔ البتہ دوسرے حوالہ جات ہر باب کے آخر میں لے آئے ہیں۔ کتاب میں ہم نے بائبل مقدس کا اردو ترجمہ بائبل سوسائٹی انارکلی-لاہور کے ترجمہ سے لیا ہے جبکہ قرآنی متن کے ترجمہ کے لیے ''عرفان القرآن'' کے ترجمے کو فوقیت دی ہے، جو اعتقادی اعتبار سے محفوظ ترین اور جمہور مسلمانوں کے صحیح عقیدے کا ترجمان ہے، اور جدید دور کے علمی وفکری تقاضوں کو احسن طریقے سے پورا کرتا ہے۔

اس کتاب میں جن تاریخی زمانوں کا ذکر آیا ہے اُن میں سے کسی زمانے یا عہد پر نہ تو ہم سند ہیں اور نہ ہی اس کے خصوصی محقق۔ مزید برآں اس کتاب میں ہم نے جن مصادر سے ان واقعات کو اخذ کیا

ہے، اُن کا پورا پورا حوالہ دے دیا ہے۔ ایسے حوالہ جات کے تلاش کرنے میں جو مبہم اور ناکافی تھے ہم نے بڑی پریشانی اٹھائی ہے اور بڑا وقت صرف کیا ہے۔ اس لئے ہم قارئین کو اس قسم کی پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں۔ عام قارئین ان تفصیلی حوالہ جات کو شاید شوقِ خودنمائی پر محمول کریں گے مگر کیا عجب ہے کہ کوئی شائقِ علم ایسا ہو جو کسی بیان کی تصدیق کرنا چاہے یا کسی مضمون کی مزید تحقیق کی خواہش رکھتا ہو ایسے شائق کو مفصل حوالہ جات زحمت سے بچائیں گے (انشاءاللہ)۔

یہ کتاب اُردو زبان میں کیوں؟

اس موضوع پر انگریزی زبان پر کافی مواد موجود ہے مگر اُردو زبان اہلسنت والجماعت کے عقیدے کی خالصیت کے ساتھ (ہماری ناقص معلومات کے مطابق) تاریخ اسلام اور پاکستان کے تمام قابلِ احترام علمائے کرام کی آراء و نظریات پر مبنی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن اہلِ مغرب کے قاری کے علمی ذوق کے مطابق تقریباً تیار ہے۔ مگر اُردو ایڈیشن کو پہلے شائع کرنے کے پیچھے وہ جذبہ کارفرما ہے جس کی طرف ممتاز مورخ شیخ محمد اکرام نے اشارہ فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

> ہندوستان کے ان تمام اہلِ قلم کو، جنہوں نے قومی مصلحتوں یا اپنی مجبوریوں کی بنا پر انگریزی کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا ہے، اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ دورِ حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں کی ادبی اور علمی زبان اُردو ہے اور جو کوئی اسے ترک کر کے کسی اور زبان (مثلاً انگریزی یا عربی) میں تصنیف و تالیف کرے۔ اسے قوم سرآنکھوں پر بٹھائے، لیکن دل میں جگہ نہیں دیتی۔ یہ حال سید امیر علی کا تھا اور یہی تلخ تجربہ مسٹر صلاح الدین خدا بخش کو ہوا۔ جن کی پرمغز اور عالمانہ تصانیف سے بہت تھوڑے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔
>
> بے شک ہر نیک کام اپنا اجر خود ہوتا ہے اور خاص خاص ضرورتوں کے لیے ایک غیر متداول ذریعۂ اظہار بھی اختیار کرنا پڑتا ہے، لیکن جو اہلِ فکر قوم کے دل و دماغ کو متاثر کرنا چاہتے ہیں، انہیں عبرانی و سریانی کو چھوڑ کر اُردو کو اپنی زبان اور جابلقا و جابلسا کو چھوڑ کر پاکستان و ہندوستان کو اپنا دیس بنانا پڑے گا۔ (شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص ۱۷۶-۱۷۷)

انگریزی زبان کے اپنے فوائد ہیں۔ علمی و فکری حلقۂ ذوق وسیع ہے۔ مگر اپنے لوگوں کا اور اپنی سرزمین کا پہلا حق ہے، لہٰذا عوام الناس کے فائدہ عام کے لیے اسے پہلے اُردو میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اللہ پاک کی توفیق اور فضل سے انشاءاللہ انگریزی ایڈیشن بھی جلد ہی منظرِ عام پر آجائے گا۔

مکالمۂ محبت یا بین المذاہب ہم آہنگی

اس کتاب میں مختلف مقامات پر مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً مکالمہ، مکالمۂ محبت، بین المذاہب ہم آہنگی، مسیحی مسلم مکالمہ وغیرہ۔ ان سب الفاظ سے ہماری ایک ہی مراد ہے۔ یعنی مثبت ماحول میں پیار و محبت کے جذبات کے تحت معاشرہ اور افراد کی بہتری کے لیے باہمی گفتگو و مذاکرات۔

خصوصی دُعا بوسیلہ حضرت ابوایوب انصاریؓ

الحمدللہ ہم نے جب بھی اسلام کی خدمت میں کوئی تحریر لکھی خواہ وہ کسی مضمون کی شکل میں ہو یا کتاب کی شکل میں، ہمیں کسی نہ کسی بزرگ کی درگارہ پر حاضری ضرور نصیب ہوئی۔ ہماری پہلی کتاب حضرت جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کے اقتباسات پر مشتمل تھی جو ہم نے عالمانہ طرز پر لکھنے کی بجائے ایک عام آدمی کے ذوق کو مدِنظر رکھ کر لکھی۔ کتاب لکھنے کے دوران یہ دُعا کی تھی کہ مولانا رومیؒ سے تعارف تو آپ کی مثنوی کے حوالے سے ہو گیا ہے، اب آپ کے مزار اقدس کی زیارت سے آنکھیں بھی ٹھنڈی ہو جائیں۔

چنانچہ کتاب چھپنے کے بعد راقم الحروف کو ترکی سے ایک بین الاقوامی کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کی دعوت آئی۔ کانفرنس میں شرکت کے بعد ترکی کے میزبان کی رفاقت میں قونیہ شریف میں مولانا رومیؒ کے مزار اقدس پر حاضری نصیب ہوئی۔ قبرانور کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر قلبی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ قبرانور سے نظریں ملانے کی دیر تھی کہ آپ کے فیض سے ہمارا دل و دماغ منور ہو گیا۔ آپ کے مزار اقدس پر حاضری کے بعد آپ کے پیرومرشد حضرت شمس تبریزؒ کے مزار اقدس پر بھی حاضری نصیب ہوئی، جو مولانا رومیؒ کے مزار سے تھوڑے فاصلے پر موجود ہے۔

اس کتاب ﴿اسلام، مسیحیت اور مکالمۂ محبت﴾ کی تیاری کے دوران دوسری مرتبہ ترکی سے دعوت نامہ آیا تو مسودہ کتاب کے ہمراہ پھر قونیہ روانگی نصیب ہوئی۔ دوران سفر ہوائی جہاز میں کتاب پر کام کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ مولاناؒ کے مزار اقدس پر حاضری نصیب ہوئی تو آپؒ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ حضور! اگر آپ بندوبست فرما دیں تو میزبان رسول ﷺ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار اقدس پر بھی حاضری نصیب ہو جائے۔ شیڈول کے مطابق تو ہماری واپسی قونیہ سے انقرہ اور پھر انقرا سے براہ راست اسلام آباد تھی۔ جب کہ آپ کا مزار مبارک استنبول کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ بہرحال دُعا سے فارغ ہونے کے بعد وہیں قبرانور کے سامنے بیٹھ کر حصول برکت کے لئے اس کتاب کے چند صفحے

تحریر کیئے۔

دوسرے دن ہمارے ترکی میزبان نے ہمیں بتایا کہ پروگرام میں ایک تبدیلی ہوئی ہے اور اب ہم براستہ استنبول سے اسلام آباد واپس جائیں گے۔ اور ہم نے دُعا کی قبولیت کو اپنے اور اس کتاب کی تخلیق کے حق میں نیک شگون جانا اور ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی شخصیت مسلمانوں کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ چونکہ اس کتاب سے مسیحی قارئین بھی مستفیض ہوں گے لہذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ کی شخصیت کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جائے۔

آپؓ کا نام ''خالد ابنِ زیدؓ'' اور ''ابو ایوب'' کنیت تھی۔ آپؓ ہجرت نبوی سے اکتیس برس قبل یثرب (مدینہ منورہ) میں پیدا ہوئے۔ آپؓ انصارِ مدینہ کے قبیلہ خزرج کی ایک شاخ ''بنونجار'' سے تعلق رکھتے تھے اور خاندان ''بنونجار'' کے رئیس تھے۔ آپؓ ہی وہ خوش نصیب صحابی ہیں جن کو آنحضرت ﷺ کی ہجرت مدینہ کے بعد ایک مہینے تک نبی کریم ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، حضور ﷺ کی ناقہ (اونٹنی) آپؓ ہی کے مکان پر آ کر رکی تھی۔

جب سے رومی بادشاہ قسطنطین (Constantine) نے تیسری صدی عیسوی میں مسیحی مذہب قبول کر کے اس شہر کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا اُس وقت سے اس کا نام ''قسطنطنیہ'' (Constantinople) ہو گیا تھا، اور یہ بیک وقت بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) اور مسیحی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز بن گیا تھا۔

حضرت عثمان ذولنورینؓ کے عہد خلافت میں قیصر روم (Constantine) نے مسلمانوں کے خلاف خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ اس نے پانچ سو جہازوں کا ایک زبردست جنگی بیڑا شام کے ساحلوں پر حملہ کے لئے بھیجا۔ امیر معاویہؓ والی شام نے امیر المومنینؓ کی اجازت سے ان کا سامنا کیا اور قیصر روم کو بری طرح عبرت ناک شکست دی۔ بعد ازاں امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کی سربراہی میں ایک لشکر قسطنطنیہ پر حملہ کے لئے بھیجا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ اس لشکر میں دیگر جلیل القدر صحابہ کے ساتھ شامل تھے۔

یہ مسلمانوں کی طرف سے قسطنطنیہ کا سب سے پہلا محاصرہ تھا۔ جن دنوں اسلامی لشکر قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ یورپ کی آب و ہوا مسلمانوں کی طبائع پر بڑا برا اثر ڈال رہی تھی۔ یہاں تک کہ مجاہدین کی کثیر تعداد بیمار ہو گئی۔ بہت سے مجاہدین بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسی موقع پر حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی سخت بیمار ہو گئے اور بحالت بیماری آپؓ نے وفات پائی۔ قسطنطنیہ کے گرد جنگ سات سال تک جاری رہی اور اس دوران کسی سال آپ نے وفات پائی۔

حضرت ابوایوب انصاری کی وفات سے مسلمانوں پر رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ امیر لشکر نے خود نماز

جنازہ پڑھائی اور پھر تمام فوج ہتھیار سجا کر آپ کی میت کو قسطنطنیہ کی دیوار کے عین نیچے لے گئے اور وہاں اسلام کے اس بطل جلیل کو سپرد خاک کر دیا۔ آپ کی تدفین رات کے وقت عمل میں آئی۔ تدفین کے بعد امیر لشکر کے حکم سے آپ کی قبر زمین کے برابر کر دی گئی تا کہ رومی مزار مبارک کے ساتھ کوئی بے ادبی نہ کر سکیں۔ روایت کے مطابق قیصر کو رات کے وقت مسلمانوں کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو اس نے قاصد بھیج کر دریافت کیا کہ رات کو کیا معاملہ تھا۔ مسلمان چونکہ سچ بولنے کے عادی تھے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے پیشوائے اعظم ﷺ کے ایک بزرگ صحابیؓ کا انتقال ہو گیا تھا، ہم لوگ ان کی تدفین میں مصروف تھے۔

قیصر نے کہلا بھیجا کہ تم لوگ یہاں سے جاؤ گے تو ہم قبر کھود کر ان کی ہڈیاں باہر پھینک دیں گے۔ قیصر کے گستاخانہ کلام پر مسلمانوں کا خون کھول اٹھا۔ یزید نے قیصر کو پیغام بھیجا کہ ''اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو خدا کی قسم یاد رکھو کہ مسلمانوں کی وسیع الحدود حکومت میں جتنے گرجے ہیں سب کو منہدم کر دیا جائے گا اور عیسائیوں کی قبروں کو اکھاڑ پھینکا جائے گا۔''

یزید کے اس انتباہ کا قیصر پر خاطر خواہ اثر ہوا اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ''میں تمہاری دینی غیرت و حمیت کا امتحان لے رہا تھا۔ کنواری مریم کی قسم! ہم تمہارے نبی ﷺ کے صحابی کی قبر کا احترام اور اس کی حفاظت کریں گے۔ مورخین کا بیان ہے کہ رومیوں نے فی الواقع اپنے عہد کا احترام کیا۔ روایت میں تو یہاں تک ہے کہ قیصر روم نے خود حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار اقدس پر قبہ تعمیر کرایا۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چلے گئے۔ فتح قسطنطنیہ کی سعادت اللہ تعالیٰ نے تقریباً آٹھ سو سال بعد سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھ رکھی تھی۔ امتداد زمانہ سے حضرت ابوایوبؓ کا مزار مبارک زمین میں مستور ہو گیا اور سالہا سال تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ میزبان رسول ﷺ کا جسد مبارک کہاں مدفون ہے۔ لیکن دنیا کے ہر مسلمان کو یہ علم تھا کہ اسلام کا یہ بطل جلیل فصیل قسطنطنیہ کے سائے میں مدفون ہے۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے فوراً بعد حضرت ابوایوبؓ کی جائے لحد کی تلاش شروع کر دی (سلطان قسطنطنیہ میں ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو جمعہ کے روز داخل ہوئے)۔ کئی میل زمین کو کھدوانا آسان کام نہ تھا، چنانچہ فتح کے تیسرے دن سلطان نے شیخ العصر شیخ شمس الدینؒ سے التجا کی کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی تُربت کی تلاش میں میری مدد فرمایئے۔

شیخ نے فرمایا کہ میں نے فصیل کے باہر ایک جگہ نور دیکھا ہے جو زمین سے آسمان تک جا رہا تھا کیا عجب کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی جائے لحد یہی ہو۔ یہ فرما کر حضرت مذکورہ مقام پر تشریف لے گئے اور وہاں بیٹھ کر کافی دیر تک مراقبہ کیا اور پھر سر اٹھا کر فرمایا، ''اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی روح اقدس سے ملنے کی سعادت نصیب کی۔ انہوںؓ نے مسلمانوں کو اس فتح عظیم پر مبارکباد دی

ہے۔

سلطان نے عرض کی ''حضرت! اس بندہ کو بھی کوئی ایسی علامت دکھایئے جس سے میرا دل مطمئن ہو جائے۔'' حضرت شیخ نے پھر مراقبہ کیا اور تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر فرمایا: ''اس مقام کو کھودو، یقین ہے کہ اسی جگہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر مبارک ہے۔'' سلطان کے حکم سے اسی وقت اس جگہ کو کھودا گیا۔ سطح زمین سے چند فٹ نیچے سنگِ مرمر کا ایک کتبہ نکلا اس پر عبرانی زبان میں کچھ الفاظ کندہ تھے۔ عبرانی زبان جاننے والوں نے یہ الفاظ پڑھے تو معلوم ہوا کہ یہی حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر ہے۔

نوجوان سلطان جس نے ابھی اپنی عمر کی صرف تئیس (۲۳) بہاریں دیکھی تھیں۔ اپنے آقا و مولا امام الانبیاء ﷺ کے اس عظیم المرتبت اور جامع فضائل صحابیؓ کی جائے مدفن دیکھ کر فرطِ مسرت سے بیخود ہو گیا اور بے اختیار سجدہ شکر میں گر پڑا۔ ہر لشکری اس احساس میں ڈوب گیا کہ اس فتح کے اصل قائد وہ مقدس صحابیؓ ہیں جو آٹھ سو سال سے فصیل قسطنطنیہ کے پاس اس اسلامی لشکر کا انتظار کر رہے ہیں جو اس فصیل کو عبور کرے گا۔

سلطان نے اس مقام پر ایک عظیم الشان گنبد تعمیر کرایا اور اس کے قریب ایک جامع مسجد میں گیا اور نماز ادا کی۔ نماز کے بعد شیخ شمس الدین نے سلطان کے ہاتھ میں تلوار دی اور اسے دُعائے خیر و برکت دی۔ اس کے بعد صدیوں تک یہ رسم رہی کہ ترکی کا جو سلطان تخت نشین ہوتا وہ پہلے جامع ابوایوبؓ میں حاضر ہوتا اور شیخ العصر شمس الدین کی عطا کردہ تلوار اپنی کمر پر باندھتا۔ اس کے بعد باضابطہ اس کی تخت نشینی کا اعلان کیا جاتا۔ اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں جب جدید جمہوریت کی بنیاد رکھی تو اس رسم کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

قسطنطنیہ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ گو ترکی کا دارالحکومت یہاں سے انقرہ منتقل ہو چکا ہے لیکن حضرت ابوایوب انصاری کی ابدی آرام گاہ ہونے کی وجہ سے اس شہر کو ''شہرت عام اور بقائے دوام'' کا جو درجہ مل چکا ہے اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ قسطنطنیہ کا خوشنما اور عظیم الشان گھاٹ (گولڈن ہارن یا شاخ زریں) جس خلیج کے دہانہ پر واقع ہے وہ بھی ''خلیج ابوایوب'' کے نام سے موسوم ہے۔ قسطنطنیہ کے جس محلے میں حضرت ابوایوبؓ کا مزار ہے وہ گولڈن ہارن کے بائیں کنارہ پر واقع ہے۔ مزار مبارک کی عمارت نہایت رفیع الشان ہے۔ درگاہ میں ہزاروں کبوتر ادھر ادھر اڑتے نظر آتے ہیں۔ قبر کا تعویذ زمین کی سطح سے کم و بیش چھ فٹ اونچا ہے۔ اس کے اردگرد نہایت خوبصورت جالی لگی ہوئی ہے۔ مزار کی پوری عمارت منقش ہے، اعلیٰ درجہ کی تزئین، دیدہ زیب پھول اور خوبصورت گلکاری۔ مزار پر نہایت بیش قیمت اور نفیس چادر پڑی رہتی ہے اور چاروں طرف بیسیوں کتبے لٹکے ہوئے

ہیں ان کتبوں کا خط اتنا پاکیزہ ہے کہ دیکھ کر آنکھوں میں نور آتا ہے اور ترکی کے خوشنویسوں کی مہارت فن کی داد دینی پڑتی ہے۔ مزارِ مبارک پر ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

مزار مبارک کے قریب ایک قبرستان ہے جو گورستان ابوایوب انصاریؓ کے نام سے مشہور ہے۔ اس گورستان میں دفن ہونا بڑی سعادت کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کئی صحابہ کرامؓ کے علاوہ ترکی کے کئی اکابر اور مشاہیر علما و مشائخ اس قبرستان میں دفن ہیں۔ ترک اس قبرستان میں دفن ہونے کو باعث سعادت و مغفرت سمجھتے ہیں۔

اس روضہء مبارک کے قریب ہی سلطان محمد فاتح کی تعمیر کردہ عظیم الشان جامع آج بھی موجود ہے (ترک مسجد کو جامع کہتے ہیں)۔ جامع ابوایوبؓ کی عمارت اور صحن بہت وسیع ہے۔ نماز کے اوقات میں یہاں بہت رونق ہوتی ہے۔ خاص طور پر جمعہ کے دن تو کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ بالخصوص رمضان کے مہینے میں قراء کی جماعتیں باری باری تلاوت قرآن میں مصروف رہتی ہیں۔ ترکوں کو قرآن پڑھنے اور سننے کا بے حد شوق ہے۔ لوگ نماز کے اوقات کے علاوہ بھی مسجد میں تلاوت قرآن سننے کے لئے آتے ہیں اور ہمہ تن گوش ہو کر کلام خداوندی سنتے ہیں۔

مزار ابوایوبؓ کی طرح جامع ایوب بھی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ مسجد تقریباً ۵۰۰ سال پرانی ہے۔ مسجد اور مزار شریف کے درمیان دو قدیم درخت ہیں جن کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ وہ بھی تقریباً ۵۰۰ سال پرانے ہیں۔ ترک حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار مبارک اور جامع ابوایوب کی بیحد تعظیم کرتے ہیں۔

ہمارے پروگرام میں خوشگوار تبدیلی کے باعث استنبول پہنچ کر دوسری صبح بروز اتوار ہم نماز فجر سے پہلے میزبان رسول ﷺ کے مزار پر حاضری کے لئے پہنچے۔ آپؓ کے مزار شریف کے ساتھ ہی ملحقہ جامع ایوب میں نماز فجر با جماعت ادا کی۔ جماعت کے بعد امام سمیت تمام نمازی آپؓ کے مزار اقدس کے سامنے جمع ہو گئے اور امام صاحب نے اجتماعی دُعا فرمائی۔ جس میں تمام عالم اسلام بالخصوص پاکستان کے لئے خصوصی دعا کی گئی۔ دُعا کے بعد آپؓ کے مزار اقدس کے دروازے ہر عام و خاص کے لئے کھول دیئے گئے۔ ہم نے بھی آپؓ کے مزار مبارک کے منظر سے دل و دماغ منور کیے۔ دل میں یہ خیال آیا کہ نبی کریم ﷺ کے صحابی (ابوایوب انصاریؓ) اور عاشق (مولانا رومیؒ) کے مزاراتِ مبارکہ پر اللہ کی رحمت کا یہ حال ہے اور ہر عام و خاص کو جس طرح فیضیاب کیا جا رہا ہے تو نبی کریم ﷺ کی بارگاہ کا کیا مقام ہوگا؟ اللہ سے دُعا ہے کہ بارگاہ نبوی ﷺ میں بھی حاضری کا کبھی موقع نصیب ہو جائے۔ (آمین)

میزبان رسول ﷺ کے مزار اقدس پر مسودہ کتاب ہاتھ میں لے کر دُعا کی کہ یا اللہ! اسے ہر عام و خاص کے لئے فائدہ مند کر اور مصنف کے لئے شفاعت کا ذریعہ بنا۔ یہاں بھی حصول برکت کے لئے

چند صفحے آپ کے مزار اقدس کی پُر معطر فضاؤں میں لکھے۔

وطن واپسی پر حضرت داتا گنج بخشؒ اور اپنے پیر و مرشد حضرت بابا باقر سائیںؒ کے مزارات اقدس پر بھی اس کتاب کے چند صفحات حصول برکت کے لئے لکھے اور دُعا کی۔

ہماری دُعائیں کہاں تک قبول ہوئیں یہ فیصلہ ہم قاری پر چھوڑتے ہیں۔ مگر ہم فقط اتنی گزارش کریں گے کہ اس حساس موضوع پر یہ کتاب اللہ کی توفیق اور بزرگان دین کے فیض کے بغیر لکھنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور کمزور بھی۔ اس لیے اسے ہمیشہ اصلاح کا محتاج اور طلب گار رہنا چاہیے۔ کتاب کی ساری خوبیاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور بزرگان دین کے فضل کا نتیجہ ہیں۔ جبکہ خامیاں اس عاجز کی نالائقی اور نااہلیت کی وجہ سے ہیں۔ اگر آپ کو اس کتاب میں کسی بھی حوالے سے اصلاح کا کوئی پہلو نظر آئے تو ہماری ضرور رہنمائی فرمایے گا تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔ اس کتاب کی تکمیل بھی ماہ ربیع الاول کے مقدس مہینہ میں ہو رہی ہے، اللہ اسے سب کے لیے مفید بنائے (آمین)۔

مکالمہ محبت کا بیج

کاذب ماحول میں صادق کی زندگی ایک کربلا سے کم نہیں۔ ایک شیخ نے اپنے مرید کو خرقۂ خلافت عطا کیا اور اسے کسی بستی میں تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ کو اطلاع ملی کہ ان کا مرید بڑا کامیاب ہے۔ سب لوگ اس سے خوش ہیں۔ شیخ نے مرید کو طلب کیا اور کہا کہ خرقۂ خلافت واپس کرے۔ مرید نے شیخ سے ناراضگی کا سبب دریافت کیا۔ شیخ نے کہا ''سنا ہے کہ سب لوگ تجھ سے خوش ہیں''۔ مرید نے کہا ''آپ کی مہربانی ہے''۔ شیخ نے غصہ سے کہا کہ ''سب لوگوں کا خوش ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے سچ بولنا چھوڑ دیا ہے''۔ چونکہ سچی بات سننے پر ہر شخص قادر نہیں ہوتا اس لیے سچ بولنے پر سبھی خوش نہیں ہوتے۔ اس لیے منافق اس انسان کو کہتے ہیں جو مومنوں اور کافروں میں بیک وقت مقبول ہونا چاہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

بر سماع راست ہر کس چیر نیست — سچی بات سننے پر ہر شخص قادر نہیں ہے
طُعمہ ہر مُرغکے انجیر نیست — انجیر، ہر حقیر پرندہ کی خوراک نہیں ہے

بلکہ سچ بولنے پر تو بعض اوقات صورت حال یہ ہو جاتی ہے کہ بقول اقبال:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلماں ہوں میں

اس لئے ضروری نہیں کہ ہماری یہ کتاب پڑھ کر سبھی خوش ہوں۔ یہ کتاب جہاں ناراضگی کا سبب بنے گی وہاں کئی افراد کے ذہنوں میں ہلچل بھی پیدا کرے گی۔ یہ کتاب دعوتِ عام بھی ہے کہ ہم اپنے خود ساختہ عقائد و نظریات پر نظر ثانی کریں۔ اس کتاب سے مکمل فائدہ اٹھانے کے لیے توجہ کا ارتکاز نہایت ضروری ہے۔ دورانِ مطالعہ شعور کے بیدار رکھنے سے آپ کو فقروں اور الفاظ کے باہمی رشتوں کا تعلق بھی سمجھ میں آئے گا اور بعض احباب کو فقروں کے پیچھے چھپی ہوئی داستانیں بھی یاد آئیں گی۔ اور بعض کے لیے تو یہ کتاب آئینے کا کام بھی دے گی۔ اور بعض احباب کے لیے یہ وہ نیا راستہ ہے جس پر سفر کرنے کی توفیق بہت کم خوش نصیبوں کو ہوئی ہے۔

حضرت یسوع مسیح علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ ہر کوئی آپ کی بات سن کر ایمان نہیں لاتا۔ آپ نے تمثیلاً فرمایا:

﴿۔۔۔دیکھو ایک بونے والا بیج بونے نکلا۔ اور بوتے وقت کچھ دانے راہ کے کنارے گرے اور پرندوں نے آ کر چگ لیا۔ اور کچھ پتھریلی زمین پر گرے جہاں ان کو بہت مٹی نہ ملی اور گہری مٹی نہ ملنے کے سبب جلد اُگ آئے۔ اور جب سورج نکلا تو جل گئے۔ اور جڑ نہ ہونے کے سبب سے سوکھ گئے۔ اور کچھ جھاڑیوں میں گرے اور جھاڑیوں نے بڑھ کر ان کو دبا لیا۔ اور کچھ اچھی زمین پر گرے اور پھل لائے۔ کچھ سو گنا، کچھ ساٹھ گنا، کچھ تیس گنا۔ جس کے کان ہوں وہ سن لے۔﴾ متی ۱۳:۳-۹

ہم نے یسوع مسیح علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے **مکالمہ محبت کا بیج** پھینکا ہے، دیکھیے یہ کہاں کہاں گرتا ہے، اور کتنا پھل لاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سیدھے راستے پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

راہنمائی اور دعاؤں کا طلب گار

نعیم مشتاق

مارچ، ۲۰۰۷

nmushtaq786@gmail.com
0321-5309332
(0092+346-5135376)

مقدمہ

تو ہوس میں آ کر کتابوں سے اپنا کلام ترتیب دیتا ہے اور پھر اس پر بات کرتا ہے۔
اگر تیری کتاب ضائع ہو جائے تو تُو کیا کرے گا یا تیری کتاب میں آگ لگ جائے یا تیرا وہ چراغ بجھ جائے جس سے تُو کتاب دیکھ رہا ہے؟ جب تیرا گھڑا ٹوٹ جائے اور اس کا پانی بہہ جائے تو کیا کرے گا؟

جس نے علم سیکھا اور عمل کیا اور اس پر قائم رہا تو وہ اس کے دل میں اللہ عزوجل کا نور روشن کرنے کا چقماق اور سرچشمہ بن جاتا ہے جو اسے بھی ضیاء بخشتا ہے اور دوسروں کو بھی۔

پرے ہٹو! اے نفس وہوا کے ہاتھوں مولفہ کتابوں کے بیٹو! افسوس ہے تم پر۔ تم مخصوص تنازعات میں پڑے رہتے ہو، توڑنے میں لگے رہتے ہو، ہلاک کرتے ہو اور اپنے حصے کا فرض پورا نہیں کرتے۔ تمہاری کوششوں سے صورت حال میں کیسے تبدیلی آئے؟ مومن و مسلمان بنو۔

حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ

﴿ملفوظات، الفتح الربانی﴾

اگر ہم برصغیر پاک و ہند میں مسیحی مسلم مکالمہ کی گذشتہ دوسو سالہ تاریخ کا بغور جائزہ لیں تو مسیحی مسلم مکالمہ مندرجہ ذیل موضوعات کے ارد گرد گھومتا ہوا نظر آئے گا۔ مثلاً:

۱۔ بائبل یا قرآن۔ کلام الٰہی کونسی کتاب ہے؟

۲۔ کیا مسیح خدا ہے؟

۳۔ کیا تثلیث فی التوحید درست عقیدہ ہے یا صرف عقیدہ توحید؟

۴۔ کیا احادیث نبوی ﷺ قابل اعتماد ہیں؟

۵۔ کیا حضور ﷺ نبی کریم خدا کے سچے اور آخری نبی ہیں؟

۶۔ مسیحیت کا بانی کون ہے، یسوع مسیح علیہ السلام یا پولس رسول؟

ان سارے موضوعات کو اور ان سے متعلقہ مباحث کا اگر بغور جائزہ لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مسیحی مسلم مکالمہ کا Focus اور موضوع "**علم العقائد**" ہی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اس نوعیت کے مکالمہ میں مندرجہ ذیل رویے بڑی پختگی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

مثلاً:

۱۔ ہم درست ہیں اور آپ غلط

۲۔ ہماری نیت درست ہے اور آپ کی خراب

۳۔ ہم امن پسند ہیں اور آپ دہشت گرد

۴۔ ہم مومن ہیں اور آپ مشرک و کافر

۵۔ ہم جنتی ہیں اور آپ جہنمی

یہی طرز فکر (Attitude) ہمیں آج کے چند مسیحی اور مسلم مبلغین میں بھی ملتا ہے اگر آپ تقاریر اور بحث و مباحثہ کی وڈیو دیکھیں تو آپ کو مندرجہ بالا طرز فکر واضح طور پر نظر آئے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کی بعض مذہبی جماعتوں کا طرز عمل بھی اصلاح معاشرہ کے حوالے سے مختلف نہیں۔ یہ کتاب اسی طرز فکر اور طرز عمل کی اعتقادی وفکری حوالے سے تجزیہ پر مشتمل ہے۔ سردست اس طرز فکر کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

بنیاد پرستی کیا ہے؟

ہمارے ملک کے ایک نامور مذہبی عالم، سیاسی لیڈر اور سینیٹر محترم مولانا سمیع الحق صاحب سے ایک جاپانی صحافی نے سوال کیا کہ یہ بنیاد پرستی کیا ہے؟ تو مولانا نے جواب میں فرمایا:

> جناب! بنیاد پرستی کی آواز امریکہ کی ایک من گھڑت اصطلاح ہے۔ ہر مذہب کے اصول ہوتے ہیں، عقیدے کے لحاظ سے، روایات کے لحاظ سے، اخلاق کے لحاظ سے، اور کردار کے لحاظ سے اور ہر مذہب اپنے پیروکاروں کو بنیادی اصولوں کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اور رسول کریم ﷺ نے مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیمات کے ذریعے ان بنیادی اصولوں سے وابستگی ضروری قرار دی ہے۔ تو امریکہ اس کو بنیاد پرستی کہہ رہا ہے حالانکہ وہ خود بنیاد پرست ہے جب کہ ان کا مذہب ہواؤں میں ہے کوئی مدون مرتب کچھ نہیں لیکن اب ان کا محرف دین عیسائیت کا نام ظلم وتعصب اور تمام غیر عیسائیوں کے حقوق کو پامال کرنا ان کا دین بن چکا ہے تو یہ ہے اصل بنیاد پرستی۔ (۱)

آپ کے جواب کے پہلے حصے سے تو ہم کلیتہً متفق ہیں کہ ''بنیاد پرست'' ایک امریکی اصطلاح ہے اور بنیاد پرستی کی تحریک بھی امریکہ سے ہی اٹھی تھی۔ مولانا کی اس وضاحت سے بھی ہم اتفاق کرتے ہیں کہ بنیاد پرستی عقائد ونظریات کی بنیادوں سے محبت کا ہی نام ہے اور اس نقطۂ نظر سے ہر مسلمان بنیاد پرست ہی ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا امریکہ کا مسلمانوں کو بنیاد پرستی کا طعنہ دے کر ان کے خلاف نفرت وحقارت کی بین الاقوامی سیاسی مہم چلانا درست نہیں۔

البتہ مولانا کے جواب کے آخری حصے کی عبارت سے ہم قطعاً متفق نہیں کہ مسیحی مذہب کا نام ظلم و تعصب اور مسیحی ہونے کا مطلب تمام غیر مسیحیوں کے حقوق کو پامال کرنا ہے۔

جس طرح محترم سمیع الحق صاحب کی منطق نے امریکہ کی خارجہ پالیسی کو مسیحیت کا نمائندہ قرار دے کر مسیحیت کو دہشت گردی کا مذہب قرار دیا ہے، تو اسی منطق کو اپناتے ہوئے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص برمبنی جہالت دہشت گردوں کی کارروائیوں کو اسلام کے تصورِ جہاد سے منسوب کر کے اسلام کو بھی دہشت گرد مذہب قرار دینے کی کوشش کرے۔ جیسا کہ آج کل مغربی میڈیا اسی منطق پر عمل پیرا ہے۔

پروفیسر ساجد میر کی کتاب ''عیسائیت: تجزیہ ومطالعہ''

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں، سعودی عرب کے مذہبی نقطہ نظر کے نمائندہ پبلشر ''دارالسلام'' نے مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے مشہور ومعروف عالم دین اور سینیٹر محترم پروفیسر علامہ ساجد میر صاحب کی ۲۸ سالہ علمی وفکری کاوشوں پر مبنی کتاب بعنوان ''عیسائیت: مطالعہ و تجزیہ'' شائع کی ہے۔ کتاب کے پبلشر مصنف کا تعارف ان لفظوں میں کرواتے ہیں:

> قرآن وحدیث اور اسلامی عقائد وعبادات، اخلاق ومعاملات، تاریخ وسیر اور کئی دوسرے میدانوں میں بڑوں، بچوں، خواتین، مسلمانوں، غیر مسلموں اور نومسلم افراد کے لیے اردو، انگریزی، عربی، فرانسیسی، ہسپانوی اور بعض دیگر بین الاقوامی اور علاقائی زبانوں میں سے بہترین کتابوں کی اشاعت کے بعد اب ہم نے تقابل ادیان کے اہم میدان میں ایک بڑا قدم اٹھایا ہے۔ اور پاکستان و عالم اسلام کی معروف شخصیت سکالر سیاست دان اور دینی رہنما پروفیسر ساجد میر کی علمی وتحقیقی کتاب ''عیسائیت: تجزیہ و مطالعہ'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ (۲)

پھر لکھتے ہیں:

> اگرچہ اس موضوع پر مارکیٹ اور لائبریریوں میں کافی کتابیں دستیاب ہیں، مگر ہم بلاخوف و تردید یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے، اور اس میں عیسائیت کے اپنے مراجع اور مستند کتابوں سے کام لے کر جو تحقیقی مواد جمع کیا گیا ہے، وہ انشاء اللہ عیسائیت کی اصل حقیقت کے متلاشیوں کو بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دے گا۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر، اسے اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ انشاء اللہ مستقبل قریب میں اس کے مزید تراجم بھی شائع کیے جائیں گے۔ (۳)

سینئر سب ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت لاہور محسن فارانی علامہ ساجد کی اس کتاب کو ان لفظوں میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> اس بے مثال کاوش کی اشاعت پر پروفیسر ساجد میر صاحب اور کتاب وسنت کی اشاعت کے عالمی ادارے ''دارالسلام'' کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ (۴)

کالم نگار روزنامہ ''پاکستان'' کے رانا محمد شفیق خان پسروری اس کتاب پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

گزشتہ روز ہمدرد سنٹر لاہور میں جناب پروفیسر ساجد میر کی نئی کتاب ''عیسائیت: مطالعہ و تجزیہ'' کی تقریب رونمائی ہوئی جس کی صدارت جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ نے کی اور جسٹس (ر) خلیل الرحمٰن (جو اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈائریکٹر ہیں)۔ پروفیسر محمد یحییٰ، جناب مجیب الرحمٰن شامی، ڈاکٹر محمد ادریس زبیر سمیت متعدد صاحبان بصیرت نے مذکورہ کتاب پر تنقیدی خطابات فرمائے اور اس کتاب کو دور حاضر کی ایک بہترین کاوش قرار دیا۔ جناب مجیب الرحمٰن شامی نے کہا ''یہ کتاب مسیحی بھائیوں کے لیے نئے سال کا بہترین تحفہ ہے اور مسلمانوں کے لیے بھی ایک سوغات ہے''۔ جناب جسٹس خلیل الرحمٰن نے فرمایا ''یہ کتاب خوف و دہشت کی فضا میں (جبکہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان ایک کشمکش جاری ہے) تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ امید ہے اس سے نئے پھول کھلیں گے۔ یہ کتاب عیسائی دنیا بلکہ خود پاکستان کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ (۵)

پھر لکھتے ہیں:

جناب پروفیسر ساجد میر کی کتاب اس ''تلخی و تیزی'' میں سامنے آئی ہے، عام ذہن یہ تھا کہ اس کتاب میں عیسائی دنیا پر تابڑ توڑ حملے ہوں گے لیکن کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ جناب میر نے اپنی طبع کے مطابق الفاظ کو چن چن کر رقم کیا ہے اور پوری کتاب میں کسی جگہ بھی خلاف واقعہ اور اخلاق سے بعید عبارت آرائی نہیں کی۔ جو کچھ لکھا ہے باحوالہ اور عیسائی کتب ہی سے لکھا ہے۔ (٦)

پھر لکھتے ہیں:

کتاب پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس کا مواد جمع کرنے کے لیے کتنی محنت کی ہوگی۔ وہ خود فرماتے ہیں: ''میں نے اس کا مواد جمع کرنے میں تقریباً ۲۸ سال لگا دیے اور دنیا کی تمام متعلقہ لائبریریوں کی خاک چھانی ہے۔ (۷)

خود علامہ ساجد فرماتے ہیں:

اس کوشش میں اردو، انگریزی، عربی اور بعض دیگر زبانوں میں لکھی ہوئی کتنی کتابیں کھنگالی گئیں، اس کا اندازہ کتاب پڑھنے سے ہوسکتا ہے۔ بائبل کے علاوہ عیسائیوں کی دوسری معتبر و مستند کتابوں اور بیسیوں بنیادی مراجع اور مصادر کے سینکڑوں حوالے اس کتاب کی

زینت ہیں، جو یورپ، ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے سینکڑوں و متعدد کتب خانوں اور لائبریریوں سے حاصل کیے گئے۔ (۸)

پھر لکھتے ہیں:

مجھے عیسائیت کے گہرے مطالعہ اور عیسائی علماء سے تبادلۂ خیال کا موقع افریقہ میں اپنے کئی سالہ قیام کے عرصہ میں ملا۔ پھر میں یورپ اور امریکہ کے مختلف اسفار کے دوران وہاں کی بڑی لائبریریوں (جن میں برٹش لائبریری اور سنٹرل کیتھولک لائبریری خصوصاً قابل ذکر ہیں) سے استفادہ کرتا رہا۔ پاکستان اور بعض عرب ممالک کی لائبریریوں سے بھی مفید مواد حاصل ہوا لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس مواد کی ترتیب و تدوین کی تحریک میرے مرحوم دوست علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ کی طرف سے ہوئی۔ (۹)

ان سارے تبصرات و تعریفات کو پڑھیں تو یقیناً یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب علمی و تحقیقی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردے گی۔ محترم جناب علامہ ساجد میر نے اپنی ۲۸ سالہ علمی و فکری کاوشوں کا نچوڑ اس کتاب کے آخری باب بعنوان ''خاتمۃ الکلام'' میں بیان کردیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

یہ بات عقل انسانی کی حیرت انگیز پیچیدگی اور کمزوری، نیز انسان کی اپنے سچے یا جھوٹے عقیدہ سے بے پناہ جذباتی وابستگی پر دلالت کرتی ہے کہ پاپاؤں، کارڈینلوں، راہبوں اور پادریوں کی مکروہ ترین بدکرداری، ظلم، شقاوت، بددیانتی، دنیا پرستی، ہوس جاہ اور دھوکہ دہی سے حتمی طور پر آگاہ ہو جانے کے باوجود نہ صرف عیسائی عوام بلکہ بہت سے صاحبان عقل و خرد بھی پادریوں اور پاپاؤں کے نام نہاد تقدس کو مانتے رہیں اور ان کے اس مذہب سے چمٹے رہیں جس کے وہ علم بردار ہیں اور جو بالواسطہ و بلاواسطہ طور پر ان کی ساری اخلاقی و عملی خرابیوں کا ذمہ دار ہے۔

عقل انسانی کی اس کمزوری اور مذہب و عقیدت سے بلا دلیل وابستگی ہی سے فائدہ اٹھا کر کٹر مسیحی اپنے مذہبی پیشواؤں کی بدکاریوں اور اخلاقی خرابیوں کے جملہ ریکارڈ کے باوجود اب بھی پاپائیت اور کلیسیا کو بنیادی اور مجموعی طور پر پاک، مقدس، اور ''روح القدس کی خصوصی حفاظت کے تحت'' مانتے ہیں۔ اور غلط کار و بدقماش مذہبی رہنماؤں اور پاپاؤں کی ایک کثیر تعداد کی بے پناہ بداخلاقی کو عوام اور خود اپنے ضمیر سے، اس ظالمانہ اجمال کے پردہ

میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔(۱۰)

آگے لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشواؤں کی خرابیاں اگر محدود اور انفرادی پیمانہ پر ہوں تو اس قول کی صحت قابل تسلیم ہو سکتی ہے۔لیکن جب خرابیاں ہمہ گیر اور انتہائی شدید نوعیت کی ہوں، تو یہ لازماً عقیدہ و مذہب کی بنیادی خرابی پر دلالت کریں گی۔(۱۱)

پھر لکھتے ہیں:

اتنے بلند بانگ دعووں اور نعروں کے پس منظر میں اتنی اونچی سطح پر ایسی شدید اور ہمہ گیر خباثتیں، جن کا مقابلہ کسی مذہب کی تاریخ نہیں کر سکتی، یقیناً مسیحی عقائد کے بعض بنیادی نقائص پر مبنی ہیں۔(۱۲)

اور پھر اپنی ساری زندگی کا تحقیقی نچوڑ ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

اندریں حالات یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ پاپاؤں، راہبوں اور دوسرے مسیحی پیشواؤں کا گھناؤنا کردار، ان کے مذہبی نظریات وعقائد ہی کی بگاڑ کا نتیجہ ہے۔(۱۳)

’’پاپاؤں، کارڈینلوں، راہبوں اور پادریوں کی مکروہ ترین بدکرداری۔۔۔ظلم، شقاوت۔۔۔بددیانتی۔۔۔دنیا پرستی۔۔۔ہوس جاہ اور دھوکہ دہی۔۔۔مسیحی مذہبی پیشواؤں کی بدکاریوں اور اخلاقی خرابیوں۔۔۔غلط کار و بدقماش مذہبی رہنماؤں۔۔۔پاپاؤں کی بے پناہ بداخلاقی۔۔۔شدید اور ہمہ گیر خباثتیں۔۔۔پاپاؤں، راہبوں اور مسیحی پیشواؤں کا گھناؤنا کردار‘‘۔ رانا محمد شفیق خان، کالم نگار روزنامہ پاکستان علامہ ساجد میر کو ان الفاظ کے انتخاب پر انہیں یوں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

اسلوب نگارش مناظرانہ نہیں، خالصتاً حکیمانہ ہے۔۔۔انداز بیان سادہ اور دلنشین ہے۔۔۔علم، تحقیق اور ادب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔(۱۴)

رانا محمد شفیق اگر قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھ لیتے تو شاید اپنے خراج تحسین پر نظر ثانی فرما لیتے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط كَذَٰلِكَ

زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

اور (اے مسلمانو!) تم ان (جھوٹے معبودوں) کو گالی مت دو جنہیں یہ (مشرک لوگ) اللہ کے سوا پوجتے ہیں، پھر وہ لوگ (بھی جواباً) جہالت کے باعث ظلم کرتے ہوئے اللہ کی شان میں دشنام طرازی کرنے لگیں گے۔اسی طرح ہم نے ہر فرقہ (و جماعت) کے لیے ان کا عمل (ان کی آنکھوں میں) مرغوب کر رکھا ہے (اور وہ اسی کو حق سمجھتے رہتے ہیں) پھر سب کو اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ انہیں ان اعمال کے نتائج سے آگاہ فرما دے گا جو وہ انجام دیتے تھے۔الانعام ۶:۱۰۸

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تفسیر یوں فرماتے ہیں:

یہ نصیحت نبی ﷺ کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرہ و بحث وتکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ آئے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔(۱۵)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

مبلغ اگر صحیح تربیت یافتہ نہ ہو تو اپنے نظریات وعقائد کی تبلیغ و اشاعت کے جوش میں وہ حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے اور معقولیت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے نظریات اور عقائد کے متعلق اس کے سامعین کے دلوں میں نفرت اور تعصب پیدا ہو جاتا ہے اور بسا اوقات نوبت گالی گلوچ ہو جاتی ہے۔اس آیت سے مبلغین اسلام کی تربیت مقصود ہے تاکہ وہ اسلام کی دعوت کو پوری شائستگی اور متانت سے پہنچانے کے لیے تیار ہو جائیں۔انہیں حکم دیا کہ مشرکین کے باطل خداؤں کو برا بھلا نہ کہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مشتعل ہو کر تمہارے معبود حق کی جناب میں گستاخی کرنے لگیں۔اس انداز سے انہیں اسلام کا پیغام پہنچاؤ اور ان کے عقائد باطلہ کی تردید کرو کہ انہیں تمہاری دعوت قبول کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ رہے۔(۱۶)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:

جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی

فساد لازم آتا ہو، یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں تو وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے، کیونکہ معبودانِ باطلہ یعنی بتوں کو برا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے، اور ایمانی غیرت کے تقاضا سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہوگیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو برا کہیں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس کی برائی کا سبب بن جائیں گے۔ اس لیے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔ (۱۷)

ایک اور مقام پر قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾

اور (اے مومنو!) اہل کتاب سے نہ جھگڑا کرو مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو۔

سورہ عنکبوت ۲۹: ۴۶

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

جو یہودی یا نصرانی دینی امور کو سمجھنا چاہے اسے مہذب طریقے پر سلجھے ہوئے پیرائے سے سمجھا دینا چاہیے۔ کیا عجب کہ وہ راہ راست سے پیار کر لے جیسے اور آیت میں عام حکم موجود ہے ﴿ادع الی سبیل ربک بحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ الخ﴾ اپنے رب کی راہ کی دعوت حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ لوگوں کو دو۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو جب فرعون کی طرف بھیجا جاتا ہے تو فرمان ہوتا ہے کہ ﴿فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکروا او یخشی﴾ یعنی اس سے نرمی سے گفتگو کرنا۔ کیا عجب کہ وہ نصیحت قبول کر لے اور اس کا دل پگھل جائے۔ یہی قول حضرت امام ابن جریر کا پسندیدہ ہے۔ اور حضرت ابن زیدؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ (۱۸)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب اور شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی سپرٹ میں ہونا چاہیے تاکہ جس شخص سے بحث کی جارہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی

چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ نہ بڑھ جائے؛ اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے، مگر یہ اہل کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تبلیغ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے۔ (۱۹)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ فرماتے ہیں:

اہل کتاب کو جب سمجھانے لگو تو تمہارا اسلوب تبلیغ بڑا شائستہ اور پسندیدہ ہونا چاہیے۔ دلیل کی قوت اور برہان کی پختگی تو ہو لیکن اس میں خشونت اور سخت کلامی کی بو نہ پائی جائے، اپنے عقائد کی حقانیت اور اپنے دین کی صداقت کا روشن بیان تو ہو لیکن اس میں ذاتی حملہ کا اثر نہ ہو۔ (۲۰)

ایک اور مقام پر سورہ بقرہ کی آیت ۸۳ کی تفسیر میں مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں کہ تعلیم و تبلیغ میں سخت کلامی کافر سے بھی درست نہیں:

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ سے مراد قولاً احسن ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جب لوگوں سے خطاب کرے تو بات نرم کرے، خوش روئی اور کشادہ دلی سے کرے چاہے مخاطب نیک ہو یا بد، سنی ہو یا بدعتی، ہاں دین کے معاملہ میں مداہنت اور اس کی خاطر سے حق پوشی نہ کرے، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب موسیٰ و ہارون علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو یہ ہدایت نامہ دیا کہ ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ تو آج جو کلام کرنے والا ہے وہ حضرت موسیٰ سے افضل نہیں اور مخاطب کتنا ہی برا ہو فرعون سے زیادہ برا خبیث نہیں۔ حضرت طلحہ بن عمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام تفسیر و حدیث عطاءؒ سے کہا کہ آپ کے پاس فاسد عقیدے والے لوگ بھی جمع رہتے ہیں، مگر میرے مزاج میں تیزی ہے، میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں تو میں ان کو سخت باتیں کہہ دیتا ہوں، حضرت عطاءؒ نے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے ﴿قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ تو اس میں یہودی اور نصرانی بھی داخل ہیں، مسلمان خواہ کیسا ہی ہو وہ کیوں نہ داخل ہوگا۔ (۲۱)

محترم جناب علامہ ساجد میر کی یہ کتاب مختلف تراجم کے تحت پوری دنیا میں مارکیٹ کی جارہی

ہے۔ قطع نظر کہ اس کتاب میں پیش کردہ علمی دلائل کی نوعیت اور بنیاد کیا ہے؟ اور مسیحی مذہب وعلمائے دین کے حق میں کس قدر نامناسب الفاظ اور غیر عالمانہ طرزِ تحریر کو اختیار کیا گیا ہے، ہم قاری کی توجہ مولانا کی اختیار کردہ منطق کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔

پہلے حق کو پہچانو! پھر اہل حق کو بھی پہچان لوگے

علامہ نے اپنی تحقیق سے اس منطقی اصول کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی دوسرے مذہب کے معاشرے اور علماء دین میں پائے جانے والا بگاڑ دراصل اس مذہب کے اپنے غلط اور بگڑے ہوئے عقائد کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر ہم اس منطقی اصول کو شرعاً، اخلاقاً اور عقلاً درست تسلیم کرلیں تو پھر اسے دنیا بھر کے اسلامی معاشروں اور مسلمانوں پر بھی لاگو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس منطقی اصول کے مطابق کوئی جاہل شخص نام نہاد علمائے دین اور کسی پیر وفقیر کی بدکرداری کا ذمہ دار بھی اسلامی عقائد ونظریات کو ٹھہرا سکتا ہے۔ محترم علامہ ساجد میر نے جس منطقی اصول کے تحت مسیحیت کو باطل مذہب قرار دیا ہے، اسی منطق کو استعمال کرتے ہوئے کوئی غیر مسلم بر مبنی جہالت اسلام کو بھی باطل مذہب ٹھہرا سکتا ہے۔ (معاذ اللہ، استغفر اللہ)

اچھے اور برے لوگ تو ہر مذہب، قوم اور معاشرہ میں پائے جاتے ہیں۔ قول وفعل کے تضاد میں مبتلا لوگوں کی بداعمالیوں کی بنیاد پر کسی بھی مذہب کو غلط قرار دینے والی منطق بذاتِ خود غیر اسلامی ہے۔ امام غزالیؒ نے کیا خوبصورت اور حق بات فرمائی کہ:

> یہ ضعیف العقل لوگوں کی عادت ہے کہ حق کو لوگوں کی نسبت سے پہچانتے ہیں، لوگوں کو حق کی وجہ سے نہیں اور عقلمند آدمی حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ کی پیروی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حق وراستی آدمیوں سے نہیں پہچانی جاتی۔ تم پہلے حق کو پہچانو! پھر اہل حق کو بھی پہچان لوگے۔ (۲۲)

خود بائبل مقدس کی تعلیمات کے مطابق یسوع مسیح علیہ السلام نے قول وفعل کے تضاد میں مبتلا بدکردار لوگوں کی نشاندہی اپنی حیات ہی میں فرمادی تھی۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

> ﴿جو مجھ سے اے خداوند اے خداوند! کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہی میں داخل نہ ہوگا مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ اس دن بہتیرے مجھ سے یہ کہیں گے اے خداوند اے خداوند! کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام

> سے بدروحوں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سے معجزے نہیں دکھائے؟۔ اس وقت میں ان سے صاف کہہ دوں گا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ۔﴾ انجیل متی ۷: ۲۰-۲۳

ایک اور مقام پر نام نہاد پیروں، فقیروں اور علمائے دین کو مخاطب کرکے فرمایا:

> ﴿اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دُونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔﴾
> انجیل متی ۲۳: ۱۵

نبی کریم ﷺ نے آخری زمانے میں کئی ایسے فتنوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے بعض لوگوں کو قرآن اور عبادات سے ظاہری لگاؤ کے باوجود لادین اور گمراہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

> **﴿فان له اصحاباً یحقر احد کم صلوته مع صلوتهم وصیامه مع صیامهم یقرئون القرآن لاتجاوز تراقیهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة﴾**
>
> بے شک اس کے ساتھی ایسے ہوں گے جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم اپنی نمازوں کو حقیر اور قلیل جانو گے اور ان کے روزوں کے مقابلے میں اپنے روزوں کو حقیر جانو گے۔ وہ قرآن (کثرت سے) پڑھیں گے مگر ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ لوگ دین سے ایسے خارج ہوں گے جیسے تیر کمان سے۔ (۲۳)

اور ایک اور مقام پر انہی لوگوں کی علامات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

> **﴿السنتهم احلیٰ من السکر وقلوبهم﴾**
>
> ان کی زبانیں شکر سے زیادہ میٹھی ہوں گی مگر ان کے دل بھیڑیوں کے سے ہوں گے (۲۴)

چنانچہ ان اقوالِ مسیح علیہ السلام اور احادیثِ نبوی ﷺ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بُرے لوگ ہر قوم ومذہب میں پائے جاتے ہیں۔ بُرے لوگوں کی برائی کی بنیاد پر کسی بھی مذہب کو بُرا کہنا درست نہیں۔ مذہب کی بنیاد اس کی الہامی کتاب کے متن اور مجموعی تعلیمات پر ہوتی ہے۔ تعلیمات کی

بنیاد پر مذہب کو غلط کہنا اور بات ہے اور کسی پیروکار کی بداعمالی کی بنیاد پر مذہب کو بُرا قرار دے دینا ایک دوسری بات ہے۔

انسانیت کی مشرق ومغرب میں تفریق ایک غلط تصور ہے

اسلام میں یہ بات واضح ہے کہ جس طرح اچھے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اسی طرح بُرے لوگ بھی ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔مغرب برائی کا نمائندہ نہیں بالکل اسی طرح جس طرح مشرق اچھائی کا نمائندہ نہیں۔شیطان کے لیے مشرق ومغرب کی تفریق کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔مسیحیت اور بالخصوص اسلام میں مشرق ومغرب کی تفریق بذاتِ خود ایک غلط تصور ہے۔اسلام انسانیت کو مشرق ومغرب میں سیاسی طور پر تقسیم کرنے کی بجائے انسانیت کی عالمگیریت اور وحدت پر یقین رکھتا ہے۔قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾

اور مشرق ومغرب (سب) اللہ ہی کا ہے، پس تم جدھر بھی رُخ کرو اُدھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)، بے شک اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔(سورہ بقرہ:۱۱۵)

یہی وحدت انسانی کا تصور حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں یوں دیا کہ:

﴿یاایھاالناس، الا ان ربکم واحد لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لِاَسود علی احمرولا لاحمر علیٰ اسود الاّ بالتقویٰ . ان اکرمکم عند اللہ اتقکم . الا ھل بلغت؟ قالو بلیٰ یا رسول اللہ، قال فلیبلغ الشاھدُ الغائب﴾

لوگو! خبردار ہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔کسی عرب کو کسی عجمی اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔بتاؤ! میں نے تمہیں بات پہنچادی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ۔ فرمایا: اچھا تو جو موجود ہے، وہ ان لوگوں تک یہ بات پہنچادے جو موجود نہیں ہیں۔(۲۵)

کیا ہم علامہ ساجد میر کے منطقی اصول کو اپنا کر دہشت گردی کو اسلام کے تصور جہاد کی وجہ قرار دیں؟ کیا ہم اسامہ بن لادن سے منسوب دہشت گردی کو اسلامی عقائد ونظریات میں بگاڑ کی وجہ قرار دیں؟ حالانکہ یہی منطق ۱۱/۹ کے بعد بہت سے مغربی حکومتی نمائندوں کی بھی ہے۔حضور یسوع مسیح علیہ السلام نے حق فرمایا:

﴿۔۔۔اور جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو اسی سے تمہارے واسطے ناپا جائے گا۔﴾متی ۷:۲

جب معاشرے کے بعض ''علماءِ حق'' کا یہ حال ہوگا تو عوام الناس بھی اسی طرزِ فکر کو دینی غیرت کا تقاضا سمجھتے ہوئے کسی سے کیا پیچھے رہیں گے۔

''پادریوں کے کرتوت''

محترم محمد متین خالد صاحب ردِ قادیانیت کے میدان میں ایک معروف شخصیت ہیں۔آپ ردِ قادیانیت پر اپنی کتاب ''ثبوت حاضر ہیں'' کے حوالہ سے بہت مشہور ہیں۔حال ہی میں آپ کی ''ردعیسائیت'' پر دو کتب چھپ کر مارکیٹ میں آئی ہیں۔آپ کی ۵۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب بعنوان ''پادریوں کے کرتوت'' شائع ہوئیہے۔(۲۶) اس کتاب کے عنوان ہی سے اس کے ''علمی مقام'' کا اندازہ ہوجاتا ہے، بالخصوص جب کہ اس کے فہرست عنوانات میں:

☆ حرامی کون؟

☆ صلیبی دنیا کے جنسی دہشت گرد

☆ رنگیلے پادریوں کے شیطانی کرتوت

☆ پوپ کی جنسی خرمستیاں

☆ پڑھتا جا، شرماتا جا

جیسے عنوانات کے تحت مضامین بھی شامل ہوں۔محترم محمد متین خالد اپنی اس کتاب کے پیش لفظ ''دربار کی زینت بھی ہیں، بازار میں رسوا بھی ہیں'' میں لکھتے ہیں:

پادریوں کی اکثریت عیاش، عیار، زرپرست اور پیٹ پرست ہے۔انہیں بھاری بینک بیلنس، عمدہ گاڑیاں، قیمتی موبائل اور اعلیٰ ملبوسات کا چسکا چین نہیں لینے دیتا۔انہوں نے بھاری بھرکم ''عطیات'' وصول کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے۔بچوں اور راہبوں (Nuns) سے شیطانی جنسیہوس پورا کرنا ان کا معمول ہے۔وہ فنڈز کی خرد برد، منشیات کی خرید

وفروخت، طوائفوں کی سرپرستی اور ہم جنس پرستی میں ملوث پائے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض اس قدر ظالم اور پاپی ہیں کہ جبری جنسی زیادتی اور رنگ رلیوں کی سنگین وارداتوں سے بھی نہیں چوکتے۔ (۲۷)

پھر فرماتے ہیں:

> یہ ہے عیسائیت کا کلچر اور تمدن جو تیزی سے تنزل اور پستی کے غار کی نذر ہو رہا ہے۔ اس کی ظاہری آب وتاب اور وجاہت ختم ہو رہی ہے۔ اور اندرونی خباثت کی سڑانڈ پھوٹ رہی ہے۔ دعویٰ مسیح کی پیروی کا ہے اور اطاعت ''راسپوٹین'' کی کی جا رہی ہے۔ عزت کے الفاظ عصمت کے متعلق استعمال کیے جاتے ہیں لیکن عملی زندگیاں حرام کاری اور آتشک کے لیے وقف ہیں۔ زبانی داد سچائی کو دیتے ہیں لیکن عملاً اقدار و اختیار کی کرسیوں پر بد دیانتوں کو بٹھاتے ہیں۔ (۲۸)

''عیسائیت کے تعاقب میں''

ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل آپ کی ایک دوسری کتاب ''عیسائیت کے تعاقب میں'' چھپی ہے۔ اس کے پیش لفظ میں آپ لکھتے ہیں:

> کلیسا کے بشپوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو خدا کے خوف سے روتا ہو۔ راہبوں اور راہبات نے عبادت خانوں کو زناخانوں میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ پہلے رہبانیت اور نفس کشی عیسائیت کا طرہ امتیاز ہوتا تھا اب عیش کوشی، تن پروری اور شراب نوشی کو باعث افتخار سمجھا جاتا ہے۔ (۲۹)

ذرا غور فرمائیے اس جملے پر کہ ''کلیسا کے بشپوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو خدا کے خوف سے روتا ہو''۔ اس جملے میں کتنی حقیقت اور تحقیق شامل ہے ایک باشعور شخص بھی اس کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی غیر مسلم جہالت سے یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ ''عالم اسلام میں کوئی ایک بھی عالم ایسا نہیں جو خدا کے خوف سے روتا ہو''۔

ہم اگر بات دلیل سے نہیں کر سکتے تو کم از کم تمیز اور سلیقے سے تو کرنی سیکھ سکتے ہیں۔ جب ہم اس نوعیت کی ''علمی وفکری گفتگو'' فرمائیں گے تو دوسرے جواباً جہالت سے ہمارے پیارے نبی ﷺ کی

شان اقدس میں گستاخی نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے، خواہ وہ گستاخی کتاب لکھ کر کریں یا کارٹون بنا کر۔ بعض غیر مسلموں کی گستاخی اور جسارت کی وجوہات میں ہماری ''دینی غیرت وحمیت'' بھی تو شامل ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ سورہ الانعام کی آیت ۱۰۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> غیر قوم سے مناظرہ کرنا تو جزو تبلیغ ہے لیکن دشنامی اور دل خراش الفاظ ان کے معظمین کے حق میں کہنا ممنوع لغیرہ ہے کہ وہ ہمارے معبود یا رسل و معظمین کی شان میں گستاخی کریں گے تو گویا اس کے باعث ہم ہوئے۔ (۳۰)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

> یعنی تم تبلیغ و نصیحت کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے۔ اب جو کفر و شرک یہ لوگ کریں اس کے خود ذمہ دار ہیں۔ تم پر اس کی کچھ ذمہ داری نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تم اپنی جانب سے بلاضرورت ان کے مزید کفر و لعنت کا سبب نہ بنو۔ مثلاً فرض کیجیے ان کے مذہب کی تردید اور بحث و مناظرہ کے سلسلہ میں تم غصہ ہو کر ان کے معبودوں اور مقتداؤں کو سب و شتم کرنے لگو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جواب میں تمہارے معبود برحق اور محترم بزرگوں کی بے ادبی کریں گے۔ اور جہالت سے انہیں گالیاں دیں گے۔ اس صورت میں اپنے واجب التعظیم معبود اور قابل احترام بزرگوں کی اہانت کا سبب تم بنے۔ لہٰذا اس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے۔ کسی مذہب کے اصول و فروع کی معقول طریقہ سے غلطیاں ظاہر کرنا یا اس کی کمزوری اور رقاقت پر تحقیقی اور الزامی طریقوں سے متنبہ کرنا جداگانہ چیز ہے۔ لیکن کسی قوم کے پیشواؤں اور معبودوں کی نسبت بغرض تحقیر و توہین دلخراش الفاظ نکالنا قرآن نے کسی وقت بھی جائز نہیں رکھا۔ (۳۱)

ہم اپنی خوش فہمی کو آگہی کہتے ہیں اور دوسروں کی آگہی کو غلط فہمی۔ ہم خود کو جنت کا حقدار سمجھتے ہیں اور دوسروں کو دوزخ کا ایندھن۔ حالانکہ اللہ کی بارگاہ میں معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ تبلیغ دین جیسے پاکیزہ، اور اعلیٰ ترین فرض کو سرانجام دیتے ہوئے ہمیں گھٹیا اور بازاری طرز گفتگو سے اجتناب کرنا چاہیے۔

بائبل مقدس کے مصلحین ومترجمین کے حق میں نازیبا الفاظ

ایک اور صاحب حکیم محمد عمران ثاقب نے ﴿بائبل اور محمد رسول اللہ ﷺ﴾ کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ بائبل کے تراجم میں اغلاط کو ثابت کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> بائبل کے مصلحین ومترجمین نہ صرف آوارہ ذہن، عیاش مذہب تھے، بلکہ جس قدر یہ خود آوارہ تھے، اس سے کہیں بڑھ کر ان کے قلم بھی آوارہ نکلے کہ اپنوں کی بھی پہچان نہ رہی۔ شراب کے نشے میں دھت مترجمین اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے؟ (۳۲)

پروفیسر حافظ عاکف سعید کیلانی (ایم اے) محمد عمران ثاقب کو اس طرز تحریر پر یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

> زیرنظر کتاب محترم جناب حکیم صاحب نے دلائل و براہین کی برسات کی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ تحریر کا انداز بھی نہایت متین، سنجیدہ، اور ناصحانہ اختیار کیا ہے۔ (ص ۱۳)

اگر کوئی غیر مسلم قرآن مجید کے مصلحین ومترجمین کے متعلق یہ بات کرے تو ہمیں کیسا محسوس ہوگا؟ علمی بحث سے قطع نظر، کیا ہمیں اُس غیر مسلم کے طرزِ گفتگو پر دُکھ نہیں ہوگا؟ چنانچہ اہل علم ہمیشہ سے تبلیغِ مذہب کے باب میں ایسے رویوں سے سختی سے اجتناب برتتے آئے ہیں۔ چنانچہ شعبہ قانون وشریعت، بین الاقوامی یونیورسٹی-اسلام آباد، کے محترم محمد مشتاق احمد حکیم محمد عمران صاحب کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فاضل مئولف نے کتاب کے لکھنے میں خاصی محنت کی ہے، اور تقریظ نگار، حافظ صلاح الدین یوسف کیا الفاظ میں ''بائبل ہی سے کوہ کنی کر کے اسلام کی جوئے شیر نکالی ہے'' (ص۱۲) لیکن کتاب کا مقصد کیا ہے؟ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے موضوع پر کوئی نئی تحقیق پیش کی گئی ہے یا سوچ کا کوئی نیا زاویہ سامنے لایا گیا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں، اور اگر اس کا مقصد مسیحی حضرات کو سیدھی راہ دکھانا ہے تو شاید مقصد اس لئے حاصل نہ ہو سکے گا کہ کتاب کا اسلوب تحقیقی اور داعیانہ نہیں، بلکہ سراسر مناظرانہ ہے۔ (۳۳)

''گھٹیا الفاظ اور گھٹیا ذہنیت''

دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے حق میں غیر عالمانہ طرز گفتگو کو ''دینی غیرت'' کے نام پر معاشرے میں فروغ دینے پر کس قسم کا معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کی جھلک ہمیں سابقہ اقلیتی ایم این اے جناب جے سالک صاحب پر بیتے ہوئے ایک واقعہ میں نظر آتی ہے۔ ممتاز دانشور عطاالحق قاسمی اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اقلیتی ایم این اے جناب جے سالک کے بارے میں اخبارات نے اطلاع دی ہے کہ پولیس نے احتجاجاً صلیب پر چڑھے اس مسیحی رہنما کو صلیب سمیت نیچے گرایا اور ان پر لاٹھیاں برسائیں۔ ایک اخبار نے جے سالک سمیت پوری مسیحی برادری کے لئے ''بھنگی'' اور ''چوڑھے'' کے الفاظ ایک پولیس افسر کے حوالے سے استعمال کئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خبر اگر درست ہے تو پاکستانی قوم کے لئے ایک کلنک کے ٹیکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جے سالک جیسے بھی ہیں وہ بہر حال ایم این اے ہیں اور پولیس نے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ محض اس تحقیر کی وجہ سے ہے جو پاکستانی قوم کی اس قابل احترام اقلیت کے حوالے سے ہمارے بعض پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں میں بھی موجود ہے۔ احساس کمتری کا شکار یہ طبقہ سفید فام مسیحی انگریزوں اور امریکیوں کے تلوے چاٹنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا لیکن اپنے ہم وطن مسیحی بھائیوں کے لئے گھٹیا الفاظ استعمال کر کے اپنی گھٹیا ذہنیت کے مظاہرے سے باز نہیں آتا۔ جن پولیس اہلکاروں نے سرعام قومی اسمبلی کے ایک رکن کی پٹائی کی میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ کسی مسلمان ایم این اے کے ساتھ اس قسم کی حرکت کا تصور بھی کر سکتے تھے؟ ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو بھی ہمیں اسی طرح حقیر سمجھتا تھا۔ ہم اس کے قریب سے بھی گزر جاتے تھے تو وہ ''ناپاک'' ہو جاتا تھا۔ ہم ان کے برتنوں کو چھو نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ہمیں ''اوک'' میں پانی پلایا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے دوسرے محرکات میں سے ایک ہندو کی یہ تنگ دلی بھی تھی۔ اب اگر ہم اپنے ہم وطن بھائیوں کو تحقیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے دور رس نتائج بھی یاد رکھنے چاہیں! پاکستان کی مسیحی اقلیت بہت پر امن اور محب وطن ہے۔ ۶۵ کی جنگوں میں مسلمان جاسوس تو بہت پکڑے گئے لیکن کوئی پاکستانی مسیحی اس گھناؤنے فعل کا مرتکب نہ پایا گیا۔ کیا ہماری پولیس اور عوام کے مختلف طبقے انہیں اسی ''جرم'' کی سزا دینا

چاہتے ہیں؟ (۳۴)

مناظراتی کتب اور شیخ سیّد عبدالقادر جیلانی کا ارشاد مبارک

مناظراتی موضوعات پر کتب تخلیق کرتے وقت کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم اپنی علمی وفکری تحقیقات کو حضرت شیخ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کے اس ارشاد مبارک کی روشنی میں پرکھ لیں تا کہ ہماری تحقیق فتنوں کا قلع قمع کرنے کی بجائے بذات خود معاشرے میں فتنہ پیدا کرنے کا سبب نہ بن جائے۔ آپ فرماتیہیں:

﴿اَنْتَ هَوَسُ تُؤَلِّفُ كَلاَمَكَ مِنَ الْكِتَابِ وَتَتَكَلَّمُ بِهٖ اِنْ ضَاعَ كِتَابُكَ مَا تَصْنَعُ اَوْ وَقَعَ الْحَرِيْقُ فِي كُتُبِكَ اَو اِنْطِفَآءُ مِصْبَاحِكَ الَّذِىْ تَبْصُرُبِهٖ اِذَا انْكَسَرَتْ جَرَّتُكَ وَتَبَدَّدَ الْمَآءُ الَّذِىْ فِيْهَا اَيْنَ مَقْدَحَتُكَ وَحِرَاقُكَ وَكِبْرِيْتُكَ وَمَعِيْنُكَ مَنْ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَمِلَ وَاَخْلَصَ صَارَتِ الْمَقْدَحَةُ وَالْمَعِيْنُ فِى قَلْبِهٖ نُوْرَاللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَيُضِئُ بِهٖ وَهُوَ غَيْرُهٗ تَنَحُّوْا ۔ يَا اَبْنَآءَ اللَّقْلَقَةِ يَا اَبْنَآءَ الصُّحُفِ الْمُؤَلَّفَةِ بِاَيْدِى النُّفُوْسِ وَالْاَهْوِيَةِ ۔وَيْلَكُمْ تَنَازَعُوْنَ الْمَخْصُوْصَ تَنْقَصِمُوْنَ وَتَهْلِكُوْنَ وَلَا تَبْلُغُوْنَ حَظَّكُمْ كَيْفَ تَتَغَيَّرُالسَّابِقَةُ وَالْعِلْمُ بِجَهْدِكُمْ كُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ مُسْلِمِيْنَ﴾

تو ہوس میں آ کر کتابوں سے اپنا کلام ترتیب دیتا ہے اور پھر اس پر بات کرتا ہے۔ اگر تیری کتاب ضائع ہو جائے تو تُو کیا کرے گا یا تیری کتاب میں آگ لگ جائے یا تیرا وہ چراغ بجھ جائے جس سے تُو کتاب دیکھ رہا ہے؟ جب تیرا گھڑا ٹوٹ جائے اور اس کا پانی بہہ جائے تو کیا کرے گا؟ جس نے علم سیکھا اور عمل کیا اور اس پر قائم رہا تو وہ اس کے دِل میں اللہ عزوجل کا نور روشن کرنے کا چقماق اور سرچشمہ بن جاتا ہے جو اسے بھی ضیاء بخشتا ہے اور دوسروں کو بھی۔ پرے ہٹو! اے نفس وہوا کے ہاتھوں مولفہ کتابوں کے بیٹو! افسوس ہے تم پر۔ تم مخصوص تنازعات میں پڑے رہتے ہو، توڑنے میں لگے رہتے ہو، ہلاک کرتے ہو اور اپنے حصے کا فرض پورا نہیں کرتے۔ تمہاری کوششوں سے صورت حال میں کیسے تبدیلی آئے؟ مومن ومسلمان بنو۔ (۳۵)

﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْن﴾ کا تصور

اگر آج ہم اسلام، پاکستان اور دنیا کے حالات میں بہتری چاہتے ہیں تو ہمیں مکالمہ کے عمل کی نئی تعریف اپنانی ہوگی۔ ہم جس نئی تعریف کو Promot کرنا چاہیں گے اس تصور کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے رب العالمین اور نبی کریم ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے پر ہے۔ قرآن مجید کی پہلی سورت کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنا تعارف یوں کرواتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سورہ فاتحہ ۱ : ۱

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لفظ عالمین کی شرح یوں بیان فرماتے ہیں:

عالمین عالم کی جمع ہے۔ اور یہ ماخوذ ہے علم بمعنی علامت ونشانی سے۔ کیونکہ ہر چیز اپنے پیدا کرنے والے کا پتہ دیتی ہے۔ نیز اس میں اس لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام کا خدا کسی خاص قوم، نسل اور وطن کا خدا نہیں تا کہ اس کی نوازشات کسی خاص قوم ونسل کے ساتھ ہی مخصوص ہوں۔ بلکہ اس کی ربوبیت کا رشتہ کائنات کی ہر شے کے ساتھ یکساں ہے۔ اور اسی لیے اس کے لطف واحسان کے سب مساوی طور پر حق دار ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس کے احکام کی بجا آوری سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیں۔ (۳۶)

پھر اللہ کی صفت رحمت کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

یہ اس کی بے حد وحساب رحمت ہی تو ہے کہ ہماری لگاتار ناشکریوں اور نافرمانیوں کے باوجود وہ اپنے لطف وکرم کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جس صفت کا سب سے پہلے ذکر کرتا ہے وہ صفت قہاریت وجباریت نہیں بلکہ صفت رحمانیت ورحیمیت ہے۔ یہ اس لیے کہ بندہ کا جو تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اس کا دارومدار خوف وہراس اور رعب ودبدبہ پر نہ ہو۔ بلکہ رحمت ومحبت پر ہو کیونکہ یہی وہ اکسیر ہے جس سے انسان کی خفیہ صلاحیتیں بیدا ہوتی ہیں اور پنہاں توانائیاں آشکار۔ اور یہی معراج انسانیت ہے کہ انسان اپنے آپ کو عیاں دیکھ لے بعض حق ناشناس کہتے ہیں کہ اسلام کا خدا خونی ہے اور اپنے ماننے والوں کو خونخواری سکھاتا ہے۔ کاش وہ اسلام کی مقدس کتاب کے پہلے صفحہ کی پہلی آیت ہی پڑھ لیتے تو انہیں پتہ چل جاتا کہ اسلام کا خدا خونخوار نہیں، الرحمٰن ہے۔ اس

کی رحمت کا وسیع دامن کائنات کے ذرہ ذرہ کو اپنے آغوش لطف و کرم میں لیے ہے۔ اسلام کا خدا سفاک نہیں بلکہ الرحیم ہے اس کی رحمت کا بادل ہر وقت برستا ہی رہتا ہے۔ (٣٧)

یہاں تک تو یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام میں اللہ کی صفت ربوبیت اور صفت رحیمیت صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہودی، مسیحی، مشرک، بت پرست، الغرض کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی صفت ربوبیت اور رحیمیت سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ وہ کسی خاص قوم یا مذہب کا خدا نہیں، وہ سب کا خدا ہے۔ امام بخاری ایک حدیث نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے ننانوے قتل کیے تھے۔ پھر اس کا حکم پوچھنے کی غرض سے وہ قاتل شخص ایک راہب کے پاس پہنچا۔ اس سے پوچھا کہ کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں ہوسکتی۔ اس نے راہب کو بھی ملکِ عدم پہنچا دیا۔ وہ اسی طرح مسئلہ پوچھتا رہا، یہاں تک کہ اس سے ایک آدمی نے کہا کہ تو فلاں بستی میں چلا جا قضائے الٰہی سے راستے میں اسے موت آگئی اور اس نے اپنا سینہ اس بستی کی جانب جھکا دیا۔ اب رحمت اور عذاب کے فرشتے آکر جھگڑنے لگے۔ پس جس بستی کی طرف وہ جا رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے نزدیک ہونے کا حکم دیا۔ اور جس بستی سے وہ آیا تھا اسے پرے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کی جائے وفات سے دونوں بستیوں کا فاصلہ ماپ لو، تو اس بستی سے وہ ایک بالشت نزدیک نکلا۔ پس اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی۔ (٣٨)

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نبی ﷺ کے متعلق قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ سورہ انبیاء ٢١:١٠٧

اور (اے رسول محتشم!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر۔

حضور کریم ﷺ نے اپنی شان رحمت سے نقاب سرکاتے ہوئے فرمایا ﴿انما انا رحمة مهداة﴾ یعنی میں وہ رحمت ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمائی۔ علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

﴿وكونه صلى الله عليه وسلم رحمة للجميع باعتبار انه عليه الصلوة والسلام واسطة الفيض الالهى على الممكنات على حسب القوابل ولذا كان نوره صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم اول المخلوقات و فى الخبر اول ما خلق الله تعالىٰ نور نبيك يا جابر" وجاء "الله تعالىٰ المعطى و انا

القاسم" وللصوفية قدست اسرارهم فى هذا الفصل كلامو فوق ذالك﴾

یعنی حضور کریم ﷺ کا تمام کائنات کے لیے رحمت ہونا اس اعتبار سے ہے کہ عالمِ امکان کی ہر چیز کو حسب استعداد جو فیض الٰہی ملتا ہے وہ حضور کے واسطہ سے ہی ملتا ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کا نور تمام مخلوقات سے پہلے پیدا فرمایا گیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اے جابر! سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تیرے نبی کے نور کو پیدا فرمایا، اور دوسری حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ دینے والا ہے اور میں (اس کی رحمت کے خزانوں کو) بانٹنے والا ہوں اور صوفیائے کرام نے اس ضمن میں جو اسرار و معارف بیان کیے ہیں وہ اس سے بلند ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں۔ (٣٩)

حضور نبی کریم ﷺ کی شفقت اور رحمت کا یہ عالم تھا کہ قاضی عیاض مالکیؒ فرماتے ہیں:

حضور ﷺ کی شفقتوں میں سے یہ بات بھی تھی کہ اپنے رب سے دعا مانگی اور اس کا عہد لیا کہ میں جس شخص کو بھی برا کہوں یا لعنت بھیجوں تو اے مولا! تو اس شخص کے لیے سبب پاکیزگی، رحمت، دعا، طہارت اور ایسی قربت جو قیامت کے دن مجھ سے نزدیک کردے، بنا دے"۔ (٤٠)

اب یہاں سوچنے کی بات ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی کریم ﷺ کے دائرہ رحمت میں غیر مسلم بالخصوص مسیحی بھی داخل ہیں یا نہیں؟ اگر غیر مسلم آپ ﷺ کے دائرہ رحمت میں داخل نہیں اور یہ رحمت صرف مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص ہے تو پھر آیت کے الفاظ میں رحمة للمسلمین ہونا چاہیے تھا، العالمین نہیں۔ قرآن مجید نے آپ ﷺ کو رحمة اللعالمین کہہ کہ سب مسلم و غیر مسلم کو آپکے ﷺ دائرہ رحمت میں داخل کر دیا۔ یعنی حضور ﷺ سب کے لئے رحمت ہیں خواہ آپ ﷺ پر کوئی ایمان رکھے یا نہ۔ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ غیر مسلموں کے لیے بھی دنیا میں رحمت ہیں (٤١)۔ آپ ﷺ کی رحمت سے مستفید ہونے کے لئے آپ ﷺ پر ایمان لانا شرط نہیں۔ ایمان لانے کے اپنے فوائد و برکات ہیں مگر آپ ﷺ کے دائرہ رحمت سے کوئی بھی باہر نہیں۔

مشرکین مکہ و طائف نے آپ ﷺ پر بے شمار مظالم ڈھائے لیکن جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آپ ﷺ کے ایک انصاری کمانڈر سعد بن عبادة نے ابوسفیان سے کہا:

﴿اليوم يوم الملحمة﴾

للعلمین ہیں۔۔۔احساس کی سب سے اونچی سطح اور سب سے اعلیٰ منزل انہی کے شایان ہے۔۔۔اکیلے اس جہاں میں وہی تو ہیں جو ندرت احساس کا یکتا پیکر ہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

حضور ﷺ کی محفل میں کسی آنے والے کے لئے رکاوٹ نہ تھی۔۔۔کوئی بات کرنے والا جو کچھ چاہتا بے تکلف کہہ دیتا۔۔۔کوئی راہ گیر جہاں چاہتا راستے میں اپنے کسی کام کے لئے آپ ﷺ کو روک لیتا۔۔۔لوگ اپنے ناپسندیدہ طرز عمل سے آپ ﷺ کو ایذا پہنچاتے۔۔۔مگر حضور ﷺ کبھی کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہ فرماتے۔۔۔بلکہ آپ ﷺ کی رحمت و عنایت کا دریا مسلسل بہتا۔۔۔اور ہر اچھے، برے، ہر اپنے، پرائے کو یکساں سیراب کرتا رہا۔

چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ آیت قرآنی ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

آپ ﷺ تو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔اگر کوئی بدبخت اس رحمت عامہ سے خود ہی منتفع نہ ہو تو یہ اس کا قصور ہے۔آفتاب عالمتاب سے روشنی اور گرمی کا فیض ہر طرف پہنچتا ہے۔لیکن کوئی شخص اپنے اوپر تمام دروازے اور سوراخ بند کر لے تو یہ اس کی دیوانگی ہوگی۔آفتاب کے عموم فیض میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا،اور یہاں تو رحمۃ اللعالمین کا حلقہ فیض اس قدر وسیع ہے کہ جو محروم القسمت ہونا نہ چاہے اس کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں بے اختیار رحمت کا حصہ پہنچ جاتا ہے۔چنانچہ دنیا میں علوم نبوت اور تہذیب و انسانیت کے اصولوں کی عام اشاعت کا ہر مسلم و کافر اپنے اپنے مذاق کے موافق فائدہ اٹھاتا ہے۔

مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادیؒ کنزالایمان کے حاشیے میں اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں:

کوئی جن ہو یا انس،مومن ہو یا کافر،حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کا رحمت ہونا عام ہے،ایمان والے کے لیے بھی اور اس کے لیے بھی جو ایمان نہ لایا۔مومن کے لیے تو آپ ﷺ دنیا و آخرت دونوں میں رحمت ہیں اور جو ایمان نہ لایا اُس کے لیے آپ دُنیا میں رحمت ہیں کہ آپ کی بدولت تاخیر عذاب ہوئی۔

آج لڑائی کا دن ہے۔

یعنی آج کفار سے جی بھر کر انتقام لیا جائے گا تو آپ ﷺ ناراض ہو گئے اور ان سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے قیس کے سپرد کر دیا اور ابوسفیان سے فرمایا:

﴿الیوم یوم المرحمة﴾

(آج لڑائی کا نہیں بلکہ) آج رحمت کے عام کرنے (اور معاف کر دینے) کا دن ہے۔

پھر آپ ﷺ نے اپنے مخالفین سے پوچھا کہ بتاؤ میں آج تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کروں گا؟ تو انہوں نے کہا کہ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے خطاکار بھائیوں کے ساتھ برتاؤ کیا تھا آپ ﷺ سے بھی وہی توقع ہے۔اس جواب پر آپ ﷺ نے وہی جملہ ارشاد فرمایا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے لیے فرمایا تھا: ﴿لاتثریب علیکم الیوم، اذهبوا فانتم الطلقاء﴾ یعنی تم سے آج کوئی پوچھ گچھ نہیں، تم سب آزاد ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ کا بڑا دشمن ابوسفیان تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا ﴿من دخل دار ابی سفیان آمن﴾ جو ابوسفیان کے گھر میں آج داخل ہوا وہ امن میں ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان کو اس طرح پورا کیا کہ جو بھی اس دن ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا اسے امان مل گئی۔

مکہ مکرمہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کرنے میں سب سے زیادہ دو اشخاص کا دخل تھا وہ ابولہب کے بیٹے تھے جنہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو ایذائیں دی تھیں۔فتح مکہ کے روز یہ دونوں گستاخ کعبۃ اللہ کے پردوں کے پیچھے جا چھپے۔حضور نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں کو خود کعبۃ اللہ کے پردوں کے پیچھے سے نکالا اور معاف کر دیا۔(۴۲)

پروفیسر سید عبدالرحمٰن بخاری اپنے خوبصورت مضمون ''ذات و سیرت مصطفیٰ ﷺ میں پنہاں زندگی کا حقیقی شعور'' میں لکھتے ہیں۔(۴۳)

وہ رحمۃ للعلمین بن کر آئے ہیں۔۔۔پس جو کوئی عالمین میں شامل ہے۔۔۔وہ ان کی رحمت سے ہر حال میں فیضیاب ہے۔۔۔کوئی مومن ہو یا کافر۔۔۔برا ہو یا اچھا۔۔۔امیر ہو یا غریب۔۔۔حقدار ہو یا سائل۔۔۔خوش اخلاق ہو یا بدتمیز۔۔۔میرے آقا ﷺ نے تو ہر ایک کو رحمت ہی سے ڈھانپا۔۔۔اور محبت ہی سے نوازا ہے۔۔۔ہمارے سامنے کوئی سائل آئے اور بداخلاقی کا مظاہرہ کرے۔۔۔تو ہمیں اس پر غصہ آئے گا۔۔۔پھر ہم اسے نوازنے کی بجائے ڈانٹنے لگیں گے۔۔۔یہ ہمارے احساس کا رخ اور برتاؤ کا معیار ہے۔۔۔عالم بشریت کا طرز احساس یہی ہے۔۔۔اور یہی ہوسکتا ہے۔۔۔مگر وہ کہ رحمت

اب آیئے دوسری بات کی طرف، کسی شخص پر رحمت نبوی ﷺ ہو تو اس میں کیا سو فیصد خرابیاں اور خامیاں ہی ہونگی یا اس رحمت کے صدقے اس میں اچھائیاں بھی پائی جائیں گی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص حضور ﷺ کے دائرہ رحمت میں بھی داخل ہو اور اس میں سو فیصد خرابی اور برائی بھی پائی جائے۔

دائرہ رحمت میں داخل ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کی ذات میں پائی جانے والی اچھائیوں اور نیکیاں کی نسبت اسی رحمت نبوی ﷺ کا فیض ہے جسے وہ شخص اپنے عقائد اور بانیوں کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ رب العالمین اور رحمت للعالمین ﷺ نے اس شخص کے عقائد باطلہ اور نظریات کے باوجود بھی اسے اپنی رحمت سے دور نہیں رکھا۔ وہ بت سے بھی مانگتا ہے تو رب العالمین اسے اولاد کی نعمت سے نوازتا ہے۔ یہ ہے باطل عقیدے کے باوجود خدا کی اپنے بندے سے محبت۔ اللہ دیتا ہے اور حضور ﷺ بانٹتے ہیں ﴿**وانما انا قاسم واللہ یعطی**﴾ اور دونوں اتنے رحیم و کریم ہیں کہ عقیدہ نہ رکھنے کے باوجود بھی جھولی بھر کے لوٹاتے ہیں۔

رب العالمین اور رحمت للعالمین ﷺ کے تصورات کے حوالہ سے ہمارا مطالعہ اور تجزیہ ہمیں جس سوچ کی طرف ابھارتا ہے اور اس کے پس منظر میں **بین المذاہب مکالمہ** یا تقابل ادیان کی جو تعریف ہم کریں گے وہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب، معاشروں اور افراد میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رحمت کے نمونے تلاش کئے جائیں۔ رحمت خوبیوں کی بنیاد ہوتی ہے۔ جب نظر خوبیوں اور اچھائیوں پر ہوگی تو مل جل کر رہنے کا سلیقہ بھی آ جائے گا۔ مگر ہمارے ہاں جس طرز پر دوسرے مذہب پر کتب لکھی جاتی ہیں۔ اور بات کی جاتی ہے اس سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا خدا اور رسول رب العالمین اور رحمت للعالمین ﷺ نہیں۔ صرف رب المسلمین ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے عمل اور تفسیرات سے آپ ﷺ کے دائرہ رحمت کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی حدیث ہے:

﴿اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہ﴾

''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور تم میں سے بہتر وہ ہے
جو اللہ کے کنبہ کے ساتھ بہتر سلوک کرے''۔ (۴۴)

تو اللہ کی Family میں ہندو، عیسائی، یہودی، مسلمان سب شامل ہیں اور خدا سب مذاہب کے ماننے والوں کا ہے اور وہ سب کی سنتا اور مانتا ہے اس ہی لئے ہم خدا کو رب العالمین کہتے ہیں۔ ملاکی نبی نے کیا خوبصورت اور حق بات کہی:

﴿ کیا ہم سب کا ایک ہی باپ نہیں؟ کیا ایک ہی خدا نے ہم سب کو پیدا نہیں کیا؟ ﴾ ملاکی ۲:۱۰

ہمیں اپنے ظرف میں اتنی وسعت تو رکھنی چاہیے کہ دوسروں کی اچھائیوں کو کھلے دل سے تسلیم کرتے ہوئے خود میں تبدیلی کی کوشش پیدا کریں۔ رحمت ہمیشہ مثبت ہوتی ہے جب آپ دوسروں میں رحمت کے نمونے تلاش کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دوسروں کی زندگیوں میں پائی جانے والی خوبیوں کو تسلیم کر رہے ہیں اس سے آپ کی ذات میں یہ فرق واضح طور پر رونما ہوگا کہ ہماری بالعموم منفی انداز میں کی گئی تربیت کو توڑنے میں بہت مدد ملے گی۔ جب ہم مثبت انداز میں سوچنا شروع کریں گے تو اس عمل کے لیے شروع میں مشکل ہوگی۔ حضرت شیخ ابو طالب مکیؒ فرماتے ہیں:

> پرانے دور میں جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو پوچھتے: ''کیا حال چال ہے؟'' اور اس سے ان کی مراد مجاہدہ و صبر ہوتا تھا اور مزید ایمان اور علم یقین کے سلسلہ میں دل کی کیفیت کیسی ہے؟ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ ہے اور دنیا و آخرت کے امور میں تمہارا حال کیسا ہے؟ کچھ اضافہ ہوا یا کمی ہوگئی؟ چنانچہ سلف صالحین، قلبی احوال اور اعمالِ علوم پر تبصرہ کرتے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ حسن معاملہ ان کے زیر بحث آتا اور یہ بتاتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ عجیب فہمی عطا کی یعنی ان کی مجالس میں انعامات الٰہی کا ذکر اور اس پر شکر ہوتا اور اس طرح انہیں معرفت و معاملہ میں ترقی حاصل ہوتی۔
>
> بعض سلف فرماتے ہیں کہ ہمارے بیشتر علوم و وجدان ان معلومات پر مشتمل ہیں جو باہمی ملاقات کے موقع پر ہم اپنے بھائیوں سے اخذ کرتے اور باہمی مذاکرہ میں معلوم ہوتے۔ آج جہالت چھا چکی ہے اس لیے یہ باتیں متروک ہوگئیں۔ آج جب لوگ خبر و حال کے بارے میں پوچھتے ہیں تو ان کی مراد دنیاوی امور و اسباب خواہش ہوتے ہیں اور پھر ہر آدمی اپنے مولائے کریم کی شکایت دوسرے بندے کے سامنے کرتا ہے۔ اس کے احکام پر ناراض ہوتا، اس کی قضاء پر تنگ ہوتا، اپنے نفس کو اور جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اسے فراموش کر دیتا ہے۔ (۴۵)

شیخ ابو طالب مکیؒ نے بات تو تقریباً ہزار سال پہلے کہی تھی مگر لگتا ہے کہ ہمارے آج کے حالات و واقعات کی منظر کشی کی ہے۔ جب ہم دوسروں کی اچھائیاں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ مضبوط پائیدار اور دیرپا روابط کا باعث بنے گی۔ مسیحی بھائی اسی مثال کو حضور یسوع مسیح علیہ السلام کے رحمت اللعالمین ہونے کے تصور کے حوالے سے بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔

مکالمہ کی نئی تعبیر وتشریح

اگر ہم پاکستانی اور بین الاقوامی سطح پر مسیحی مسلم پیروکاروں کو باہمی پیار ومحبت اور امن کے ساتھ رہتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں لفظ "مکالمہ" کی نئی تعبیر وتشریح کرنا ہوگی۔ ہمارے نزدیک "مکالمہ" اعتقادی اختلافات کی بجائے باہمی متفقہ عقائد ونظریات پر Focus کرنے کا نام ہے۔ ہم اعتقادی اختلافات کو ختم کرنے کی بات نہیں کر رہے۔ ہمارے اعتقادی اختلافات ہی تو ہماری پہچان ہیں ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾۔ مسلمان اگر مسلمان ہے اور مسیحی اگر مسیحی ہے تو انہیں اختلافات کی وجہ سے۔ اور نہ ہی ہم متفقہ عقائد ونظریات پر Focus کروا کر کسی نئے مذہب کی بنیاد رکھنے کی بات ہو رہی ہے۔ فرق گذشتہ اور نئے طرزِ عمل میں صرف یہی ہوگا کہ گذشتہ کے برعکس ہم گفتگو اور معاملات کی بنیاد متفقہ عقائد ونظریات پر رکھیں گے تاکہ مثبت طرزِ عمل اور پاکیزہ ماحول کو فروغ ملے۔ جبکہ اختلافی مسائل صرف علماء کرام تک ہی محدود رکھے جائیں۔ اختلافی مسائل پر اگر بات کی بھی جائے تو تہذیب وشائستگی کے دائرے میں رہ کر۔ اختلاف بیان کر دیا جائے مگر طنز وتشنیع سے پرہیز کیا جائے۔ (اس پر مزید گفتگو آگے چل کر آئے گی)۔ مکالمہ کی اس نئی تعبیر وتشریح میں:

۱ ۔ مکالمہ عقیدہ منوانے کا نہیں بلکہ دوسروں کے دکھ درد بانٹنے کا عنوان ہوگا۔

۲ ۔ مکالمہ فتح یاب ہونے کا نہیں بلکہ محبت بانٹنے کا عنوان ہوگا۔

۳ ۔ مکالمہ مذہبی بننے کا نہیں بلکہ روحانی ہونے کا عنوان ہوگا۔

۴ ۔ مکالمہ اپنی بات منوانے کا نہیں بلکہ دوسروں کی بات کو سمجھنے کا عنوان ہوگا۔

۵ ۔ مکالمہ ایک دوسرے کو شک وشبہ سے دیکھنے کا نہیں بلکہ مل جل کر مسائل کے حل کے لیے ممکنات کی وادی میں جھانکنے کا عنوان ہوگا۔

۶ ۔ مکالمہ جنگ وجدل کا نہیں بلکہ باہمی محبت وتعاون کا عنوان ہوگا۔

۷ ۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مکالمہ اعلیٰ وبرتر بننے کا نہیں بلکہ عجز وانکساری کے راستے پر چل کر انسان بننے کے عمل کا عنوان ہوگا۔

کیا ہم اپنی تواریخ کے ذمہ دار ہیں؟

ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی ہوگی کہ آج جو تاریخ ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں یہ خدا کی یا مذہب کی تاریخ نہیں بلکہ انسان کی تاریخ ہے اور انسان خواہ اُس کا تعلق کسی بھی عقیدہ یا معاشرے سے ہو

غلطی وخطا کا پتلا ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

﴿كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَ خَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ﴾

تمام بنی آدم خطا کار ہیں، اور بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔ (۴۶)

مسیحی مسلم تواریخ میں پائے جانے والے چند برے لوگوں کی بداعمالی اور مذہب کے نام پر ناحق قتل وغارت کے نہ تو آج کے مسیحی اور مسلمان ذمہ دار ہیں اور نہ ہی اس کے لیے جواب دہ۔ البتہ ہم اس بات کے ضرور ذمہ دار ہیں کہ ہم اپنے اپنے مذہب کی تاریخ کو معاشرے میں امن ومحبت پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں یا اس کی بنیاد پر تشدد پسندی اور انتہا پسندی کو ہوا دیتے ہیں۔ یہ بات حق ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اور حضور مسیح علیہ السلام اللہ کے سچے نبی ہیں۔ آپ سے اختلاف فرد کو دائرہ اسلام اور دائرہ مسیحیت سے باہر کر دیتا ہے مگر آپ کے علاوہ ہر کسی سے علمی وفکری اختلاف اسلام اور مسیحیت نے جائز رکھا ہے۔

سیرت المسیح علیہ السلام و سیرت النبی ﷺ

اگر آپ حضور ﷺ اور حضور یسوع مسیح علیہ السلام کی سیرتوں کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ نے دوسروں کی ذات میں نقص تلاش کر کے اور پھر انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر کے اپنے پیغام کی تبلیغ نہیں فرمائی۔ بلکہ دوسروں کے ساتھ پیار ومحبت سے پیش آ کر انہیں خود اعتمادی اور نفسیاتی تحفظ فراہم کیا اور ساتھ ساتھ انہیں خدا کا پیغام پیش کیا۔ آج ہم نے یہ تبلیغی طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے کہ جب تک دوسروں کو احساس کمتری، احساس گناہ اور احساس شکست میں مبتلا نہ کر دیں انہیں خدا کی رحمتوں سے مستفیض ہونے کے قابل نہیں سمجھتے۔

ان انبیاء اور رسل کی شخصیتوں میں جھوٹا احساس برتری نہیں تھی جس سے سننے والوں میں کبھی ردِ عمل پیدا نہیں ہوا۔ عجز وانکساری کے ساتھ اور پیار ومحبت کے ساتھ خالق کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچایا۔ انہوں نے لوگوں کو ان کی خوبیاں اور اچھائیاں یاد دلائیں اور دین کو آسان اور خوشخبریوں کے ساتھ پیش کیا۔ اور جب لوگوں کو اپنی خوبیاں یاد آئیں تو یاد دلانے والے کو انہوں نے اپنا دوست اور غمگسار سمجھا اور پھر اس پیغامِ الٰہی کی بنیاد پر اپنی زندگیوں کو اور معاشروں کو سنوارا۔ ان انبیاء اور رُسل (علیہم السلام) نے ہمیشہ تبلیغ کا فطری انداز اختیار فرمایا۔ انہوں نے اپنی سچائی کے ثبوت میں اپنی بے داغ سیرت کا حوالہ دیا اور ہمیشہ نرمی اور شفقت کے ساتھ گفتگو فرماتے ہوئے اپنے دعویٰ کو بڑے اعتماد اور پُرمغز دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ یا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجتے

وقت ہدایت فرمائی کہ لوگوں کی آسانی ملحوظ رکھنا ﴿ یَسِّرَا ﴾ اور انہیں خوش وخرم رکھنا ﴿ وَبَشِّرَا ﴾ اور متنفر نہ کر دینا ﴿ وَلَا تُنَفِّرَا ﴾ اور ان میں اتحاد واتفاق پیدا کرنا ﴿ وَتَطَاوَعَا ﴾ اور ان میں پھوٹ نہ ڈالنا ﴿ وَلَا تَخْتَلِفَا ﴾۔ حدیث کا پورا متن یہ ہے:

﴿حَدَّثَنَا عَنْ سَعِيدِ بْنِ اَبِي بُرْدَةَ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ بَعَثَ مَعَاذًا اَوْ اَبَامُوسىٰ اِلَى الْيَمَنِ قَالَ يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا﴾

سعید بن ابو بردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل یا حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجتے وقت ہدایت فرمائی کہ لوگوں کی آسانی ملحوظ رکھنا اور انہیں سختی میں نہ ڈالنا۔ انہیں خوش وخرم رکھنا اور متنفر نہ کر دینا۔ ان میں اتفاق رائے اتحاد پیدا کرنا اور ان میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ (۴۷)

اگر خلوص نیت سے صرف اس ایک حدیث کی روشنی میں آج کے پاکستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہماری دینی وسیاسی قیادت ذاتی کردار اور فرائض تبلیغ میں کس مقام پر کھڑی ہے؟

اناجیل اربعہ اور آج کا پاکستان

اگر ہم دور جاہلیت کی اسلامی تاریخ اور اناجیل اربعہ کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اُس دور کے سماجی حالات آج کے زمانے سے مختلف نہیں ہیں۔ حضور یسوع مسیح علیہ السلام اپنے دور کی مذہبی قیادت کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

﴿اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دَہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیز گاری سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرتا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریا کاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔﴾ انجیل متی، ۲۳:۲۳-۲۸

پھر ایک اور مقام پر عوام الناس کو یوں نصیحت فرماتے ہیں:

﴿انہیں چھوڑ دو۔ وہ اندھے راہ بتانے والے ہیں۔ اور اگر اندھے کو اندھا راہ بتائے گا تو دونوں گڑھے میں گرینگے۔﴾ انجیل متی ۱۵:۱۴

اناجیل اربعہ میں نظر آنے والے مذہبی ماحول کو پاکستان کے مذہبی ماحول سے موازنہ کریں تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آئے گا۔ یسوع مسیح علیہ السلام نے اور حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کے ساتھ جو مکالمہ کیا تو وہ Similarities پر Base کرتا تھا۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ م بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ٥﴾ آلِ عمران ۳:۶۴

آپ فرمادیں: اے اہل کتاب! تم اس بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، (وہ یہ) کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہیں بنائے گا، پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دو کہ گواہ ہو جاؤ کہ ہم تو اللہ کے تابع فرمان (مسلمان) ہیں۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کی تفسیر ہمارے نقطہ نظر کے حق میں یوں فرماتے ہیں:

﴿تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ م بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ﴾ اس آیت سے تبلیغ ودعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہش مند ہو جو عقائد ونظریات میں اس سے مختلف ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہو۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب روم کے بادشاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی واحدانیت پر۔ (۴۸)

معروف مسلمان ترکی مفکر محترم فتح اللہ گلن (Fethullah Gulen) اپنی کتاب ''ایڈووکیٹ آف ڈائیلاگ'' (Advocate of Dialogue) میں مکالمہ کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بین المذاہب مکالمہ آج کے دور کی اہم ضرورت ہے اور اس کے قیام کے اولین اقدامات میں سے مناظراتی بحث و مباحثہ سے اجتناب کرنا اور باہمی متفقہ نکات پر مل بیٹھ کر مشترکہ مسائل کو حل کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کرنا شامل ہیں۔ مغرب کے دانش وروں اور علمائے دین کے رویوں میں اب ایک تبدیلی آ رہی ہے۔ پیغمبر اسلام کے متعلق مغرب کا نقطہ نظر بہتر ہو رہا ہے۔ مسیحیت کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے علمائے کرام اب اسلام اور پیغمبر اسلام کا احترام کرتے ہیں اور مکالمہ کی ضرورت و اہمیت پر زور دے رہے ہیں۔ دوسری ویٹی کن کی کونسل کے اعلامیہ نے بھی یہ بیان کیا ہے کہ اسلام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پوپ جان پال دوئم نے اپنی کتاب (Threshold of Dialogue) میں لکھا ہے کہ ایک عام مسلمان کی تمام تر دنیاوی سستی و کاہلی کے باوجود وہ خدا کی انتہائی لگن اور بہترین انداز میں عبادت کرتے ہیں۔ اس معاملے پر وہ کیتھولک مسیحیوں کو یاد دلاتے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کی اپنے دین سے لگن کے طرز عمل کو ایک اعلیٰ مثال سمجھتے ہوئے اپنے دین کی پیروی کرنی چاہیے۔ (۴۹)

مکالمہ بین المذاہب، نئی تحریک کے نئے فسادات

مکالمہ بین المذاہب کی اس نئی تحریک کے جہاں فوائد ہیں وہاں اس کے اپنے کئی ایک مسائل بھی ہیں جن کا مختصراً تذکرہ یہاں بہت ضروری ہے۔

پہلا فساد: ایمان و یقین سے عاری مغرب نواز ''علمائے دین''

آج کل ایسے بھی ''علمائے دین'' پیدا ہو رہے ہیں جنہیں علمائے دین کی صف میں شامل کرنا بذات خود ایک جہالت ہے۔ یہ لوگ خوبصورت لباس پہنے، علمائے دین کا روپ دھارے، مسیحی مسلم مکالمہ کی اس تحریک کو بڑی شدت کے ساتھ سپورٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہی میں سے ایک صاحب سے میری ملاقات ایک دوست کے حوالے سے ان کے اپنے دفتر میں ہوئی۔ ان کے علمی مقام و مرتبے کا اندازہ تو مجھے ان کے دفتر کی شیلف میں رکھے ہوئے بائبل مقدس کے الٹے انگریزی تراجم سے ہی ہو گیا۔ ان

صاحب نے دفتر میں موجود اپنی مختصر لائبریری کا تعارف کرواتے ہوئے انتہائی عقیدت و احترام سے بائبل کے الٹے رکھے ہوئے انگریزی تراجم کو شیلف سے نکالا، فخر سے مجھے دکھائے اور پھر اسی الٹی سمت واپس رکھ دیے۔ شاید موصوف الٹی انگریزی پڑھنے کے عادی تھے۔ جب میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ جناب آپ کن بنیادوں پر مسیحی مسلم مکالمہ کروانے کے حق میں ہیں اور اپنے سامعین کو اس مکالمہ کی اسلامی بنیادوں سے کس طرح متعارف کرواتے ہیں تو انہوں نے گفتگو میں چند دلائل یوں دیے:

☆ حضور نبی کریم ﷺ کی پوری حیات طیبہ میں ہمیں کامیابی کے تمام زینے یہود و نصاریٰ کے تعاون سے کامیابی سے طے کرتے نظر آتے ہیں۔ عرب تو قبائلی دشمنی اور جہالت کے باعث آپ ﷺ کے سخت دشمن تھے۔ اسی حوالے سے یہود و نصاریٰ ہمارے لیے قابل احترام ٹھہرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے نبی ﷺ کی مدد و نصرت فرمائی اور یہ مسیحی مسلم مکالمہ کی بنیاد بنتی ہے۔

☆ ڈنمارک کے اخبارات میں چھپنے والے کارٹونوں کے اوپر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ پاک نے اپنے نبی کی قرآن مجید میں خود حفاظت کا ذمہ ٹھہرایا ہے تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ احتجاج کرتے پھریں۔ بلکہ ہمیں مغربی ممالک سے اس احتجاجی رویے پر معذرت کرنی چاہیے۔

☆ دین و سیاست الگ الگ ہونی چاہیے۔

☆ قرآن مجید کی وہ تمام آیات جن میں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی سے خبردار رہنے کے لیے کہا گیا ہے ان کے متعلق موصوف فرماتے ہیں کہ یہی وہ آیات ہیں جن کو ''دہشت گرد'' دہشت گردی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں نے جب انہیں ٹوکا اور کہا کہ براہ کرم ان آیات کی صحیح اسلامی تفسیر کیا ہو گی تو وہ اس کے جواب میں لفظوں سے محروم دکھائی دیے۔

اس طرح کے افراد جو دینی غیرت و حمیت سے دست بردار ہو کر دوسرے مذاہب کے حق میں اس طرح کے جاہلانہ بیان دینا شروع کر دیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں نہ صرف مسلمانوں میں اپنی بدنامی کا باعث بنتے ہیں بلکہ مخلص علماء کی کوششوں کا بھی بیڑا غرق کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اور عوام الناس یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ شاید مسیحی مسلم مکالمہ اسلامی عقائد و نظریات کو تبدیل کرنے اور شانِ رسالت مآب ﷺ میں بے ادبی اور گستاخی کرنے کی ایک سازش کا عمل ہے۔ الغرض اس طرح کے افراد اپنے اسلامی عقائد و نظریات اور تاریخی حقائق سے اس قدر جاہل ہیں کہ باقاعدگی سے اخبار پڑھنے والا شخص بھی ان سے زیادہ باعلم معلوم ہوتا ہے۔ سونے پر سہاگہ کے مصداق کہ یہ لوگ بائبل مقدس کا محض اردو ترجمہ پڑھ کر اپنے آپ کو مسیحیت پر اظہار خیال کرنے کی اتھارٹی سمجھنے لگتے ہیں۔ معروف مزاح نگار ضیاء الحق قاسمی نے ان کی علمی قابلیت کا پول ان مزاحیہ اشعار میں یوں کھولا ہے

رات دن رہتا تھا جب غرق کتب بینی میں وہ
اس کو گمنامی کے ڈر سے پھر تپِ دق ہوگیا
وہ کتابیں چھوڑ کر حقہ کشی کرنے لگا
اور پھر لوگوں نے دیکھا وہ محقق ہوگیا

ایسے ''علمائے کرام'' اپنے طرزِ تحقیق سے جس نوعیت کی ''خدمتِ اسلام'' سرانجام دیتے ہیں اس کے متعلق معروف مورخ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

سرسید نے اپنی رائے اور قیاس کے زور سے قرآنی آیات کو نیا مفہوم دے کر ایک ایسی مثال قائم کردی جس کی پیروی بعضوں نے بُری طرح کی ہے۔ اور ہر آیت یا حدیث کی تاویل کر کے حسب خواہش معنی مراد لیے ہیں۔ یورپ سے کوئی بھی آواز اٹھے، لوگ فوراً یہ کہنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی یہی ہے۔ پچھلے دنوں ایک ایل ایل بی صاحب نے ایک رسالہ اس مضمون کا شائع کیا تھا کہ اسلام میں مغربی طریقہ رقص یعنی ''بال روم ڈانسنگ'' کی اجازت ہے اور اس خیال کی تائید احادیث اور روایات سے کی تھی۔ اس طریقے سے ایک تو مخالفین کی نظروں میں جن کے اعتراضات رفع کرنے کے لیے علم الکلام کی ضرورت بتائی جاتی ہے اسلام کی کوئی وقعت اور عزت نہیں رہتی اور دوسرے قوم میں خود نیک و بد اور موزوں اور غیر موزوں کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور ایمان ویقین سے عاری لوگوں کے ہاتھوں میں مذہب ایک کھلونا بن جاتا ہے۔ (۵۰)

مولانا ابوالکلام آزاد مغرب سے تعلیم یافتہ ان ''علمائے کرام'' کے متعلق لکھتے ہیں:

ہمارے دوستوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کا سرمایہ علم ودانش یورپ کی رسمی وسطحی تقلید سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ تاہم جن چیزوں میں وہ اپنے ائمہ ہدیٰ کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، انہی میں اولین شے اجتہاد تھی اور ضرور تھا کہ اس تقلید مجتہدانہ کا سفر اسی منزل سے شروع ہوتا۔ قینچی ہاتھ میں ہو تو خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا ہے کہ کسی چیز کو تراشیے۔ اس اجتہاد کی قینچی ہمارے چابکدست دوستوں کے ہاتھ آگئی تو بے کار نہ بیٹھا گیا۔ یورپ کے علم وعمل کے سرشتوں پر تو کیا چلتی کہ وہیں کے کارخانے میں بنی ہوئی تھی۔ بس اپنے یہاں کی جو چیز سامنے آگئی وہی بلاتامل آلۂ مشق بنی۔ پھر اس کی روانی بے پناہ اور اس کی کاٹ بے روک تھی۔ سب سے پہلے مشرقی علوم وفنون، تہذیب وتمدن اور اخلاق وادبِ قومی سے اس کی آزمائش

شروع ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں سیکڑوں برسوں کے صفحات واوراقِ قدیمہ پُرزے پُرزے تھے''۔ پھر غریب مذہب کی باری آئی۔ یہ کپڑا دبیز تھا۔ اس لیے مقراضِ اجتہاد کی روانی بھی زیادہ تیز اور شدید تھی۔ پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا، جو پہلی آزمائش کا ہو چکا تھا اور جو کچھ باقی رہ گیا نہیں معلوم اور کتنی گھڑیوں کا مہمان ہے۔ (۵۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

میں جو نئے تعلیم یافتہ حضرات کا ہمیشہ شاکی رہتا ہوں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی ہر گزشتہ خوبی کو ان سے دور پاتا ہوں۔ اور ان کی جگہ کوئی نئی خوبی مجھے نظر نہیں آتی۔ ہماری گزشتہ مشرقی معاشرت، اوضاع واطوار، اخلاق وعادات، طریق بودوماند یہ سب کے سب انہوں نے ضائع کر دیے۔ اخلاق وتمدن کے بعد مذہب کا نمبر آیا۔ اور جدید تعلیم وتہذیب کے مندر پر مذہب کی قربانی بھی چڑھائی گئی۔ خیر مضائقہ نہیں۔ خرید وفروخت کا معاملہ اور متاع بے بہا ہاتھ آتی ہو تو دل وجان تک کو اس کی قیمت میں لگا دیتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ سب کچھ دے کر وہ کون سی چیز ہے جو ہاتھ آئی؟ علم؟ نہیں۔ اخلاق؟ نہیں۔ تہذیب ومعاشرت؟ نہیں۔ ایک پوری انگریزی زندگی؟ نہیں۔ ایک اچھی مخلوط معاشرت؟ یہ بھی نہیں۔ پھر یہ کیا بدبختی ہے کہ جیب اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ (۵۲)

اپنے عقائد ونظریات پر مکمل عبور حاصل کیے بغیر دوسرے عقائد ونظریات پر مطالعہ کرنا (تقابل ادیان) اور غیر مسلم علماء ومبلغین سے بات کرنا علمی وفکری پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے اور اپنے عقیدے وایمان کے ساتھ جذباتی تعلق نہ ہو تو انسان کو ایمان سے محروم ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اسی لیے امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عقل مند آدمی پہلے حق کی معرفت حاصل کرتا ہے پھر کسی کی بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اگر وہ حق ہوتا ہے تو اس کو تسلیم کر لیتا ہے خواہ اس کے کہنے والا مسلمان ہو یا کسی دوسرے مذہب کا پیروکار۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سونے کے ساتھ مٹی ملی رہتی ہے اور صراف کے لیے کوئی خطرے کی بات نہیں کیونکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر مٹی اور سونے کو علیحدہ کر لیتا ہے مگر سادہ لوح عوام (اور ان جیسے علماء ومبلغین کو بھی) ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں کامل پیراک کے سوا بے وقوف آدمی کو ساحلِ سمندر میں پیراکی سے منع کرنا چاہیے۔ لڑکے کو سانپ چھونے سے منع کرنا چاہیے نہ کہ ماہر سپیرے کو۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک کثرت ایسے نادان لوگوں کی ہے جو (بزعم خود) اپنے آپ کو عقل مند و ماہر گردانتے ہیں (اور سمجھتے ہیں) کہ حق و باطل کی تمیز میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دوسرے مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ ایسے افراد پر بند کر دیا جائے جب تک وہ پہلے اپنے ایمان وعقیدہ پر مکمل عبور حاصل نہ کرلیں۔ (۵۳)

دوسرا فساد: علم چور محققین

علم وتحقیق میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو اپنی تحقیق وعلم کی بنیاد خود اپنی محنت پر رکھتے ہیں. روزانہ کتب کا مطالعہ کتب خانوں کی خاک چھاننا اور حوالہ جات کی درستگی کے لئے میلوں کا سفر اگر پیدل بھی کرنا پڑے تو ان کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔ ایسے لوگ فطرتاً شیر ہوتے ہیں۔ علمی مواد کی چوری ان کی فطرت میں نہیں ہوتی۔ امام ابن مقریؒ فن حدیث کے بہت بڑے عالم ہو گزرے ہیں۔ ان کے متعلق ''تذکرۃ الحفاظ'' میں ذکر ہے کہ آپ کو ایک کتاب سے حوالہ نقل کرنے کے لیے ۷۰ دن کا سفر کرنا پڑا اور وہ کتاب اس حالت میں تھی کہ اگر وہ کتاب کسی نان بائی کو دے کر ایک روٹی بھی خریدنا چاہتے تو شاید وہ اس پر بھی تیار نہ ہو۔ امام ابن مقریؒ کا محض ایک حوالہ کی درستگی کے لیے ۷۰ دن کا سفر طے کرنا ہمارے نام نہاد خادمین علم و ادب کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ہمارے بزرگ علمی دیانت کو برقرار رکھنے کے لیے ۷۰ دن پیدل سفر کرنا ناپسند خیال نہیں کرتے تھے اور ہم آج اکثر غلط حوالوں سے دوسروں کی عزتوں کو اچھال کر علم وادب کی دنیا میں عظیم ''انقلاب'' برپا کر رہے ہیں۔

زندگی میں ہر اچھی چیز کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ کبھی مال وزر کی شکل میں تو کبھی وقت کی شکل میں، مگر بغیر قیمت ادا کیے اس دنیا میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔

حتیٰ کہ بھیک مانگنے کے لیے بھی قیمت (وقت کی شکل میں) ادا کرنی پڑتی ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں در بدر صدا لگائی جائے تو تب کہیں جا کر ایک دو روپے ملتے ہیں اور ہم ہیں کہ گھر کے ایئر کنڈیشن ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر اخبارات کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو ''باخبر'' سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ لائبریری اگر گھر کے چند قدم دور ہو تو محض اس لیے نہیں جاتے کہ کہیں پسینے سے قمیص خراب نہ ہو جائے۔ اس پر ستم ہے کہ دوران گفتگو تاریخ کے جلیل القدر علماء پر تنقید اپنا بنیادی انسانی حق سمجھتے ہیں۔ اس پر مزید تفصیلی گفتگو ہم نے اپنے ایک دوسرے مضمون ''ہمارے اسلاف کی علم دوستی اور شانِ خودداری'' میں کی ہے۔

اسکے برعکس دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے نظریات اور علمی تحقیق چرانے کی عمدہ

صلاحیت رکھتے ہیں. یہ لوگ دوسروں کا علمی مواد چرانے کے ساتھ ساتھ ''تعلقات عامہ'' (PR) کے بھی ماہر ہوتے ہیں. اگر انہیں تحقیق کے صحیح معنی میں توفیق نصیب ہوتی تو شاید کئی دنوں تک کسی سے ملاقات کا وقت بھی نہ نکال پائیں.

مؤرخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ خطیب تبریزی کو ابو منصور ازہری کی کتاب ''التھذیب'' جو علم قواعد وزبان پر پتلی جلدوں میں تھی کہیں سے مل گئی۔ خطیب تبریزی نے ارادہ کیا کہ اس کتاب کے مندرجات کو کسی ماہر زبان سے تحقیقی طور پر سمجھیں۔ لوگوں نے اس سلسلے میں ''معری'' کا نام پیش کیا اور یہ کتاب کو تھیلے میں لے کر اُسے بغل میں لٹکاتے ہوئے تبریز سے ''معرۃ'' کی جانب چل پڑے۔ خطیب تبریزی کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ سواری کا انتظام کر سکتے۔ اس لیے دھوپ میں پیدل چلنے سے پسینہ آیا اور اس کا اثر تھیلے اور کتاب تک پہنچا اور کتاب پسینہ سے تر ہو گئی۔ اب اگر کوئی اس کتاب کو دیکھتا اور اسے صحیح صورت حال کا پتہ نہ ہوتا تو وہ یہی خیال کرتا کہ شاید پانی میں بھیگ گئی ہے حالانکہ اس پر صرف خطیب تبریزی کا پسینہ تھا۔

موسم گرما میں (اور وہ بھی پاکستان کا نہیں بلکہ عرب کی سرزمین کا) ایک کتاب کے مندرجات کو درست طریقے سے سمجھنے کے لیے حالت غربت میں لمبا پیدل سفر اختیار کرنا ہمارے ملک کے اس ''علم دوست'' طبقے کے بس کی بات نہیں، یہاں تو رویے ایسے ہیں کہ جیسے ہر کوئی ''ساری سمجھ'' اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے۔ دوسروں سے حصولِ علم کی غرض سے گفتگو اپنی بزرگی، شہرت اور عزت نفس کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔

یہ خصلت بھی ان لوگوں کی فطرت میں شامل ہوتی ہے کہ بااثر حلقوں سے پہلی قسم کے لوگوں کو کس طرح ''پرے'' رکھا جائے تاکہ ان کی اپنی عظمت کا بھانڈا نہ پھوٹے اور ان کی اپنی ''علمی ساکھ'' متاثر نہ ہو. الغرض اس دوسری قسم کے لوگوں کی فطرت اس کتے سے مختلف نہیں ہوتی جو دوسروں کی پھینکی ہوئی ہڈی پر پل کر بھونکنے کا عادی ہو جائے. ان لوگوں کی فطرت وعادات پر میں نے تفصیلی گفتگو اپنے ایک طنز و مزاح پر مبنی مضمون ''تعلیم یافتہ نظر آنے کے جدید طریقے'' میں کی ہے (اس مختصر مگر دلچسپ مضمون کو ہم نے قاری کے ذوقِ مطالعہ کے لیے ضمیمہ میں نقل کر دیا ہے)۔ پیر نصیر الدین نصیر نے ان لوگوں کے متعلق کیا خوب فرمایا:

موجودہ فضیلت بھی کوئی ہے کہ نہیں
تعلیم سے نسبت بھی کوئی ہے کہ نہیں
پوشاک تو قیمتی پہن لی تو نے

اپنی تیری قیمت بھی کوئی ہے کہ نہیں؟

تیسرا فساد: خوساختہ مجتہدین ومصلحین

آج کل پاکستانی معاشرے میں ایسے مسیحی اور مسلم مجتہدین ومصلحین بکثرت پائے جاتے ہیں جن کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ اپنے مذہب کے اچھے پہلوؤں اور تاریخی کارناموں کو یکسر فراموش کرکے ماضی میں ساری خامیاں اور خرابیاں تلاش کرتے ہیں اور پھر اپنے خیالات ونظریات کو مسائل کے حل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان سے پہلے جتنے بھی آئے سب نکمے اور ناکام رہے اور اللہ نے صرف ان کو عقل بخشی ہے کہ امّت مسیح علیہ السلام اور امت مسلمہ کا مقدر سنوار سکیں۔

کیا اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ اور مسیحیت کی دو ہزار سالہ تاریخ میں صرف برائیاں اور خامیاں ہی موجود ہیں؟ کیا دونوں مذاہب کی تاریخ میں انسان کی فلاح و بہبود کے لئے کئے گئے کارناموں کا کوئی وجود نہیں؟ ہمیں ایسے خود ساختہ مصلحین اور مجتہدین سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اصلاح کی کوئی بھی کوشش اسوقت تک مخلص ثابت نہیں ہوگی جب تک ہم اپنے ماضی کی کوتاہیوں اور لغزشوں کے ساتھ عظیم الشان کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے بھی نہ شرمائیں۔ ''ماضی میں بہت بُرا ہوا اور میرے پاس اچھے مستقبل کی ضمانت موجود ہے''۔ ایسی تحقیق کونسے منطقی اصول کے تحت وجود میں آئی ہے اور اس کا موجد کون ہے؟

بعض اوقات تو یہ خود ساختہ مجتہدین ومصلحین اسلامی عقائد کی صحیح تعبیر سے ناآشنا ہونے کے باعث بعض اوقات ایسی تجویز پیش کرتے ہیں کہ **مطالمه بين المذاهب** کے عمل کو بری طرح جھنجھوڑ کر معاشرے میں فتنہ اور فساد کا باعث بناتے ہیں اور یوں دوسرے مخلص لوگوں کے کئے ہوئے کام پر بھی پانی پھیر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب کے خیال کے مطابق مکہ شریف اور مدینہ طیبہ میں غیر مسلموں کے داخلے پر سے پابندی ہٹائی جائے اور ان شہروں میں ''**مكالمه بين المذاهب**'' کے سیمینار کا اہتمام کیا جائے۔ حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جمہور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق غیر مسلموں کا ان دونوں شہروں میں داخلہ منع ہے۔ اختلافی مسائل پر **مكالمه** کا آغاز کرکے **مكالمه** کے عمل کا صرف بیڑا غرق ہی کیا جاسکتا ہے جسے بعدازاں بآسانی میڈیا کی مدد سے مسلمانوں کی تنگ نظری اور جاہلیت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ آج کل مغربی میڈیا میں عام رواج ہے۔

یا پھر یہ کہیں گے کہ جناب قرآن مجید کی صحیح تعبیر وتشریح آج تک نہیں ہوسکی اور ہمارے مفسرین تنگ نظر اور تعصب پسند تھے لہٰذا ضروری ہے کہ **مكالمه بين المذاهب** کے فروغ کیلئے اور امّت مسلمہ کو اپنے اعلیٰ اخلاق کو ثابت کرنے کا ایک موقع فراہم کرتے ہوئے قرآن مجید کی ایسی نئی تعبیر وتشریح کی جائے کہ جس سے مکہ اور مدینہ شریف میں غیر مسلموں کو داخلے کی اجازت مل جائے۔ اور اس نئی تعبیر وتشریح سے انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت میسر آسکے (جس کے زیر سایہ مکہ اور مدینہ شریف میں مغربی

طرز پر فحاشی وعریانی کے اڈے بھی قائم ہو جائیں)۔

ان خود ساختہ مجتہدین ومصلحین نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذخیرہ کو بھی مشکوک اور ناقابل اعتبار ٹھہرانے پر پورا زور صرف کیا ہوا ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ جب حدیث کا ذخیرہ مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار پاجائے گا تو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر قرآن میں مرکزی حیثیت بھی ختم ہو جائے گی اور یوں اپنی ذاتی تفسیر کو قرآنی تفسیر کے نام پر فروخت کرنا آسان ہو جائے گا۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں قرآنی معنی ومفہوم کو توڑنے اور مروڑنے میں آسانی رہتی ہے۔

ہمارے نزدیک مکالمہ کی کوئی بھی کوشش اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک قرآن وسنت دونوں کا احترام شاملِ مکالمہ نہیں ہوتا۔ محض قرآن کو بنیاد بنا کر سنت کو ترک کرکے مکالمہ کا عمل معنوی تحریفات کو جنم دے گا اور معاشرہ میں فتنہ وفساد کا باعث بنے گا۔

ہمارے نزدیک راہِ حق واعتدال یہ ہے کہ اسلام میں دو اصل ہیں اور دونوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب وسنت ونصوصِ شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہیے اور اسی پر حکم وعمل کرنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ تمام آئمہ اسلام اور علمائے حق سے حسن ظن اور محبت رکھنی چاہیے اور ان کے مراتب وحقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن وتناسب کو با اعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں، اور بد بخت لوگوں نے ہمیشہ انہی میں افراط وتفریط کی ہے، یا دونوں میں سے کسی ایک ہی کے ہو رہے ہیں۔

ایک جماعت احکام ونصوصِ شرعیہ کے اتباع وتقدیم کا یہ مطلب سمجھتی ہے کہ جہاں کسی اہلِ علم وحال کا کوئی قول بظاہر کسی حکم ونص قرآنی کے خلاف نظر آیا، بلا تامل تضلیل وتکفیر پر آمادہ ہوگئے اور جھٹ حکم لگا دیا کہ وہ منکرِ شریعت ہے، اگرچہ اس نے اپنی ساری زندگی شریعت کے علم وعمل میں بسر کردی ہو۔ دوسری جماعت نے ائمہ واکابرین کی پیروی اور محبت واعتقاد کے معنی سمجھے کہ احکام ونصوص کو اُن کا تابع ومحکوم بنا دیا اور چند غیر معصوم انسانوں کی خاطر کتاب وسنت کو ترک کرکے ﴿اتَّخَذُوٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ کی سرحد سے قریب ہوگئے۔ اس دوسری جماعت کا عجیب حال ہے۔ یہ جب کبھی اپنے پیشواؤں کے کسی قول کو احکام ونصوصِ شرعیہ کے خلاف دیکھتی ہے تو اس کی جرات اپنے اندر نہیں پاتی کہ قرآن وسنت کو مقدم رکھ کر اس قولِ مخالف کی تاویل کرے اور اس طرح شریعت الٰہی کو بھی اپنی جگہ چھوڑنے کی زحمت نہ دے اور پیشوایانِ اسلام کے دامن کو بھی مخالفتِ شریعت کے دھبے سے بچائے بلکہ برعکس اس کے کوشش کرتی ہے کہ اپنے پیشواؤں کی باتوں کو مقدم رکھ کر کسی نہ کسی طرح قرآن وحدیث کو ان کے مطابق کر دکھائے، اگرچہ ایسا کرنے میں تاویلِ نصوص، تحریفِ نصوص تک پہنچ جائے۔

اس جماعت کے متعلق حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اپنی مثنوی کے دفتر اول میں فرماتے ہیں:

کردہ تاویل حرف بکر را	تو نے اچھوتے حرف میں تاویل کی ہے
خویش را تاویل کن نے ذکر را	اپنے آپ کو بدل، قرآن میں تاویل نہ کر
فکر تو تاویل کردہ ذکر را	تیری فکر نے قرآن میں تاویل کی ہے
ذکر رامان و بگرداں فکر را	قرآن کو اپنی حالت پر رہنے دے، فکر میں تبدیلی پیدا کر
بر ھوا تاویل قرآں میکنی	خواہش کے مطابق تو قرآن کی تاویل کرتا ہے
پست و کثر شد از تو معنی سنی	تیری وجہ سے روشن معنی پست اور کج ہو گئے ہیں

اسلام نے دونوں راہوں کو بند کرنا چاہا ﴿غَيْرِ المَغضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْن﴾۔ پہلی جماعت کو گمراہی نے بغض و انکار کا چہرہ دکھلا کر بھٹکایا اور دوسری کو محبت و اتباع کے نقاب میں۔ اور دنیا میں جس وقت سے نوعِ انسانی آباد ہوئی ہے، ہمیشہ گمراہی کے یہی دو بھیس رہے ہیں، یا افراطِ بغض نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے یا افراطِ محبت نے۔

جو لوگ حضور ﷺ کے مقابلے میں اپنی من مانی تعبیر اور بے بنیاد قیاس و آرائی سے کام لیتے ہیں ان کی مذمت میں حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں:

﴿ایاکم واصحاب الرائے فانھم اعداء السنن اعیتھم الاحادیث ان یحفظوھا فقالوا بالرائے فضلو واضلو﴾

لوگو! رائے اور من گھڑت قیاس آرائی کرنے والوں سے بچو، اس لیے کہ یہ لوگ سنت کے دشمن ہیں۔ احادیث کے حفظ کرنے سے یہ لوگ عاجز رہ گئے ہیں۔ اس بناء پر انہوں نے قیاس آرائی کا سہارا لیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود بھی گمراہ ہو گئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر ڈالا ہے۔ (۵۴)

امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

﴿لولا السنة مافھم احد منا القرآن﴾

''اگر سنت کا وجود نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا۔ (۵۵)

چنانچہ ہمارے نزدیک مسیحی مسلم مکالمہ محبت کی بنیاد اُسی تصور پر ہے جس کو حضرت عمر فاروق اور امام اعظم ابوحنیفہ نے بیان فرمایا اور اس کی مزید وضاحت مولانا ابوالکلام آزاد نے یوں فرما دی:

قابل غور وہ عشق و شغف ہے جو امام موصوف (ابن تیمیہ) کو خصوصیت کے ساتھ سیرت نبویہ سے تھا۔ ایک سرسری نظر رکھنے والا تو اس واقعے کو معمولی سی بات سمجھ کر معرضانہ آگے بڑھ جائے گا لیکن صاحبِ نظر و بصیرت اسی ایک بات سے امام موصوف کے تمام علوم و اعمال کا محور و مرکز معلوم کر سکتا ہے۔

انہوں نے ایک ایسے صاحب علم مگر مریض شک و اضطراب کو جو مدعیان علم و حکمت کی دانش فروشیوں کے ہاتھوں اپنا یقین و اطمینان ضائع کر چکا تھا یہ وصیت کی کہ ساری چیزیں چھوڑ کر صرف حیاتِ طیبہ نبوت کے مطالعہ و تفکر میں لگ جاؤ اور گویا اس طرح بتلا دیا کہ علم و بصیرت کا اصلی سرچشمہ صرف حیات نبوت اور منہاجِ مقام رسالت ہے جس کو قرآن حکیم نے ''الحکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ﴿وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْراً كَثِيراً﴾ کیونکہ دنیا میں حکمت صادقہ کا اس حکمت سے الگ کوئی وجود ہی نہیں۔ ''حکمت'' یا تو خود منہاج و سنتِ نبوت ہے یا علم و عمل کی ہر وہ بات جو اُس سے ماخوذ اور صرف اُسی پر مبنی ہو۔ یہی ''خیر کثیر'' جمیع خیرات و برکات ارض و نوع ہے اور صرف اسی نسخہ شفا سے دل اور روح کی ساری بیماریاں دور ہو سکتی ہیں خواہ شکوک و ارتیاب کی بیماری ہو، خواہ ادہام و انکار کی، خواہ ادعائے ادریت کا ہیجان ہو، خواہ حیرانی و سرگردانیِ لاادریت کا خمار۔ (۵٦)

بدقسمتی سے **مکالمہ بین المذاہب** آج ایک ایسی دوشیزہ کے روپ میں ہے جس کے جسم سے ہر شخص حسب توفیق اپنی ہوس پوری کر رہا ہے۔ ''**مکالمہ بین المذاہب**'' کی یہ تحریک تبھی کامیاب ہوگی جب ہم اس تحریک کو مفاد پرست اور شرانگیز لوگوں کی دسترس اور شراکت سے پاک رکھیں۔

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ مولانا سمیع الحق، صلیبی دہشت گردی اور عالم اسلام، ص ۱۰۱-۱۰۲، مطبوعہ ۲۰۰۴ء، القاسم اکیڈمی، خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد

۲۔ پروفیسر علامہ ساجد میر، عیسائیت: مطالعہ و تجزیہ، ص ۷، دارالسلام پبلشر

٣۔ ایضاً،ص ٧-٨
۴۔ ایضاً،ص ١٣
۵۔ ایضاً،ص ١٨-١٩
٦۔ ایضاً،ص ١٩
٧۔ ایضاً، ص ٢٠
٨۔ ایضاً،ص ٢٣
٩۔ ایضاً،ص ٢٣-٢۴
١٠۔ ایضاً،ص ۴٩٢
١١۔ ایضاً،ص ۴٩٣
١٢۔ ایضاً،ص ۴٩۴
١٣۔ ایضاً،ص ۴٩۵
١۴۔ ایضاً،ص ١٩
١۵۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، جلد١،ص ۵٧١
١٦۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، تفسیر ضیاء القرآن، جلد١،ص ۵٩٠
١٧۔ مولانا مفتی محمد شفیع، تفسیر معارف القرآن، جلد٣،ص ۴٢١
١٨۔ حافظ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر جلد۴،ص ٣
١٩۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، جلد٣،ص ٧٠٨
٢٠۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، تفسیر ضیاء القرآن، جلد٣،ص ۵٣٩
٢١۔ مولانا مفتی محمد شفیع، تفسیر معارف القرآن، جلد اول،ص ٢۵۴
٢٢۔ امام غزالی، المنقدمن الضلال، ص ٢٩، بترجمہ تلاشِ حق از خالق حسن قادری، مطبوعہ ١٩٧١ء، محکمہ اوقاف پنجاب-لاہور
٢٣۔ بخاری، ج ٢،ص ١٠٢۴، مشکوٰۃ المصابیح جلد٢،ص ۵٢٦
٢۴۔ ترمذی جلد ٢،ص ٦٣
٢۵۔ بیہقی فی شعب الایمان، بحوالہ تفہیم القرآن، جلد۵،ص ٩٧ (تفسیر سورۃ حجرات آیت ١٣)
٢٦۔ محمد متین خالد صاحب، پادریوں کے کرتوت، مطبوعہ علم وعرفان پبلیشرز-لاہور
٢٧۔ ایضاً،ص ١١

٢٨۔ ایضاً،ص ١٣-١۴
٢٩۔ ایضاً، ص ١٢
٣٠۔ مولانا اشرف علی تھانوی، تفسیر سورہ الانعام آیت ١٠٨
٣١۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، سورہ الانعام آیت ١٠٨
٣٢۔ حکیم محمد عمران ثاقب نے، بائبل اور محمد رسول اللہ،ص ٢٠١، مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ، اُردو بازار-لاہور
٣٣۔ محمد مشتاق احمد، شعبہ قانون و شریعت، بین الاقوامی یونیورسٹی - اسلام آباد، بحوالہ نقطہ نظر، شمارہ ٢٢ (اپریل-ستمبر ٢٠٠٧ء)، صفحہ ٢٩، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز-اسلام آباد
٣۴۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ٢٩ دسمبر ١٩٩١ء
٣۵۔ شیخ سیّد عبدالقادر جیلانی، الفتح الربانی
٣٦۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ، تفسیر ضیاء القرآن، جلد اول،ص ٢١-٢٢
٣٧۔ ایضاً، جلد اول،ص ٢١-٢٢
٣٨۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، الجامع الصحیح البخاری، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر ٦٨٧
٣٩۔ روح المعانی، بحوالہ پیر کرم شاہ الازہریؒ، تفسیر ضیاء القرآن، جلد اول،ص ٢١-٢٢
۴٠۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، الجامع الصحیح البخاری، کتاب الدعوہ، جلد ٨،ص ٦۵، صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ٢٠٠٩، ٢٠٠٨، ٢٠٠٧، مسند امام احمد جلد ٢ صفحہ ٣٩٠، بحوالہ قاضی عیاض مالکی، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ،ص ١۴٠، مطبوعہ مکتبہ اعلیٰ حضرت-لاہور
۴١۔ تفسیر مظہری، دیکھیے تفسیر سورہ انبیاء ٢١: ١٠٧
۴٢۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، الحقوق الانسانیۃ فی الاسلام،ص ۵٢۵-۵٢٧
۴٣۔ پروفیسر سید عبدالرحمٰن بخاری، ذات و سیرتِ مصطفیٰ ﷺ میں پنہاں زندگی کا حقیقی شعور، ماہنامہ منہاج القرآن لاہور، مارچ ٢٠٠٧
۴۴۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب الشفقۃ والرحمۃ علیٰ الخلق، ص ۴۴٧
۴۵۔ شیخ ابوطالب مکی، قوت القلوب،ص ٧٠٦، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز-لاہور
۴٦۔ امام احمد بن حنبل، کتاب الزھد، باب ذکر التوبۃ
۴٧۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری، الجامع الصحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث: ٢٨٦
۴٨۔ مولانا مفتی محمد شفیع، تفسیر معارف القرآن، جلد ٢،ص ٨٧

۴۹۔ فتح اللہ گلن، ایڈووکیٹ آف ڈائیلاگ، ساتواں باب، ص ۲۴۶، مطبوعہ فاؤنٹین پبلیشرز ترکی

۵۰۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص ۱۶۳

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۵۷-۲۵۹

۵۲۔ ایضاً، ص ۲۵۷-۲۵۹

۵۳۔ امام غزالی، المنقد من الضلال، ص ۳۰، بترجمہ تلاشِ حق از خالق حسن قادری، مطبوعہ ۱۹۷۱ء، محکمہ اوقاف پنجاب-لاہور

۵۴۔ دارقطنی، السنن ۴: ۱۴۶، بحوالہ الحکم الشرعی از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، ص ۱۰۱، مطبوعہ منہاج القرآن پبلشرز

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۶۔ ابوالکلام آزاد، تذکرہ، ص ۱۸۲ مطبوعہ ساہتیہ اکادمی دہلی

﴿باب ۱﴾

۱۸۵۷ء کا دورِ مناظرات اور ہماری موجودہ صورتِ حال

☆

واضح ہونا چاہیے کہ جو مناظرہ اس غرض کیلئے ہو کہ خود جیتنا اور دوسرے کو شکست دینا لوگوں میں اپنے فضل و شرف، خوش تقریری اور فخر کو دکھلا کر اپنی طرف مائل کیا جائے تو ایسا مناظرہ اُن تمام عادتوں کا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند دیدہ اور شیطان کے نزدیک اچھی ہیں اُن کا منبع ہوتا ہے۔

حضرت امام غزالیؒ

﴿باب العلم، احیائے علوم الدین﴾

۱۸۵۷ء کے زمانہ میں برطانوی دورِ حکومت میں حکومتی عہدیداروں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہندوستان کے عوام الناس پر سیاسی فتح کے ساتھ اب وقت آ گیا ہے کہ اب ان کو مذہبی سطح پر بھی فتح کیا جائے۔ چنانچہ ایسے پادریوں کو بیرون ممالک سے بلایا گیا اور ان کی خصوصی حوصلہ افزائی کی گئی جو خاص طور پر اسلام دشمنی میں اپنا کوئی ثانی نہ رکھتے تھے اور پھر حکومت وقت کی سیاسی اور معاشی سرپرستی نے تو ان کے غرور وتکبر کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ہندوستان میں پہلے سے موجود مسیحی فلاحی اداروں اور مبلغین نے اس سازش کو بھانپ لیا اور سمجھ گئے کہ صدیوں سے مل جُل کر باہمی بھائی چارے کی فضا میں رہنے والے مسیحی مسلم افراد میں نفرت پیدا ہو جائے گی۔ لہٰذا انہوں نے مل جُل کر بیرون ممالک سے خصوصی طور پر درآمد کیے جانے والے پادری حضرات کی غیر اخلاقی طرزِ تبلیغ، شعائرِ اسلام اور بانی اسلام کی ذات پر رکیک حملوں کی مذمت کی اور اس طرزِ تبلیغ کو مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے خلاف جانا۔ مگر جب کسی سازش کو حکومت وقت کی ہر طرح سے سرپرستی حاصل ہو تو پھر حق کی آواز وقتی طور پر دب بھی جاتی ہے۔

برطانوی حکومت کی ہندوستان کے باسیوں کو سیاسی اثر و رسوخ کے زیرِ اثر مسیحی کرنے کی یہ سازش نہ صرف مسلمان سمجھ چکے تھے بلکہ امن پسند مسیحی بھی اس صورت حال سے اس لیے پریشان تھے کہ یہ پادری حضرات مسیحیت کی بدنامی کا سبب بن رہے تھے۔ ایسے دردمند اور امن پسند مسیحی مُبلغین کسی بھی طرح مسیحیت کی تبلیغ کی بنیاد شعائرِ اسلام اور بانی اسلام کی توہین پر رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ وہ تیار بھی کیسے ہوتے جبکہ یہ طریقہ تبلیغ خود یسوع مسیح علیہ السلام کی تعلیمات محبت اور بُردباری کے خلاف تھا۔ چنانچہ پولس رسول ایک آئیڈیل مبلغ کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

> ﴿لیکن بیوقوفی اور نادانی کی حجتوں سے کنارہ کر کیونکہ تُو جانتا ہے کہ اُن سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اور مناسب نہیں کہ خداوند کا بندہ جھگڑا کرے بلکہ سب کے ساتھ نرمی کرے اور تعلیم دینے کے لائق اور بُردبار ہو۔ اور مخالفوں کو حلیمی سے تادیب کرے۔ شاید خدا اُنہیں توبہ کی توفیق بخشے تا کہ وہ حق کو پہچانیں﴾ ۲ تیمتھیس ۲:۲۴

پادری صاحبان کے اسلام پر سرعام حملے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جنہیں انگریز نواز طبقہ ''بغاوت ہند'' کے نام سے موسوم کرتا ہے کی چند ایک وجوہات میں سے ایک وجہ ان مسیحی مبلغین کی دل آزار اور توہین آمیز تبلیغ بھی تھی۔ چنانچہ سرسید احمد خان اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھتے ہیں:

ہمارے گورنمنٹ کی ابتدائے حکومت ہندوستان میں گفتگو مذہب کی بہت کم تھی روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجہ کمال پہنچ گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے گورنمنٹ کو ان امور میں کچھ مداخلت نہ تھی مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملہ بموجب حکم اور بموجب اشارہ اور مرضی گورنمنٹ ہوتے ہیں۔ سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں گورنمنٹ اور حکام انگریزی ولایت زا جو اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام متعہد اور افسران فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی بعضے صاحب اپنے ملازمین کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر ان کو پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرض اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عمل داری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔(۱)

پھر لکھتے ہیں:

پادری صاحبوں کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی۔ تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال جواب چھپنی اور تقسیم ہونی شروع ہوئیں۔ ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت الفاظ اور مضامین رنجیدہ مندرج ہوئے۔ ہندوستان میں دستور وعظ اور کتھا کا یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے۔ پادری صاحبوں کا طریقہ اس کے برخلاف تھا، وہ خود غیر مذہب کے مجمع اور تیرت گاہ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص صرف حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپڑاسی جانے لگا۔ پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا کرتے تھے بلکہ غیر

مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی۔(۲)

مشنری سکولوں اور دیہاتی مکتبوں (village schools) کی کارکردگی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

مشنری سکول بہت جاری ہوئے اور اس میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام متعہد ان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے، پوچھا جاتا کہ تمہارا خدا کون، تمہارا نجات دینے والا کون اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے۔ اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔ ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھرتا جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے لڑکوں کو کیوں داخل کرتے تھے۔ اس بات کو عدم ناراضی پر خیال کرنا نہیں چاہیے بلکہ یہ ایک بڑی دلیل ہے۔ ہندوستان کے کمال خراب حال اور مفلس اور نہایت تنگ اور تباہ حال ہو جانے پر یہ صرف ہندوستان کی محتاجی اور مفلسی کا باعث تھا کہ لوگ اس خیال سے کہ ان اسکولوں میں داخل ہو کر ہماری اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہوگا۔ ایسی سخت بات کو جس سے بلاشبہ ان کو دلی رنج اور روحانی غم تھا، گوارا کرتے تھے، نہ رضامندی سے۔ دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب لوگ یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر ہر گاؤں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گاؤں میں کالا پادری ان کا نام تھا جس گاؤں میں پرگنہ وزیٹر یا ڈپٹی انسپکٹر پہنچا اور گنواروں نے آپس میں چرچا کیا کہ کالا پادری آیا، عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرشٹان (Christian) بنانے کو بٹھاتے ہیں اور فہمیدہ آدمی اگرچہ یہ نہیں سمجھتے تھے مگر یوں جانتے تھے کہ ان مکاتیب میں صرف اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے لڑکے اس میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام اور مسائل اور اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ ہے کہ

ہندوستان کے مذہبی علوم کو معدوم کردے تا کہ آئندہ کو عیسائی مذہب پھیل جائے۔ اکثر اضلاع شرقی ہندوستان میں ان مکتبوں کا جاری ہونا اور لڑکوں کا داخل ہونا صاف تحکما ہوا اور کہہ دیا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ لڑکوں کو داخل کیا جائے۔ (۳)

مزید لکھتے ہیں:

یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً سنہ ۱۸۵۵ء میں پادری صاحبان ای ایڈمنڈ (E.Edmond) نے دارالامارہ کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ اب ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے، سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک ہونا چاہیے، اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی ایک عیسائی مذہب ہو جاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان خطوط کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا۔ (۴)

نہی حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

انیسویں صدی میں بالخصوص جنگ آزادی کے بعد، ہندوستان میں اسلام کو تین خطرے درپیش تھے۔ پہلا خطرہ مشنریوں کی طرف سے تھا، جو اس امید میں تھے کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی انحطاط بھی شروع ہو جائے گا اور توحید کے پیرو تثلیث قبول کرلیں گے۔

دوسرا خطرہ یورپ اور ہندوستان میں ان خیالات کا اظہار تھا جنہیں دیکھ کر بقول سرسید ''مرجانے کو جی چاہتا تھا''۔ یہ لوگ اسلام کو عقل کا دشمن، اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کا مانع ثابت کر رہے تھے۔ ان میں صرف مشنری نہ تھے بلکہ مغربی یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور وہ انگریز حاکم بھی شامل تھے، جنہیں خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت سونپ رکھی تھی۔ اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق بدترین کتاب سر ولیم میور کی ہے، جو صوبجات متحدہ کے حاکم اعلیٰ تھے اور جنہوں نے اپنی کتاب کا خلاصہ دو فقروں میں لکھ دیا ہے: انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن، محمد کی تلوار اور محمد کا قرآن ہیں (نعوذ باللہ)۔

تیسرا بڑا خطرہ جو آئندہ اور بھی بڑھنے والا تھا، خود مسلمانوں کی دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات کا پیدا ہونا تھا۔ جن لوگوں کی نظروں سے مشنریوں اور دوسرے عیسائی مصنفوں یا آزاد خیال مغربی مفکروں کی کتابیں گزرتیں وہ اسلام کے بعض مسائل کو جو عام علما بیان کرتے تھے، خلاف عقل سمجھنے لگے۔ اور یہ ڈر تھا کہ اگر چہ وہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کریں گے لیکن مذہب سے ضرور بیگانہ ہو جائیں گے۔ سرسید خود لکھتے ہیں: ''اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقت پر نہ متوجہ ہوتا تو یقینی مذہب چھوڑ دیتا''۔

تینوں خطروں میں سے جہاں تک مشنریوں کے خطرے کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ بنگلے کی چار دیواری میں بیٹھ کر کتابیں لکھنے سے نہ ہوسکتا تھا۔ یہ لوگ شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو کر لیکچر دیتے۔ پمفلٹ تقسیم کرتے، مناظرے کی دعوتیں دیتے اور وہیں انہیں کوئی شکار مل جاتا۔ ضروری تھا کہ جو ہتھیار یہ لوگ استعمال کرتے تھے، انہی سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ (۵)

علامہ اقبال کا بیان کردہ ایک دلچسپ واقعہ

انگریز مسیحی مشنریوں کی ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ اقبال اپنا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو تعطیلات کے زمانے میں کچھ دنوں کے لئے میں اپنے ایک ہم سبق انگریز دوست کے ہمراہ اس کے وطن چلا گیا۔ اس کا گھر سکاٹ لینڈ کے ایک دور افتادہ قصبے میں تھا۔ مجھے وہاں گئے چند روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا ایک مشنری، جو ہندوستان سے آئے ہیں، آج شام قصبے کے اسکول میں لیکچر دیں گے اور بتائیں گے کہ ہندوستان میں مسیحیت کو کس قدر فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ میں اور میرے میزبان دونوں لیکچر سننے کے لئے پہنچے۔ سامعین میں عورتیں اور مرد کافی تعداد میں تھے۔ مشنری نے بتایا کہ ہندوستان میں تیس کروڑ انسان آباد ہیں، لیکن ان لوگوں کو انسان کہنا جائز نہیں۔ عادات و خصائل اور بود و باش کے اعتبار سے یہ لوگ انسانوں سے بہت پست اور حیوانوں سے کچھ اوپر ہیں۔ ہم نے سالہاسال کی جہد و جہد سے ان حیوان نما انسانوں کو تھوڑی بہت تہذیب

سے آشنا کیا ہے۔ لیکن کام وسیع اور اہم ہے۔ آپ ہمارے مشن کو دل کھول کر چندہ دیجئے تا کہ اس عظیم الشان مہم میں، جو ہم نے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جاری کر رکھی ہے، زیادہ کامیابی ہو۔ یہ کہہ کر مشنری نے میجک لینزن سے سامنے لٹکے ہوئے پردے پر ہندوستانیوں کی تصویریں دکھانا شروع کیں۔ اُن میں بھیل، گونڈ، دراوڑ اور اڑیسہ کے جنگلوں میں بسنے والی قوم کے نیم برہنہ افراد کی نہایت مکروہ تصاویر تھیں۔

جب لیکچر ختم ہو گیا تو میں نے کھڑے ہو کر صدر جلسہ سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی تو میں نے بڑے جوش سے پچیس منٹ تقریر کی۔ میں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں خالص ہندوستانی ہوں۔ میرا خمیر اسی ملک کی سرزمین سے اٹھا ہے۔ آپ لوگوں کی زبان میں اسی روانی سے تقریر کر رہا ہوں جس روانی سے مشنری صاحب نے بزعم خود حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ میں نے ہندوستان میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ اب مزید تعلیم کے لئے کیمبرج میں آیا ہوں۔ آپ میری شکل و صورت دیکھ کر اور میری باتیں سن کر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشنری صاحب نے ہندوستان کے باشندوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مشرقی دنیا کا ایک متمدن و مہذب ملک ہے، جس نے صدیوں تک تہذیب اور علم کی شمع بلند رکھی ہے۔ اگرچہ ہم سیاسی طور پر انگلستان کے غلام ہو گئے ہیں، لیکن ہمارا اپنا ادب ہے، اپنا تمدن ہے، اپنی قومی روایات ہیں، جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں۔ مشنری صاحب نے محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کر کے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لے ہندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی ہے۔۔۔

جونہی میری تقریر ختم ہوئی، جلسے کا رنگ بالکل بدل گیا۔ سب لوگ میرے ہم خیال ہو گئے اور مشنری صاحب کو حد درجہ مایوس ہو کر وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔ (۶)

پادری فنڈر اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

مسلمان علماء کرام کو مجبوراً ان سیاسی پادریوں کی حرکات سے پھیلنے والے منفی اثرات کو روکنے کے لیے میدان میں اُترنا پڑا۔ چنانچہ اس میں دو بڑے نام سامنے آئے جنہوں نے آگے چل کر برصغیر پاک و ہند کے مسیحی مسلم مکالمہ کی بنیادیں تیار کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مسلمانوں کی جانب سے نمایاں طور پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور دوسری جانب سے مشہور و معروف پادری فنڈر سامنے آئے۔

پادری فنڈر کا طریقہ تبلیغ انتہائی جارحانہ تھا۔ علمی اختلاف سے قطع نظر جو چیز مسلمانوں کے لیے باعث تکلیف تھی وہ پادری فنڈر کا طرز تحریر اور طرز تقریر تھا۔ چنانچہ مجبوراً پادری فنڈر کے پھیلائے ہوئے منفی اثرات کو ختم کرنے کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اُسے آگرہ میں کھلے مناظرے کا چیلنج دیا جو بعد ازاں تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ ساری صورت حال تفصیل سے اُس دور کی کتب میں آج بھی محفوظ ہے۔

جنگِ عظیم اول و دوئم، تحریک آزادی ہندوستان اور پھر تحریک پاکستان جیسی مصروفیات نے مسلم علماء کی مصروفیات کو مطالعہ اسلام اور مسیحیت کے دائرے سے باہر نکال دیا اور یوں اسلام اور مسیحیت کے میدان میں ۱۸۵۷ء کے علماء کی ہی چھوڑی ہوئی تصانیف ہی معیاری تصور کی جانے لگیں اور بعد میں کی جانے والی ہر تحقیق کی بنیاد کسی نہ کسی طرح پادری فنڈر کا ''میزان الحق'' اور اس کے جواب میں لکھی جانے والی مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی ''اظہار الحق'' پر رکھی جانے لگی۔ آج ہمارا طرز تحریر، دلائل کی نوعیت، موضوعات کا بار بار تکرار واضح کر رہا ہے کہ ہم آج بھی ذہنی سطح پر ۱۸۵۷ء کے دورِ مناظرات سے نہیں نکل سکے۔

ایک قابل غور نقطہ

سوچنے کی بات اب یہ ہے کہ نہ تو ہم پر کوئی ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی حکومت مسلط ہے اور نہ ہی پادری فنڈر ہم میں موجود ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اب ہم ایک آزاد مملکت میں سانس لے رہے ہیں اور اپنی تقدیر و قسمت کے خود مالک ہیں۔ لہٰذا اب وہ کونسی ضرورت ہے جس کے تحت ہم ہر ملنے والے مسیحی بھائی کو پادری فنڈر قرار دے کر خود مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بننے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں؟ (رحمت اللہ کیرانویؒ بہت بڑے عاشق رسول ﷺ اور ولی اللہ تھے۔ محض آپ کی کتاب 'اظہار الحق' کے دلائل رٹ لینے سے کوئی آپ کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا)۔

اب وہ کون سی مجبوری ہے کہ جس کی وجہ سے ہم موجودہ ماحول میں رہنے کی بجائے ۱۸۵۷ء کے مناظراتی ماحول میں رہنے کو ترجیح دے رہے ہیں؟ وہ کون سا منطقی اصول ہے، جس کی وجہ سے ہم پادری فنڈر کو دنیائے مسیحیت کا نمائندہ سمجھنے پر تلے ہوئے ہیں؟ حالانکہ عالم مسیحیت کے اچھے علماء و مبلغین کی تعریف تو خود قرآن کریم کی کئی آیات میں موجود ہے جو اپنے مذہب پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ شعائر اسلام اور بانی اسلام کے ساتھ عقیدت و محبت کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ہمارے پاکستانی معاشرے کے کئی علمی و فکری شعبوں میں زوال کی طرح اسلام اور مسیحیت کا

موضوع بھی اجتہادی تحقیق سے محروم رہا۔ اس میدان میں اب اجتہاد کی جگہ اندھا دھند تقلید نے لے لی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اکثر و بیشتر الا ماشاء اللہ اب مسلمان علماء کی تحقیق غلط فہمیوں کے ازالہ کی بجائے بذاتِ خود غلط فہمیاں پیدا کر رہی ہے۔

مکالمہ کیوں ضروری ہے؟

مکالمہ آج اس لیے ضروری ہے کہ ہم تصورات کی دنیا سے نکل کر علمی حقائق کا سامنا کریں اور اس کی سب سے بہتر صورت براہ راست **مکالمہ** ہی ہے۔ یہ **مکالمہ** کا عمل ہی ہے جو انسان کو غلط فہمیوں سے بچا کر دوسروں کا نقطۂ نظر واضح طور پر سننے اور سمجھنے کے قابل بناتا ہے۔ ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' کے فلسفہ کی بنیاد بھی **مکالمہ** کے عمل پر مبنی ہے۔

''**مکالمۂ محبت**'' ایک ایسا موضوع ہے جس پر بدقسمتی سے زندگی کے عملی تجربات کو سامنے رکھ کر کوئی واضح اور حقیقی طریقۂ کار وضع نہیں کیا گیا۔ موجودہ تنظیموں کا طریقۂ کار مناظراتی ہے مکالماتی نہیں۔ ان طریقوں سے مبلغ کو شہرت ضرور ملتی ہے مگر وہ معاشرے میں کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں پیدا کرسکتا۔ ''**مکالمۂ محبت**'' کی بنیاد زندگی کی تلخ حقیقتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر ہم مناظراتی ماحول کو ختم کر کے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں تو آج پھر عقائد و نظریات کے اختلافات کے باوجود باہمی اتفاق و محبت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

آج ہم صرف ثواب کے حصول کے لیے تبلیغ کرتے ہیں تاکہ اللہ راضی ہو جائے مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ کو راضی کرنے کا طریقہ مناظرے کرنا نہیں بلکہ مذہب، جنس، قومیت سے قطع نظر اللہ کی مخلوق کی بھلائی اور بہتری کے لیے زندگی وقف کر دینا ہے۔

قومیں اگر محض ثواب نیت رکھ کر جنت میں گھر بنانے میں مشغول ہو جائیں، تو پھر ان میں خالد بن ولیدؓ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ اور موسیٰ بن نصیرؒ پیدا نہیں ہوتے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں ایک آدمی حضرت بشر بن حارثؒ کے پاس حاضر ہوا اور حج پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بشر بن حارثؒ نے پوچھا تو نے حج کے اخراجات کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے؟ اس نے کہا، دو ہزار درہم۔ آپ نے پوچھا تو حج سے کیا چاہتا ہے؟ اس نے عرض کیا، اللہ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہے۔ فرمایا، یہی اللہ کی خوشنودی تمہیں گھر بیٹھے بٹھائے بھی مل سکتی ہے۔ جا یہی پیسہ کسی مقروض کے قرض اتارنے میں خرچ کر دے۔ کسی غریب پر خرچ کر کے اس کی مالی حالت کو بہتر بنا دے، کسی عیالدار کو دے کر اس کی پریشانی دور کر دے یا کسی یتیم پر خرچ کر کے جنت میں اپنا ٹھکانہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بنا

لے، کیونکہ ''تیرا کسی مسلمان کے دل میں سرور و خوشی داخل کرنا کسی غم زدہ کی مدد کرنا، کسی تکلیف میں مبتلا آدمی کی تکلیف کو رفع کرنا اور کسی ضعیف و نادار کی اعانت کرنا، فرض حج کے بعد سو نفلی حج سے افضل ہے''(۷)۔

مناظرہ سے مکالمہ اور مکالمہ سے محبت تک

مناظرات ہمیشہ سے اہل اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ رہے ہیں کیونکہ اس سے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہوتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں مناظرات کے فسادات پر مکمل ایک باب بھی تحریر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''واضح ہونا چاہیے کہ جو مناظرہ اس غرض کیلئے ہو کہ خود جیتنا اور دوسرے کو شکست دینا، لوگوں میں اپنے فضل و شرف، خوش تقریری اور فخر کو دکھلا کر اپنی طرف مائل کیا جائے تو ایسا مناظرہ اُن تمام عادتوں کا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اور شیطان کے نزدیک اچھی ہیں اُن کا منبع ہوتا ہے۔ باطن کی برائیوں سے (یعنی کبر، حسد، مرض، شہرت وعہدہ کی محبت وغیرہ کو) اس مناظرے سے وہ نسبت ہے جو ظاہر کی خرابیوں مثلاً زنا، گالی، قتل و چوری وغیرہ کو شراب پینے سے ہے، مثلاً جس طرح کسی شخص کے شراب پینے کو چھوٹی بُرائی سمجھ کر پی جائے اور پھر نشہ کی حالت میں اس سے باقی خرابیاں بھی سرزد ہوں بالکل اسی طرح جس شخص کے دل میں مناظروں کے ذریعے عوام الناس میں ایک فریق کی محبت کم کرنا اور اپنے فتح یاب ہونے سے شہرت اور عہدہ کی طلب حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے تو یہ باتیں اس بات کی علامت ہوتی ہیں کہ ہر طرح کی خباثتیں اس کے دل میں چھپی ہوئی ہیں اور گندی عادتیں اس کی شخصیت میں جمع ہیں''۔(۸)

بائبل مقدس اور قرآن مجید دونوں بے معنیٰ اور فضول مباحثہ و مناظرہ سے اجتناب کے ساتھ ساتھ مکالمہ کی تلقین بھی کرتے ہیں تاکہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے عقائد و نظریات اور احساسات کے احترام کے ساتھ ساتھ تبلیغ دین کا فریضہ بھی ادا ہوتا رہے۔ اس نوعیت کے مکالمہ میں دوسرے فریق کی بھلائی اور محبت کا عنصر غالب رہتا ہے۔

مکالمۂ بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے کہ جس کے لیے جدوجہد کی جائے بلکہ مکالمہ محض ایک ذریعہ ہے ان احساسات و تاثرات کو ابھارنے کا کہ جن کی بنیاد پر (عقائد و نظریات کے اختلاف کے باوجود)

مضبوط رشتوں کی بنیاد رکھی جاسکے تا کہ مل جل کر رہنے، ایک دوسرے کی فلاح و بہبود اور اجتماعی سطح پر معاشرے کی ترقی وخوشحالی کے لیے راہ ہموار کی جاسکے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹے جاسکیں اور پھر اسی عمل سے گزر کر خدا کی قربت ورضا حاصل کی جاسکے۔

خدا کی رفاقت کیسے ملتی ہے؟

قرآن مجید اور بائبل مقدس دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ خدا کی رفاقت اتنی جلدی مسجد اور چرچ میں نہیں ملتی جتنی جلدی کسی کا دکھ درد بانٹنے سے ملتی ہے۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب، فرقے اور قوم کے ساتھ ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

﴿وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ رَسُولُ اللّٰه ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ : یَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ ۔ قَالَ یَا رَبِّ! کَیْفَ اَعُوْدُكَ وَ اَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ؟ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِیْ فُلاَنًامَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ؟ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْعُدْتَّهٗ لَوَجَدْتَّنِیْ عِنْدَهٗ ۔ یَاابْنَ اٰدَمَ اِسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ ۔ قَالَ یَارَبِّ کَیْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهٗ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِیْ فُلاَنٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ؟ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْاَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ؟ یَاابْنَ اٰدَمَ اسْتَسْقَیْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ ۔ قَالَ یَارَبِّ کَیْفَ اَسْقِیْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ؟ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِیْ فُلاَنٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ؟ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْسَقَیْتَهٗ وَجَدْتَّ ذَالِكَ عِنْدِیْ؟﴾

''خداوند تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی۔ وہ جواب میں کہے گا اے میرے پروردگار! میں کس طرح تیری عیادت کیا کرتا تو خود سبھی جہانوں کا اپالنے والا ہے۔ خداوند تعالیٰ کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی۔ اگر اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس ہی پاتا۔ پھر خداوند تعالیٰ پوچھے گا، آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ جواب میں کہے گا اے پروردگار! میں تجھے کیا کھلا سکتا تھا؟ تُو تو سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ خدا تعالیٰ کہے گا تجھے یاد نہیں میرا فلاں بندہ تجھ سے کھانا مانگنے آیا تھا۔ تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو اسے کھانا کھلا دیتا تو تو اس کا ثواب میرے پاس پاتا۔ پھر خدا تعالیٰ پوچھے گا۔ آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تُو نے مجھ کو پانی نہ

پلایا۔ وہ عرض کرے گا، پروردگار! میں تجھے کیا پانی پلا سکتا تھا تو تو سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ خداوند تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے اسے پانی نہ پلایا۔ تجھے معلوم نہیں اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو تو اس کا ثواب میرے پاس پاتا''۔(۹)

حضور یسوع مسیح علیہ السلام نے بھی اسی تصور کی تائید فرمائی، آپ فرماتے ہیں:

﴿جب ابن آدم اپنے جلال میں آئے گا اور سب فرشتے اُس کے ساتھ آئیں گے تب وہ اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا۔ اور سب قومیں اُس کے سامنے جمع کی جائیں گی اور وہ ایک کو دوسرے سے جدا کرے گا جیسے چرواہا بھیڑوں کو بکریوں سے جدا کرتا ہے۔ اور بھیڑوں کو اپنے داہنے اور بکریوں کو بائیں کھڑا کرے گا۔ اُس وقت بادشاہ اپنے دہنی طرف والوں کو کہے گا آؤ میرے باپ کے مبارک لوگوں جو بادشاہی بنائی عالم سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے اُسے میراث میں لو۔ کیونکہ میں بھوکا تھا۔ تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا۔ تم نے مجھے پانی پلایا۔ میں پردیسی تھا۔ تم نے مجھے اپنے گھر میں اُتارا۔ ننگا تھا۔ تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا۔ تم نے میری خبر لی۔ قید میں تھا۔ تم میرے آئے۔ تب راستباز جواب میں اُسے کہیں گے اے خداوند! ہم نے کب تجھے بھوکا دیکھ کہ کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا۔ ہم نے کب تجھے پردیسی دیکھ کر گھر میں اُتارا؟ یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟۔ ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تیرے پاس آئے؟

بادشاہ جواب میں ان سے کہے گا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک کیا تو میرے ہی ساتھ کیا۔ پھر وہ بائیں طرف والوں سے کہے گا اے ملعونو میرے سامنے سے اُس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اُس کے فرشتوں کے لئے کی گئی ہے۔ کیونکہ میں بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔ پیاسا تھا، تم نے مجھے پانی نہ پلایا۔ پردیسی تھا، تم نے مجھے گھر میں نہ اُتارا۔ ننگا تھا، تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ بیمار اور قید میں تھا۔ تم نے میری خبر نہ لی۔ تب وہ بھی جواب میں کہیں گے اے خداوند! ہم نے کب تجھے بھوکا یا پیاسا یا پردیسی یا ننگا یا بیمار یا قید میں دیکھ کر تیری خدمت نہ کی؟ اُس وقت وہ اُن سے جواب میں کہے گا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے ان سب سے چھوٹوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا تو میرے ساتھ نہ کیا۔ اور نہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے مگر راستباز ہمیشہ کی زندگی﴾ متی ۲۵:۳۱ تا ۴۶

ابدی نجات اور عشقِ حقیقی کا باہمی تعلق

حضور یسوع المسیح علیہ السلام جب یریحو کے علاقے میں داخل ہو کر جا رہے تھے تو زکائی نام کا ایک دولت مند شخص اور محصول لینے والوں کا سردار اس کوشش میں تھا کہ ایک نظر اپنے محبوب یسوع علیہ السلام کو دیکھ سکے مگر بھیڑ زیادہ ہونے اور اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے اسے دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ محبت اور شوق نے ایک ترکیب سُجائی کہ دوڑ کر ایک درخت پر چڑھ گیا کہ اسی راستے سے اس کے محبوب نے گزرنا تھا۔ حضور یسوع مسیح علیہ السلام کسی کے دل میں اپنے لیے چھپی ہوئی محبت سے غافل نہیں تھے۔ اگر وہ گھر میں چھپی ہوئی چیز جانتے تھے ﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ -آل عمران ۴۹:۳﴾ تو کسی کی قلبی محبت سے کس طرح غافل رہتے۔ یسوع علیہ السلام بھیڑ کے ہمراہ چلتے چلتے جب اس درخت کے پاس پہنچے تو اوپر نگاہ کر کے پیار بھرے لہجے میں فرمایا "اے زکائی! جلد اتر کیونکہ آج مجھے تیرے گھر رہنا ضرور ہے"۔ زکائی کی خوشی کی انتہا نہ رہی، آج اگر اسے مسیح علیہ السلام کی میزبانی کے بدلے جنت بھی مل جاتی تو اسے ٹھکرانے میں وہ ایک لحہ بھی نہ سوچتا۔

کہتے ہیں جہاں محبت ہو وہاں حسد بھی ہوتا ہے۔ جب لوگوں نے زکائی کے ہدیہ محبت کو مسیح علیہ السلام کی بارگاہ میں قبولیت کا شرف پاتے ہوئے دیکھا تو حسبِ روایت حسد کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر حسد نے محبت کو "گناہ گار" کے لقب سے نوازا۔ زکائی گناہ گاری و پرہیزگاری کے عنوانات سے لاتعلق مسیح علیہ السلام کے گھر آنے پر اس قدر خوش تھا کہ اس نے سرِعام یہ اعلانِ محبت کیا کہ "اے خداوند دیکھ میں اپنا آدھا مال غریبوں کو دیتا ہوں اور اگر کسی کا کچھ ناحق لے لیا ہے تو اس کا چوگنا ادا کرتا ہوں"۔ محبوب نے محبت کی جب یہ بات سنی تو فرمایا "کہ آج اس گھر میں نجات آئی ہے اس لیے کہ یہ بھی ابراہیم کا بیٹا ہے۔ کیونکہ ابنِ آدم کھوئے ہوئے کو ڈھونڈنے اور نجات دینے آیا ہے"۔ (انجیل لوقا ۱۹: ۱-۱۰)

یہ زکائی نہ تو کوئی پادری، بشپ، پوپ اور نہ ہی کوئی علامہ، حضرت، اور شیخ تھا مگر پھر بھی نجات اس کے گھر میں چل کر آئی تھی۔ آج ایک عام گنہگار انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا قرار پایا تھا۔ ابدی نجات محبت و عشق کے جذبے کی متلاشی ہوتی ہے۔ مگر دنیاداروں نے اپنی سنت پر عمل کرتے ہوئے اسے "گناہ گار" قرار دے دیا تھا۔ آج ہم کروسیڈ اور جہاد کے نام پر معصوم لوگوں کا قتلِ عام کرتے ہوئے اللہ کی محبت اور تصورِ نجات کی بات کرتے ہیں۔ مگر انجیل لوقا کے اس واقعہ نے یہ بات ثابت کر دی کہ مذہب کے نام پر قتل و غارت اور دہشت گردی کا تصورِ نجات سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کوئی گناہ گار دل میں اللہ اور اس کے محبوب کی محبت رکھتا ہے اور خدمتِ خلق میں مصروف ہے تو یہی عمل اس کی نجات کے لیے کافی ہے۔

خدمتِ خلق بھی تب ہوتی ہے جب دل میں اللہ اور اس کے محبوب کی محبت ہو اسی محبت رسول ہی کے باعث تو زکائی کے گھر میں یسوع علیہ السلام تشریف لائے۔ گھر میں یسوع تشریف لائیں اور میزبانی کا شرف گناہ گاروں کو حاصل ہو تو اور بھلا گناہ گاروں کو کیا چاہیے۔ محبت ایک مخفی حقیقت ہوتی ہے۔ اور خدمتِ خلق اس کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ بغیر محبت خدمتِ خلق تو مسیح علیہ السلام کے نزدیک محض ریاکاری ہے۔

خدا کن لوگوں سے محبت رکھتا ہے؟

یہی اللہ کی محبت اور خدمتِ خلق ہی تھی جس کے باعث ایک دنیاوی بادشاہ ولایت کے ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہوا۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ (ولادت ۱۷۹ھ) ایک بہت بڑے ولی اللہ ہو گزرے ہیں۔ آپ بلخ کے بڑی شان و شوکت والے بادشاہ تھے۔ تلاشِ حق میں آپ نے تخت و تاج کو خدا حافظ کہا۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ گروہِ فقراء کے تمام علوم کی کنجی حضرت ابراہیم ادھمؒ ہیں۔ آپ سے ایک واقعہ منسوب ہے کہ آپ ایک رات گہری اور پرسکون نیند سے بیدار ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ چاند کی روشنی سے آپ کا کمرہ بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک سونے کی کتاب ہے۔ اور آپ اس پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ان لوگوں کے نام لکھ رہا ہوں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا میرا نام ان لوگوں میں شامل ہے؟ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا میں اللہ کے دوستوں (دوسرے انسانوں) سے تو محبت کرتا ہوں۔ دوسری رات حضرت جبرائیل علیہ السلام دوبارہ آئے اور حضرت ابراہیم ادھمؒ کو ان لوگوں کے اسماء دکھائے جن سے خدا محبت کرتا ہے اور ان ناموں میں حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کا نام سرِفہرست تھا۔ (۱۰)

دوسروں کا دکھ درد بانٹنے کا عمل کس قدر اہمیت رکھتا ہے اس کا اندازہ ہم غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اس قول سے لگا سکتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے مراقبہ میں جا کر انسانی اعمال کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ:

﴿فتشت الاعمال كلها فما وجدت فيها افضل من اطعام الطعام ، اودلو كانت الدنيا بيدى فاطعمها الجياع﴾

میں نے تمام اعمال کا جائزہ لیا تو ان میں (مخلوقِ خدا کو) کھانا کھلانے سے بڑھ کر کوئی زیادہ فضیلت والا عمل نہ پایا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر ساری دنیا بھی میرے ہاتھ میں ہوتی تو اسے

بھوکوں کے کھانے میں صرف کر دیتا (۱۱)۔

ارشادِ نبی کریم ﷺ اور مسیح علیہ السلام سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ دردمندوں اور غم زدہ لوگوں کی مدد کرنا بڑے بڑے نیکی اور عبادت کے کاموں سے بھی افضل ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھتے ہیں کہ بعض لوگ بڑی بڑی مساجد بناتے ہیں، ان کی زیب و زینت اور نقش و نگار پر بڑا پیسہ خرچ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت بڑی نیکی کر لی، ہم نے جنت میں مکان بنالیا۔ ادھر یہ حال ہوتا ہے کہ ان کے پڑوس میں ان کے محلے اور شہر میں ہزاروں لوگ روٹی کو ترس رہے ہوتے ہیں، ہزاروں بیمار ہسپتالوں میں مناسب علاج نہ کرا سکنے کی وجہ سے کراہ رہے ہوتے ہیں۔ بے شمار لوگ ننگے بھوکے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ متعدد لوگ افلاس اور تنگدستی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان گنت لوگ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر مصائب و آلام اور طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان تمام ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کو چھوڑ کر مساجد کی تعمیر و تزئین پر پیسہ خرچ کرنا کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہاں جب ان لوگوں کی ضروریات پوری ہو جائیں، سب خوشحال ہو جائیں، سب کے مسائل حل ہو جائیں، سب کی پریشانیاں دور ہو جائیں تو اس کے بعد مساجد و مدارس کی تعمیر پر خرچ کرنا صدقہ جاریہ اور بہت بڑا کار خیر ہوگا۔ امام غزالیؒ کے الفاظ ہیں:

﴿صرف المال الیهم اهم و افضل و اولی من الصرف الی بناء المساجد و زینته﴾ فقراء و مساکین پر پیسہ خرچ کرنا مساجد کی تعمیر اور تزئین پر خرچ کرنے سے زیادہ ضروری افضل اور اولی ہے۔ (۱۲)

بعض دولت مندوں کے متعلق حضرت امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ انہیں حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہے۔ وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا چھوڑ دیتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحیح فرمایا کہ ''آخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہوگی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہوگا۔ روپیہ کی ان کے پاس کمی نہیں ہوگی۔ وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے۔ وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں مصیبت میں گرفتار ہوگا۔ اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غم خواری نہ کریں گے۔ (۱۳)

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اپنی مثنوی میں چلے اور مراقبہ کرنے کی بجائے قبولیت دعا کا ایک آسان نسخہ بیان فرماتے ہیں:

اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: اے! موسیٰ دعا مانگتے وقت اس منہ سے مانگ جس سے تو نے گناہ نہ کیا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا الٰہی میرا منہ تو ایسا نہیں ہے۔ تو پھر اللہ نے فرمایا پھر دوسرے کے منہ سے مانگ کیونکہ دوسروں کے منہ سے تو نے کوئی گناہ نہیں کیا یعنی دوسروں کی خدمت کرتا کہ دوسرے تیرے لیے دُعا کریں۔ (۱۴)

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ سرسید احمد خان، اسباب بغاوت ہند ص ۴۱، مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۲۔ ایضاً ص ۴۲

۳۔ ص ۴۲-۴۴

۴۔ ایضاً ص ۴۶

۵۔ شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص ۱۵۶-۱۵۷

۶۔ غلام دستگیر رشید، آثارِ اقبال، ص ۳۹-۴۱، بحوالہ محمد عبداللہ قریشی، حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں، ص ۲۲۸-۲۳۰، مطبوعہ بزمِ اقبال-کلب روڈ لاہور

۷۔ امام غزالی، احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۵۰۶

۸۔ ایضاً، باب العلم ص ۱۰۲

۹۔ ولی الدین محمد عبداللہ، مشکوۃ المصابیح، کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض وثواب المرض، حدیث ۱۴۴۲

۱۰۔ تذکرۃ الاولیاء، حضرت شیخ فریدالدین عطار

۱۱۔ شذرات لذھب فی اخبار من ذھب

۱۲۔ احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۵۰۵

۱۳۔ ایضاً، ج ۳، ص ۵۰۶

۱۴۔ مثنوی جلال الدین رومی، ص ۴، مترجم محمد عالم امیری

﴿باب ۲﴾

مکالمۂ محبت کی راہ میں رکاوٹیں اور ہماری موجودہ معاشرتی صورتِ حال

☆

اگر انسان اپنے مذہب پر سچا ہو تو دوسرے مذہب کے سچے دل والے کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے، وہ اس پر ظلم کرنا پسند نہیں کرے گا، اس کو اس کے اعتقاد پر مجبور سمجھے گا۔ اگر تو کسی سچے دین دار پر ظلم کرتا ہے تو معلوم ہوا کہ تو خود اپنے دین کا پکا نہیں ہے۔ چونکہ تیری اپنی فطرت گندی ہے اس لیے دوسرے کو بھی گندی فطرت والا سمجھتا ہے۔

اے ابدی لعنت کے مردود! اپنے بنائے ہوئے ٹیڑھے آئینے سے سب کو نہ دیکھ۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ

﴿مثنوی، دفترِ ششم﴾

مکالمہ خواہ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہو یا آپس کے مسلکی مکاتب فکر کے درمیان، جب تک ہم اس مکالمہ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا خلوص دل اور مثبت طرز فکر سے جائزہ نہیں لیں گے مکالمہ کی حیثیت ایک سیاسی ہتھیار سے زیادہ نہیں رہے گی۔ آیئے ان چند ایک وجوہات کا جائزہ لیں کہ جن کے باعث آج ہم پوری دنیا میں ذلت ورسوائی کی علامت بن چکے ہیں۔

یہ باب پوری کتاب میں سب سے زیادہ حساس گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں ہم یہاں ایک وضاحت کرتے چلیں۔ ہمارے نزدیک وہ تمام مذہبی جماعتیں اور افراد جو نیک نیتی اور خلوص دل سے اسلام اور پاکستان کی خدمت کر رہے ہیں، ہمارے ملک اور معاشرے کے لئے باعث افتخار ہیں۔ ہم اللہ کی بارگاہ میں دُعا گو ہیں کہ اللہ پاک اُنہیں اُن کے نیک مقاصد میں کامیاب فرمائے۔ اس ملک اور معاشرے میں اللہ کے نیک بندے اور اچھی جماعتیں موجود ہیں تو اسلام پاکستان میں زندہ ہے اور انشاءاللہ زندہ رہے گا۔

مگر بعض اوقات اچھی جماعت میں بُرے افراد کی شمولیت نہ صرف کسی دینی جماعت کے image کو خراب کرتی ہے بلکہ کارکنوں میں بھی Frustation پیدا کرتی ہے۔ پاکستان کی دینی و سیاسی جماعتوں کا ہمارا یہ تجزیہ مشاہداتی اور تجرباتی ہے، اس سے اختلاف ممکن ہے اور یہ اختلاف نقطہ نظر کا ہی ہوسکتا ہے۔ ہم نے اپنی گفتگو کی بنیاد اپنے ذاتی قرآن وسنت کے فہم پر ہی رکھی ہے۔ قرآن وسنت پر ہم سے بہتر نظر رکھنے والے اہل علم ہم سے اختلافِ رائے کا حق رکھتے ہیں۔

شخصیت پرستی ہے، فکر پرستی نہیں

کیا شخصیت پرستی کوئی بری چیز ہے؟ اس کا جواب تو منحصر ہے کہ ہم کس شخصیت کی بات کر رہے ہیں۔

یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین کی خدمت کی توفیق حاصل ہو جائے تو اس کی شخصیت اور کردار سے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا پیار ومحبت اور عقیدت واحترام شخصیت پرستی کے زُمرے میں نہیں آتا۔ بلکہ ایسے انسان سے عقیدت ومحبت درحقیقت اللہ اور اس کے نبی ﷺ سے ہی محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ انہی کے پیغام ہی کی برکت تھی کہ جس نے ایک عاجز انسان کو اس قابل بنا ڈالا کہ دنیا کے لاکھوں لوگ اس سے محبت وعقیدت کا دم بھرتے ہیں۔ یہ سُنّت نبوی ﷺ پر عمل کی برکت ہوتی ہے کہ لوگ اسے قابل احترام ومحبت سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ محبت

ہرگز شخصیت پرستی نہیں ہوتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو (خدائے) رحمٰن
ان کے لیے (لوگوں کے) دلوں میں محبت پیدا فرمادے گا۔ سورہ مریم ۹۶:۱۹

حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

پس مطلب آیت کا یہ ہوا کہ نیک عمل کرنے والے ایمان داروں سے خدا تعالیٰ خود محبت کرتا ہے۔ اور زمین پر بھی ان کی محبت اور مقبولیت اتاری جاتی ہے۔ مومن ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ذکرِ خیر ہوتا ہے۔ اور ان کی موت کے بعد بھی ان کی بہترین شہرت باقی رہتی ہے۔ ہرم بن حیان کہتے ہیں کہ جو بندہ سچے اور مخلص دل سے اللہ کی طرف جھکتا ہے اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں کو اس کی طرف جھکا دیتا ہے۔ وہ اس سے محبت اور پیار کرنے لگتے ہیں۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کا فرمان ہے بندہ جو بھلائی برائی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اسی کی چادر اڑھا دیتا ہے۔ (۱)

ایک حدیث قدسی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿حَدَّثَنَا عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَالَ: مَنْ عَادٰی لِوَلِيِّیْ وَلِيًّا، فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ، كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ يَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِیْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِیْ يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِیْ يَمْشِیْ بِهَا، وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِيَنَّهٗ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِيْذَنَّهٗ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ عَبْدِی الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ، وَاَنَا اَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ جل جلالہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو میرے کسی ولی سے دشمنی رکھتا ہے میں اس کے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہوں، اور میرا کوئی بندہ میرا قرب اس چیز کی نسبت حاصل نہیں کرسکتا جو میں نے اس پر فرض کیا ہے، اور میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں

اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں، پھر جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ذریعہ وہ دیکھتا ہے اور اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتے تو میں ضرور بالضرور اس کو عطا کرتا ہوں اور اگر وہ میرے ذریعہ کسی چیز سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں اور میں جو کرنا چاہتا ہوں اس میں سے کسی کام کے کرنے میں مجھے تردد نہیں ہوتا جتنا تردد مجھے اپنے مومن بندے کی جان کے بارے میں ہوتا ہے، وہ تو موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کو تکلیف دینا ناپسند کرتا ہوں۔ (۲)

جب یہ شخص قربت الٰہی کے اس مقام پر پہنچتا ہے تو پھر ایک اور حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿حَدَّثَنَا عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ (اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيَقُوْلُ: اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ، قَالَ فَيُحِبُّهٗ جِبْرِيْلُ، ثُمَّ يُنَادِیْ فِی السَّمَاءِ فَيَقُوْلُ: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ، فَيُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَاءِ، قَالَ: ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ، وَاِذَا اَبْغَضَ اللّٰهُ عَبْدًا، دَعَا جِبْرِيْلَ، فَيَقُوْلُ: اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْهُ، فَيُبْغِضُهٗ جِبْرِيْلُ ثُمَّ يُنَادِیْ فِیْ اَهْلِ السَّمَاءِ: اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ فُلَانًا، فَاَبْغِضُوْهُ، قَالَ: فَيُبْغِضُوْنَهٗ، ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَاءُ فِی الْاَرْضِ﴾

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو جبرئیل کو بلاتے ہیں اور کہتے ہیں: ''میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر'' فرمایا: جبرئیل اس سے محبت کرتا ہے اور پھر آسمان والوں میں آواز لگاتے ہوئے کہتا ہے: ''فلاں شخص سے اللہ محبت کرتے ہیں لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ فرمایا: پھر اس کے لیے زمین میں بھی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے، اور جب اللہ کسی سے بغض رکھتے ہیں تو جبرئیل کو بلا کر کہتے ہیں کہ میں فلاں کو مبغوض رکھتا ہوں تم بھی اس کو مبغوض رکھو، چنانچہ حضرت جبرئیلؑ اس سے بغض کرنے لگتے ہیں پھر وہ آسمان والوں میں آواز لگاتے ہیں: ''اللہ جل جلالہ فلاں

شخص کو مبغوض رکھتے ہیں تو بھی اس کو مبغوض رکھو فرمایا وہ فرشتے اس شخص سے بغض رکھنے لگتے ہیں، چنانچہ زمین میں اس کی طرف سے بغض رکھ دیا جاتا ہے۔ (۳)

جو شخص اللہ ہی کی دی ہوئی توفیق سے عبادت اور ریاضت و مجاہدے کے رستے قربِ الٰہی حاصل کر لے اور اللہ سب کے دلوں میں ایسے شخص کے لیے محبت رکھ دے کہ جو نہ تو نبی ہے اور نہ ہی رسول، بلکہ حضور ﷺ کی امت کا ایک فرد ہے۔ ایسے شخص سے محبت کو شخصیت پرستی کا عنوان دے کر محبت کے پاکیزہ جذبے کو بدنام کرنا اور قابلِ نفرت ٹھہرانا کسی طرح بھی درست نہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک تو یہ سوچ بذاتِ خود قابلِ نفرت ہے کہ جس کی نہ تو کوئی عقلی اور نہ ہی کوئی شرعی بنیاد ہے۔

اسی تصور کو مسیحی نقطہ نظر کے حوالے سے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ پولس رسول ایک مقام پر لکھتے ہیں:

﴿ہم اس وقت تک بھوکے پیاسے ننگے ہیں او مکے کھاتے اور آوارہ پھرتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں سے کام کر کے مشقت اٹھاتے ہیں۔ لوگ برا کہتے ہیں ہم دعا دیتے ہیں۔ وہ ستاتے ہیں ہم سہتے ہیں۔ وہ بدنام کرتے ہیں ہم منت سماجت کرتے ہیں۔ ہم آج تک دنیا کے کوڑے اور سب چیزوں کی جھڑن کی مانند رہے۔﴾ ا۔کرنتھیوں ۴: ۱۱-۱۳

معاشرے کے یہ دھتکارے ہوئے لوگ آج اگر پوری دنیائے مسیحیت کی عقیدت و محبت کا مرکز ہیں تو اپنی کسی ذاتی خوبی کی بنا پر نہیں بلکہ انہوں نے دنیا جہان کی لعنت و ملامت صرف اس لیے برداشت کی کہ وہ حضور یسوع مسیح علیہ السلام سے محبت و عقیدت رکھتے تھے اور انہوں نے یسوع علیہ السلام کے ابدی نجات کے پیغام کی تبلیغ کو اپنی زندگیوں کا مقصد بنالیا تھا۔ ان رسولوں کی ذات سے محبت رکھنے کو شخصیت پرستی کا نام دے کر قابلِ نفرت سمجھ لینا کون سی عقل مندی کا تقاضا ہے؟ اسی طرح ہم ایک اور مقام پر دیکھتے ہیں:

﴿اور دیکھو ایک عورت نے جسے بارہ برس سے خون جاری تھا اس کے پیچھے آ کر اس کی پوشاک کا کنارہ چھوا۔ کیونکہ وہ اپنی جی میں کہتی تھی کہ اگر صرف اس کی پوشاک ہی چھو لوں گی تو اچھی ہو جاؤں گی۔ یسوع نے پھر کر اسے دیکھا اور کہا بیٹی خاطر جمع رکھ۔ تیرے ایمان نے تجھے اچھا کر دیا۔ پس وہ عورت اسی گھڑی اچھی ہو گئی۔﴾ انجیل متی ۹: ۲۰-۲۲

یہ قلبی کیفیت جسے یسوع علیہ السلام نے ایمان کا نام دیا محبت ہی تو تھی۔ یہ اس عورت کا یسوع علیہ السلام کی رحمت اور محبت پر اندھا اعتماد تھا جس نے اس کی ساری زندگی کی بیماری دُور کر دی۔ اللہ کی رحمت سے مستفیض ہونے کے لیے یسوع علیہ السلام سے محبت ہی کافی تھی۔ دعا تو وہ اللہ سے براہ راست پہلے بھی کرتی

ہوگی۔ مگر جو شفا اسے یسوع علیہ السلام سے بلا دلیل محبت رکھنے کے وسیلہ سے ملی وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ اسے یسوع علیہ السلام کے ذریعے صحت یاب فرما کر شخصیت کے ساتھ دینی محبت اور احترام کی اہمیت سمجھا رہے ہیں۔ اس محبت کو جسے یسوع علیہ السلام نے ایمان کا نام دیا شخصیت پرستی کا نام دے کر نفرت کی ٹوکری میں پھینک دینا کون سی عقلمندی ہے؟

قرآن مجید اور بائبل مقدس کے متفقہ فتویٰ کے مطابق اگر نبی کریم ﷺ اور حضور یسوع مسیح علیہ السلام سے محبت نہ ہو تو اسلام اور مسیحیت سے محبت نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ اگر تم مجھ سے محبت رکھنا چاہتے ہو تو میرے محبوب ﷺ کی پیروی کرو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾

(اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف فرما دے گا، اور اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورہ آلِ عمران ۳: ۳۱)

پیروی بغیر عشق و محبت کے نہیں ہوتی۔ یسوع علیہ السلام نے بھی یہی بات فرمائی کہ جو میرے بھیجے ہوئے سے محبت رکھتا ہے وہ در حقیقت مجھ سے ہی محبت رکھتا ہے۔ اور مجھ سے محبت رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ اس نے اللہ سے محبت رکھی۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو میرے بھیجے ہوئے کو قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے۔﴾ انجیل یوحنا، ۱۳: ۲۰

شخصیت پرستی سے کیا مراد ہے؟

آیئے اب سمجھیں کہ شخصیت پرستی سے کیا مراد ہے؟ شخصیت پرستی بنیادی طور پر ایک منفی رویہ ہے جس میں حق و انصاف، عقل و فکر کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر کسی مسلکی و سیاسی لیڈر سے اس قدر محبت اور عقیدت پیدا کی جاتی ہے کہ اس کے قول و عمل کو رفقاء اور پیروکاروں میں نفسیاتی سطح پر سنتِ رسول ﷺ کا درجہ مل جاتا ہے۔ کہنے کو تو بات سنتِ رسول ﷺ اور یسوع علیہ السلام کی پیروی کی ہو رہی ہوتی ہے مگر ہمارے ہاں تو جو کوئی مذہبی و سیاسی رہنما سے علمی یا انتظامی نوعیت کا بھی اختلاف کرنے کی کوشش

کرے تو اسے دین و مذہب اور جماعت و تحریک سے غیر مخلص اور منافق سمجھا جاتا ہے۔ شخصیت پرستی کی ابتدا دینی یا سیاسی رہنماؤں کے قول و فعل میں تضاد سے شروع ہوتی ہے۔ ایسے رہنماؤں کے پیچھے لگ جانا جو خدا اور رسول ﷺ کے مطیع فرمان نہ ہوں اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی قائدین کے اعمال کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ان کی اطاعت کرنے لگنا شخصیت پرستی ہی ہے۔

اس کی مثال ہمیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اس نصیحت میں ملتی ہے کہ آپ سے کسی سائل نے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمایے۔ آپؒ نے فرمایا: ''بیٹے! دو نصیحتیں ہیں۔ زندگی میں نہ کبھی خدا بننے کی کوشش کرنا اور نہ کبھی مصطفیٰ ﷺ بننے کی''۔ وہ بڑی حیرانی سے عرض کرنے لگا، ''حضرت اللہ معاف فرمائے، کوئی مسلمان بھلا ایسا بھی کرسکتا ہے؟ حضرت اس کا کیا مطلب ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''اس کا معنی یہ ہے کہ یہ اللہ ہی کی شان ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کبھی گمان اپنے بارے میں نہ کرنا کہ میں جو چاہوں گا وہ اسی طرح ہو جائے گا۔ کبھی تمہارے چاہنے کے کوئی کام موافق ہوگا اور کبھی خلاف۔ اگر کام تیری منشاء کے خلاف ہو جائے تو غصے اور جلال میں آ جائے کہ ایسا کیوں ہوگیا؟ تو یہ تجھے زیبا نہیں کیونکہ یہ اللہ کی شان ہے کہ اس کی منشاء کے مطابق ہر چیز وقوع پذیر ہوتی ہے۔ تو بندہ ہے اور بندے کا یہ منصب نہیں کہ وہ جو چاہے وہی ہو جائے۔ اس لیے اگر کوئی کام تیری منشاء کے مطابق ہو جائے تو اللہ کا شکر ادا کر۔ اور اگر نہ ہو تو صبر کر کہ یہی مقامِ بندگی ہے۔

رسول بننا یہ ہے کہ چونکہ رسول جو کچھ کہے اس کو نہ ماننے والا کافر ہو جاتا ہے اس لیے اگر تو بھی یہ چاہے کہ تیری ہر بات مانی جائے اور نہ ماننے پر ناراض ہو جائے اور نہ ماننے والے پر برس پڑے تو پھر یہ سمجھ کہ تو اپنے آپ کو منصب رسالت پر بیٹھا رہا ہے۔ یہ حق تو صرف رسول کو حاصل ہوتا ہے کہ جس نے اس کی بات مان لی وہ مومن ہو گیا اور جس نے رد کر دی وہ کافر (۴)۔ یہی رویہ شخصیت پرستی کی وہ شکل ہے جس کی اسلام میں سختی سے ممانعت ہے۔ تاریخ میں بعض مذہبی رہنماؤں کے انہی رویوں کی وجہ سے مذہب بدنام ہوا اور مذہب بےزار رویوں کو فروغ ملا اور تحریکیں ناکام ہوئیں۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق دینی اور سیاسی رہنما خواہ عقیدت و احترام کے کتنے ہی اونچے منصب پر فائز ہو جائیں اختلاف و تنقید سے ماورا نہیں ہوتے۔ غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری صرف اللہ اور رسول ﷺ ہی کی ہے۔ باقی سب سے عقیدت و محبت مشروط ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ سورہ النساء۴: ۵۹

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (اہلِ حق) صاحبانِ امر کی، پھر اگر کسی مسئلہ میں تم باہم اختلاف کرو تو اسے (حتمی فیصلہ کے لیے) اللہ اور رسول (ﷺ) کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، (تو) یہی (تمہارے حق میں) بہتر اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

﴿اُولِي الْاَمْرِ﴾ کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا تمدنی و معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار، غرض جو جس حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحبِ امر ہے وہ اطاعت کا مستحق ہے۔ مگر یہ بات قابلِ غور ہے کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ کا لفظ اللہ اور رسول ﷺ دونوں کے لیے الگ الگ آیا ہے لیکن اُولِي الْاَمْرِ کے لیے اس لفظ کو نہیں دہرایا گیا۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت مستقل اور غیر مشروط ہے لیکن اُولِي الْاَمْرِ کی اطاعت مستقل اور غیر مشروط نہیں بلکہ وہ اس شرط کے ساتھ مشروط کہ ان کے احکام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے تابع ہوں۔ اور ان میں کوئی تضاد اور تخالف نہ ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

﴿عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِالْمَعْصِيَةِ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ﴾

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امیر کی بات سننا اور اطاعت کرنا ضروری ہے جب تک وہ معصیت کا حکم نہ دے اور اگر وہ نافرمانی کا حکم دے تو نہ اس کی بات سنو اور نہ اس امر میں کہا مانو۔ (۵)

رویوں میں اس قدر تنگ دلی اور سنگ دلی موجود ہوتی ہے کہ سیاسی و مذہبی رہنما کے نقطہ نظر سے محض علمی اختلاف بھی ''توہین و گستاخی'' کے زمرے میں آ جاتا ہے۔ جب حق اور Common Sense کی بات سامنے رکھی جائے اور انسان اسے قبول کرنے کے لیے اپنے مسلکی و سیاسی رہنما کی Approval کا سوچنا شروع کر دے تو ایسا انسان واضح طور پر شخصیت پرستی میں مبتلا ہے۔

دینی محبت کے جائز تصور کا سیاسی استعمال

اسلام اور مسیحیت کی بعض جماعتوں نے شخصیات سے دینی محبت کے جائز تصور کا سیاسی استعمال کر کے نااہل قیادت کو معاشرے پر ٹھونسنے کی کوشش کی ہے جس کے باعث انہوں نے معاشرے کو متحدہ کرنے کی بجائے مزید ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ نااہل اور سفارشی منتظمین نے مرکزی قیادت کے علم میں لائے بغیر ان کا نام استعمال کر کے انتظامی ماحول کو خراب کر رکھا ہوتا ہے۔ نتیجتاً لوگ ان خرابیوں کو مرکزی قیادت کی جھولی میں ڈال کر پوری فکر اور تحریک سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ شخصیت پرستی کے زیر اثر قائم شدہ یونیورسٹیوں، مدرسوں، سیمنریوں اور خانقاہوں نے طلبہ کے علمی اختلاف رکھنے کے شرعی حق کو ''گستاخی و بے ادبی'' کا نام دے رکھا ہوتا ہے۔ اور اس کی سزا تعلیمی نتائج میں گڑ بڑ پیدا کر کے دی جاتی ہے۔

شخصیت پرستی کا مرض صرف ہمارے مذہبی طبقے میں ہی نہیں پھیلا ہوا بلکہ یہ تو اب ایک قومی مرض کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ روزنامہ جنگ ۳ مئی ۲۰۰۶ء کے اداریے میں ''شخصیات کی بجائے پالیسیوں کی تشہیر کی ضرورت و اہمیت'' کے عنوان کے تحت اس قومی بیماری پر خوبصورت تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> حکمران شخصیات کی تشہیر برسوں سے میڈیا پالیسی کا محور و مرکز رہا ہے۔ یہ طرز عمل صرف برسر اقتدار جماعت تک ہی محدود نہیں بلکہ اکثر و بیشتر اپوزیشن جماعتیں بھی اسی پالیسی پر گامزن رہتی ہیں۔ حالانکہ صحت مند سیاسی شعور اور فکر و عمل کا تقاضا یہ ہے کہ اس حقیقت کو ایک رہنما اصول کے طور پر اختیار کیا جائے کہ سیاست میں شخصیات آتی جاتی رہتی ہیں، یہ ایک معمول کی بات ہے۔ میڈیا پالیسی میں انہی کو اولین ترجیح اور پروجیکشن کا محور قرار دے دیا جائے تو پھر ایوان اقتدار سے ان شخصیات کے باہر ہونے کی صورت میں میڈیا کی تشہیر بھی زمین بوس ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس حوالے سے وزارت اطلاعات ونشریات کی ذمہ داری یہ ہے کہ پہلے تو وہ مملکت کے مفادات کی تشہیر کرنے، عوام کو درپیش مسائل کو اجاگر کرنے اور ان کے حل کے لیے حکومتی پالیسیوں کی تشہیر کرے، ان پالیسیوں کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے ان کی افادیت واضح کرے۔ ہماری سرکاری میڈیا پالیسی کے حوالے سے یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ عام طور پر صدر، وزیر اعظم، وزیر اطلاعات اور دوسرے چند وفاقی وزراء ہی زیادہ تر اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ پر چھائے رہتے ہیں جس سے شخصیات کی تشہیر اور پروجیکشن کے تأثر کو تقویت ملتی ہے۔ اس تشہیری مہم کی صورت میں ملک اور عوام کو درپیش مسائل اور متعلقہ قواعد و ضوابط سب کچھ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ دوسری طرف اپوزیشن میں بھی ایک دو شخصیات کی ہی تشہیر ہوتی رہتی ہے۔

شخصیت پرستی کی اس ناقابل رشک روایت کی وجہ سے عوام کے بنیادی مسائل میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا اور آج ہر شعبۂ زندگی میں قواعد و ضوابط اور اصول پرستی کی حوصلہ شکنی کا رجحان فروغ پذیر دکھائی دیتا ہے۔

آگے چل کر روزنامہ ''جنگ'' لکھتا ہے:

> ہمارے یہاں نشریاتی ذرائع اور خبروں میں ہمیشہ سیاسی شخصیات ہی کو ان کے عہدوں اور ناموں کو ترجیح دی جاتی ہے کہ صدر نے یہ کہا، وزیر اعظم نے ان خیالات کا اظہار کیا......
> اس سے نہ مسائل صحیح معنوں میں اجاگر ہوتے ہیں اور نہ انہیں قرار واقعی اہمیت ملتی ہے البتہ خبرنامے سیاسی شخصیتوں کے گرد گھومنے سے شخصیت ناموں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

آگے چل مزید لکھتا ہے:

> ہمارے یہاں شخصیات کی تشہیر اور انہیں اجاگر کرنے کا رجحان حکومتی اور عوامی دونوں حلقوں میں پایا جاتا ہے تمام سیاسی جماعتوں میں بھی شخصیات ہی کو مرکز و محور کی حیثیت دے کر ساری توجہ اور اہمیت انہی کی ذات تک محدود و مرکوز کر دی جاتی ہے۔ ایک طرف کسی شخصیت کو ملک کے لیے آخری امید قرار دیا جا رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف کسی شخصیت کو سیکیورٹی رسک بتایا جا رہا ہوتا ہے۔ آج کل بھی اپوزیشن کا زور اس بات پر ہے کہ دو بیرون ملک بیٹھی ہستیوں کے بغیر انتخابات بے معنی ہوں گے یا یہ کہ موجودہ صدر کے ہوتے ہوئے منصفانہ انتخابات نہیں ہو سکتے۔ ہر دو صورتوں میں شخصیات ہی محور و مرکز ہیں حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ حکومت وقت اگر انتخابات جیت سکتی ہے تو اپنی پالیسیوں سے۔ اگر کوئی اپوزیشن جماعت الیکشن جیت سکتی ہے کہ تو اپنے پروگرام سے۔ اس لیے زور اصولوں پالیسیوں اور پروگرام پر ہونا چاہیے۔

اقتدار کی ہوس میں بعض قائدین نے ایک اور قابل ذکر کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ انہوں نے شخصیت پرستی کو فروغ دے کر فکر پرستی کو نایاب شئے بنا دیا ہے۔ فکر پرستی کی طرف کوئی اس لیے راغب نہیں ہوتا کیونکہ یہ اب آسانی سے دستیاب نہیں۔ ان مذہبی جماعتوں کے بانیوں نے اپنی ساکھ بہتر بنانے کی خاطر فکری دائروں میں اتنی لکیریں کھینچ دی ہیں کہ عام آدمی کے لیے حق کی شکل پہنچانا مشکل ہو گئی ہے۔ بزرگانِ دین شروع ہی سے خبردار کرتے چلے آئے ہیں کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب حق اور

باطل کا شعور رکھنے والا عبادت کرنے والے سے بہتر ہوگا۔ شیخ ابو طالب مکیؒ فرماتے ہیں:

> تم پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اس وقت افضل ترین علم خاموشی ہے۔ اور افضل ترین امر نیند ہوگی۔ یعنی منافقین کی کثرت ہوگی اور شبہات کی بہتات ہوگی۔ اس لیے جاہل کے لیے خاموشی ہی علم بن جائے گا اور شہوات نفسانیہ کی کثرت کے باعث نیند عبادت بن جائے گی۔ عالم کا کم ترین حال خاموشی اور نیند ہے اور جاہل کا اعلیٰ ترین حال یہی دو باتیں ہیں۔ (۶)

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں:

> آخری زمانہ میں ایسی قوم بھی آئے گی جس میں ایک عالم کی حیثیت ایک مُردہ گدھے کے برابر ہوگی کہ وہ اس کی طرف التفات ہی نہ کریں گے۔ ان میں ایماندار اس طرح چھپتا پھرے گا جیسے کہ آج کے دور میں منافق چھپتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ رسوا مومن ہی ہوگا۔ (۷)

زندگی کے تحرک وارتقاء میں فکر کی اہمیت

انسانی زندگی کے تحرک وارتقاء میں فکر کی اہمیت شخصیت سے زیادہ ہوتی ہے۔ فکر کی اہمیت کو محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں:

> فکر، زندگی میں انسانی قدموں کی طرح چلتا ہے۔ انسان جس طرح دایاں قدم اٹھاتا ہے پھر یہ قدم جب رکھتا ہے تو بایاں قدم اس سے آگے نکلتا ہے۔ پھر دایاں قدم دوبارہ اٹھتا ہے اور بائیں قدم سے آگے بڑھتا ہے۔ الغرض جس Process کے ساتھ انسان کی یہ رفتار آگے بڑھتی ہے بالکل اسی طرح اہل علم وفکر امت مسلمہ کی زندگی کو تحریک دے کر تغیرات زمانہ کے ساتھ چلنے کے قابل بناتے ہیں۔ ہر صاحب فکر قدم کی طرح قوم کی زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ (۸)

دینی اقدار کا احیاء شخصیت پرستی کے بجائے صرف فکر پرستی سے ہی ممکن ہے۔ محترم ڈاکٹر علی اکبر قادری الازہری لکھتے ہیں کہ مسمار شدہ قدروں کو صرف فکر ہی سے زندہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

> فکر کے جمود سے جب علم غیر موثر ہوجائے تو اس سے جلا پانے والی تہذیب بھی دم توڑنے لگے تو معاشرے میں موجود مذہبی اور اخلاقی قدریں غیر محفوظ ہوجاتی ہیں اور اگر یہ معاشرہ استحصالی سازشوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوجائے اور باطل افکار ونظریات افراد کے قلوب واذہان میں راسخ ہو رہے ہوں تو دینی اقدار خود بخود ختم ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ دینی علوم وفنون اور ان کے اصول ہوں یا سیاسی، معاشرتی اور معاشی علوم ہر ایک کا عمل کسی نہ کسی موڑ پر جاکر رک جاتا ہے۔ یہ علوم محض تصورات کی حد تک اگر زندہ بھی رہیں تو ان کی تاثیر اتنی نہیں رہتی کہ وہ تہذیب اور اقدارِ حیات کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دے سکیں۔ اسی طرح استعماری تہذیب اور باطل افکار کے حملے از اں بعد ان علوم وفنون کے جسم کو بھی بے جان کردیتے ہیں جو جسامت وضخامت اور ظاہری ہیئت کے اعتبار سے اگرچہ اپنی پہلی حالت میں ہی رہیں مگر وہ بے روح جسم کی طرح ہوتے ہیں۔ جب یہ علوم وفنون وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں بلکہ بے اثر اور مردہ ہوجائیں تو ان سے مردہ معاشرے کو کیونکر زندہ کیا جاسکتا ہے اور مٹی ہوئی قدریں ان علوم سے کس طرح بحال ہوسکتی ہیں؟ علم زیادہ سے زیادہ یہی کرسکتا ہے کہ اس سے موجودہ اقدار کی حفاظت اور اخلاقی فضائل کے نکھار کا کام لیا جائے لیکن جو قدریں باطل سازشوں کا شکار ہوکر عملاً معاشرے سے ختم ہوچکی ہوں اور جو فضائل مٹ چکے ہوں انہیں ازسرنو زندہ کرنے کے لیے فکری کاوشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی فکری کاوشیں جو قرآن وحدیث سے ماخوذ فکر پر مبنی انقلاب کا پیش خیمہ ہوں تاکہ معاشرے میں موجود تمام اخلاقی رذائل ختم کرکے اخلاقی فضائل کو پنپنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ جس طرح علم سے مٹی ہوئی قدریں زندہ نہیں ہوسکتیں بلکہ مسمار شدہ قدروں کو فکر سے ہی زندہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح علم زندہ قوموں کے لیے تو کارگر ہے مگر مردہ قوموں کو جگانے کے لیے فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ (۹)

طبیعت فطرتاً آسانی کی طرف لپکتی ہے اور شخصیت پرستی فکر پرستی کی نسبت بہت آسان کام ہے۔ مگر ہمارے معاشرے میں قیادت وسیادت کی ہوس پوری کرنے کے لیے ''فکر پرستی'' ممنوع بلکہ مضر صحت ہے۔

تقلید پرستی ہے، اجتہاد پرستی نہیں

کیا ماضی کے بزرگوں کے علم وفکر اور عملی تجربات سے فائدہ اٹھانا کوئی بری بات ہے؟ ہرگز نہیں۔ تو

پھر تقلید بری کب سے ہوگئی؟ یہ تریاق سے زہر تب بنی جب سے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہمارے مخصوص مسلکی بزرگوں سے زیادہ علم کسی اور کے پاس نہیں آ سکتا اور ان سے زیادہ عقل مند اب قیامت تک کوئی نہیں آئے گا۔ خدا کا فضل صرف ''انہی'' پر ہوا ہے اور اب یہ دروازے دوسروں کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ اب کوئی اس قابل نہیں ہوگا کہ وہ ہمارے بزرگوں کے مقام و مرتبے تک پہنچ سکے۔

بزرگوں کی بات تو بڑی دور تک، آج کل صورت حال تو اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ خانقاہوں، گدی نشینوں، سیاسی و مذہبی جماعتوں کے اکثر قائدین کی نالائق اور بگڑی ہوئی اولادوں کو ''نسبت'' کا فائدہ دے کر انہیں اہل، مخلص، متقی اور پرہیزگار کارکنوں پر مستقبل کی قیادت کے طور پر ٹھونس دیا جاتا ہے۔ انہیں میڈیا کے حربے (Media Tactics) استعمال کر کے قول وفعل میں سب سے بہتر انسان کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

یہ بات بھی حق ہے کہ نسبتوں کا لحاظ رکھے بغیر انسان نہ تو روحانی طور پر ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی معاشرتی سطح پر دنیاداری کے معاملات میں بہتری پیدا کر سکتا ہے۔ مگر جب نسبت کے نام پر قیادت کی کرسی پر بیٹھنے والے اپنے اعمال کے سبب سے قابل احترام نہ ٹھہریں تو خاموشی سے علیحدہ ہو جانا اور اس غلیظ نظام کے خلاف حسب توفیق جہاد کرنا (خواہ وہ قلم سے ہو یا تقریر سے) بھی ایک فرض بن جاتا ہے۔ ہمیں نبی کریم ﷺ کا یہ قول ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ:

﴿وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ﴾

جو عمل میں کوتاہی کرے تو اس کا نسب اس کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ (۱۰)

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں: (۱۱)

گفت حق نے بلکہ لا انساب شد	حق (اللہ) نے فرمایا نہیں بلکہ ''نسبت کچھ نہیں'' طے ہو گیا ہے۔
زهد و تقویٰ فضل را محراب شد	پرہیزگاری اور تقوی بزرگی کا مقام بن گیا ہے
این نہ میراثِ جهانِ فانی ست	یہ فانی دنیا کی وراثت نہیں ہے
کہ بہ انسابش بیابی جانی ست	جسکو تو نسب کی بنیاد پر حاصل کرلے (بلکہ) روحانی وراثت ہے
بلکہ این میراثہای انبیاء ست	بلکہ یہ انبیاء کا ورثہ ہے
وارثِ این جانہای اتقیاء ست	اُس کی وراثت، متقیوں کی جانیں ہیں
پورِ آن بو جهل شد مومن عیان	ابوجہل کا بیٹا علی اعلان مومن بنا
پورِ آن نوح نبی از گمرهان	نوح نبی کا بیٹا گمراہوں میں سے بنا

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو قائد کہلوانے والے اس طرح کے نالائق افراد کے ہاتھوں تحریکیں کامیاب نہیں ہوتیں:

نالائق افراد کے ذریعے دی گئی دعوت کبھی موثر بات نہیں ہوتی۔ بہت سی تنظیموں اور تحریکوں کی دعوت کے بہتر دماغوں تک نہ پہنچنے اور انجام کار ناکام ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ ان کی باگ ڈور جن افراد کے ہاتھوں میں دی گئی وہ صلاحیت واستعداد کے اعتبار سے اس کے اہل نہیں تھے جس وجہ سے لائق و ذہین اور زیرک دماغوں تک ان کی دعوت تک ان کی دعوت نہ پہنچ سکی۔ قدرتی بات ہے کہ ایک نالائق آدمی کی دعوت پر لائق اور اچھا ذہن رکھنے والے لوگ کان نہیں دھریں گے۔ اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے اس سے کمزور تر ذہن رکھنے والے افراد ہی ہوں گے۔ اب یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ایک تو داعی خود کمزور ہو، دوسرے اس کی دعوت مزید کمزور ہو اور نالائق افراد قبول کریں تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ مشن نالائق اور نااہل افراد کے ہاتھوں میں گردش کرتا رہے گا۔ بایں وجہ مستقبل میں بھی اچھے دماغ اس مشن کی طرف راغب نہیں ہوں گے اور یہی عمل بالآخر مشن کی ناکامی کا سبب بنے گا۔ (۱۲)

تاریخ اسلام ختم کرنیکے لیے علاقائی تاریخ کی ایجاد

جب قیادت نالائق ہاتھوں میں آ گئی تو مشترکہ دین، مشترکہ تاریخ اور مشترکہ ثقافت کے ٹکڑے ہونے لگے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی تاریخ کے دو حصے ہو گئے۔ ایک مشترکہ تاریخ جس کا تعلق ماضی سے تھا، دوسرا مختلف تاریخ جو موجودہ حکومتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس علاقائی تاریخ کا وجود پہلی عالمی جنگ کے زمانہ سے شروع ہوا اور دورِ حاضر تک اس میں مزید گہرائی آتی گئی۔ یہاں تک کہ شاید تاریخ اسلام کی کوئی چیز دوبارہ سامنے نہ آئے۔ یہاں تو اب تاریخ مصر ہے، تاریخ لیبیا ہے، تاریخِ شام ہے، تاریخ عراق ہے، تاریخ اردن ہے، تاریخ پاکستان ہے، تاریخ فلسطین ہے، تاریخ قطر ہے، تاریخ کویت ہے، وغیرہ۔ اس علاقائی تاریخ کو تخلیق کرنے والی اسلام دشمن طاقتوں کے زیر اثر علاقائی حکومتیں ہیں۔ اب علاقائی سفارتیں ہیں، علاقائی پاسپورٹ ہیں، علاقائی جغرافیہ ہے، علاقائی جھنڈے ہیں، علاقائی گیت ہیں، علاقائی خاندانی میراث ہے اور علاقائی فتنے اور سازشیں ہیں۔

اسلام میں سجادہ نشینی اور قیادت کا معیار کیا ہے؟

اسلام میں سجادہ نشینی اور قیادت کا معیار اہلیت ہے، وراثت نہیں۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا لا وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا م بَصِيْرًا﴾

بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں انہی لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، بے شک اللہ تمہیں کیا ہی اچھی نصیحت فرماتا ہے، بے شک اللہ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔ (سورہ نساء۴: ۵۸)

حضور نبی کریم ﷺ سے ایک سائل نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا:

﴿قَالَ فَاِذَا ضُيِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ فَقَالَ كَيْفَ اِضَاعَتُهَا قَالَ اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ﴾

آپ ﷺ نے فرمایا 'جس وقت امانت ضائع کر دی جائے تو تو قیامت کا انتظار کرنا۔ اس نے پوچھا کہ امانت کا ضائع کرنا کس طرح ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا 'جب کام نااہل لوگوں کے سپرد کیا جائے تو تو قیامت کا انتظار کرنا۔ (۱۳)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:

قرآن کریم نے لفظ امٰنٰت بصیغۂ جمع لا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بطور امانت رکھا ہو بلکہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔ (۱۴)

پھر فرماتے ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں، ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے

اعتبار سے اس کا اہل نہیں، بلکہ اس پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لیے اپنے دائرہ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کرے۔ (۱۵)

پھر ایک حدیث نبوی ﷺ کا حوالہ دیتے ہیں:

ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی اور تعلق کی مد میں بغیر اہلیت معلوم کیے ہوئے دے دیا اس پر اللہ کی لعنت ہے، نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔ (۱۶)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانہ میں امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشواؤں اور قومی سرداروں کے مرتبے (Positions of Trust) ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل، کم ظرف، بداخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ (۱۷)

پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں:

ادائے امانت سے مراد یہاں صرف یہی نہیں کہ آپ کسی شخص کے پاس کوئی چیز رکھیں اور وہ آپ کو جوں کی توں واپس کر دے۔ بلکہ اس کا مفہوم وسیع تر ہے۔ عبادات بھی امانت ہیں۔ ان کو صحیح وقت پر اخلاص نیت سے، شرائط و قیود کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا اس امر کی تعمیل ہے۔ اگر آپ کو اقتدار وحکومت حاصل ہے تو غریب و امیر، قوی وضعیف میں مساوات قائم کرنا، عدل کے ترازو کو تمام مخالف رجحانات کے باوجود برابر رکھنا، حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لیے کنبہ پروری اور دوست نوازی کے بجائے صرف اہلیت اور قابلیت کو معیار قرار دینا بھی اس حکم کی تعمیل میں داخل ہے۔ (۱۸)

وارث اگر اہلیت، قابلیت اور پرہیزگاری میں واقعتاً بلند ہے تو اسے مستقبل کا قائد چننے میں کوئی

حرج نہیں ہے۔ مگر آج کے دور میں جانشینی کی مسند پر بیٹھنے کے لیے ریاضت، مجاہدہ، کردار کی بلندی اور علمی معراج کو چھونے کی آرزو رکھنے والے چراغ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ اکثریت اپنے بزرگوں کے گزارے ہوئے اچھے دور کی قیمت وصول کرتے کرتے دنیا کی دلدل میں دفن ہو جاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلویؒ فرماتے ہیں:

آج کل بہت لوگ صاحب سجادہ بطور وراثت بنا دیے جاتے ہیں اور وہ بیعت کرنے لگتے ہیں، یہ حرام ہے۔ (۱۹)

حضور یسوع علیہ السلام نے ایسے ہی نام نہاد پیروں فقیروں اور علمائے دین کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

﴿اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دُونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔﴾ انجیل متی ۲۳:۱۵

ایسی ہی تمام نااہل اور نام نہاد عزت مآب ہستیوں خواہ وہ تنظیمی یا روحانی مسند پر جلوہ فروز ہوں، علامہ اقبالؒ کے نزدیک ان کی حیثیت ایک زاغ (کوا) سے زیادہ نہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

رمزو ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو، رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
(بال جبریل)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے حق بات فرمائی:

آج کی بربادی اور تباہی کا سب سے بڑا سبب نااہل اور غلط مقتداؤں اور لیڈروں کے پیچھے چلنا ہے۔ (۲۰)

پھر فرماتے ہیں:

بعض لوگ کسی کے اتباع واقتدا کا معیار لوگوں کی بھیڑ کو بنا لیتے ہیں۔ جس طرف یہ بھیڑ دیکھی اسی طرف چل پڑے۔ یہ بھی ایک نامعقول حرکت ہے، چونکہ اکثریت تو ہمیشہ دنیا

میں بے وقوفوں یا کم عقلوں کی اور عمل کے لحاظ سے بدعملوں کی رہتی ہے، اس لیے لوگوں کی بھیڑ حق اور ناحق یا برے بھلے کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی۔ (۲۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہوا کہ جس شخص کو مقتدا بناؤ تو پہلے یہ دیکھو کہ جس مقصد کے لیے اس کو مقتدا بنایا ہے وہ اس مقصد اور اس کے طریق سے پوری طرح واقف بھی ہے یا نہیں۔ پھر یہ دیکھو کہ وہ اس کی راہ پر چل بھی رہا ہے؟ اور اس کا عمل اپنے علم کے مطابق ہے یا نہیں؟ غرض کسی کو مقتدا بنانے کے لیے علم صحیح اور عمل مستقیم کے معیار سے جانچنا ضروری ہے، محض باپ دادا ہونا یا بہت سے لوگوں کا لیڈر ہونا، یا صاحب مال و دولت ہونا یا صاحب حکومت و سلطنت ہونا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو معیار اقتداء سمجھا جائے۔ (۲۲)

تقلید اور تقلید پرستی میں بنیادی فرق۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ

تقلید تو یہ کہتی ہے کہ موجودہ مسائل کے حل ماضی کے بزرگوں کے علمی وفکری کارناموں اور اجتہادی اصولوں کی روشنی میں دوبارہ قرآن وسنت اور بائبل مقدس سے دریافت کیے جائیں جبکہ ''تقلید پرستی'' ماضی کو حال اور مستقبل پر زبردستی مسلط کرنے کا نام ہے۔

تقلید پیغام محبت ہے، جبکہ تقلید پرستی نفرت وتعصب کی آئینہ دار ہے۔ تقلید ماضی سے اس محبت کا نام ہے جس کی روشنی میں ہم اپنا حال اور مستقبل بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ تقلید پرستی حال اور مستقبل سے مکمل کنارہ کشی کر کے صرف ماضی میں رہنے کو ترجیح دینے کا نام ہے۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق
ان کو آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

آج تقلید پرستی کے مرض میں ہماری صورت حال اس حد تک خراب ہو چکی ہے کہ ہماری تبلیغ دین بھی اپنے مسلکی بزرگوں کی مخصوص کتب پر مبنی ہے۔ دوران گفتگو ہم قرآن و بائبل کے حوالے کم اور اپنے مسلک کے نامی گرامی علماء کے حوالے زیادہ دیتے ہیں۔ اس تقلید پرستی سے سب سے بڑی بیماری یہ پیدا ہوئی کہ آج ہم مکالمۂ محبت کے نام پر مناظراتی وفرقہ وارانہ ماحول پھیلا رہے ہیں۔ بائبل اور قرآنی فکر کو عام کرنے کی بجائے فرقہ وارانہ فکر عام کی جا رہی ہے۔ آج ہم حضرت محمد ﷺ اور مسیح علیہ السلام کے پیغام کو پھیلانے کی بجائے اپنی تنگ نظر اور تعصبات پر مبنی تفسیرات (Interpretations) پھیلا رہے ہیں۔

یہ سب تقلید پرستی کے کمالات ہیں۔ علامہ نے اسی لیے کہا:

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے، نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

آج بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، سینٹ آگسٹائن، سینٹ تھامس، مارٹن لوتھر وغیرہ پیدا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اگر ہم تقلید پرستی کو چھوڑ کر اجتہاد پرستی اپنا لیں۔ تقلید پرستی تو صرف اندھے عقیدت مند پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس تقلید پرستی میں صرف مسلک پرستی ہے جبکہ اجتہاد پرستی میں خدا پرستی بھی ہے اور انسان پرستی بھی۔

جماعت پرستی ہے، خُدا پرستی نہیں

حضور یسوع مسیح علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ تو ہمارے لیے انسان کی بھلائی کا پیغام لے کر آئے تھے مگر آج ہم نے اپنے طرزِ تبلیغ میں انسان کی بھلائی پر خدا کی بھلائی کو زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔

اب تو صورتِ حال مزید خراب ہوگئی ہے۔ اب خُدا کی جگہ مذہبی سیاسی جماعتوں نے لے لی ہے جو شخصیت پرستی کے رجحان کی جدید شکل ہے۔

احیائے اسلام کے لیے مل جُل کر جماعت کی شکل میں کوشش کرنا نہ ہی اسلام میں ممنوع ہے، اور نہ ہی کوئی بری بات۔ ہمارا موقف فقط اتنا ہے کہ رویوں میں جماعتی پہچان کو دینی پہچان پر فوقیت دینا ہی ہمارے معاشرتی مسائل کی جڑ ہے۔

چنانچہ آج بائبل مقدس اور قرآن مجید کو پڑھنے کی بجائے ان جماعتوں کے زیرِ انتظام مدرسوں اور سیمینیریوں (Seminaries) کے ترتیب کردہ نصاب زیادہ پڑھائے جاتے ہیں۔ قرآن اور بائبل کی بات صرف تقریر کو سجانے کی غرض سے کی جاتی ہے۔ اگر یہ جماعت پرستی نہیں صرف انسان کی بھلائی کا کام ہے، تو یہ کیسی بھلائی ہے جس کے فروغ کے لیے مذہبی جماعتوں میں اتحاد ممکن نہیں؟

کیسی عجیب بات ہے کہ خدا کا سارا دھیان انسان کی طرف ہے اور ہمارا سارا دھیان خدا کی طرف۔ خدا نے اپنے تمام انبیاء صرف یہ بتانے کے لئے بھیجے کہ اپنے اردگرد دوسرے انسانوں کا خیال رکھیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى

عِيَالِهٖ﴾ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ (Family) ہے، اس لیے اللہ کے نزدیک تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ آدمی وہ ہے جو اس کے کنبے (مخلوق) کے ساتھ نیکی کرے (۲۳)۔ ایک ہم ہیں کہ اپنی ساری توانائیاں اس بات پر صرف کیے رکھے ہیں کہ خدا کا خیال رکھو، یہ تو ہے ہماری خودساختہ خدا پرستی کا حال۔

قاضی عیاض مالکیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کے دوش پر اپنے لشکر کے ہمراہ جا رہے ہوتے تو ایک بڑھیا اس حالت میں آپ کو روک لیتی تھی، آپ ہوا کو حکم دیتے تو وہ ٹھہر جاتی۔ آپ پہلے اس بڑھیا کی ضرورت پر غور فرماتے، اسے پوری کرتے اور پھر روانہ ہو جاتے (۲۴)۔ انسان کردار میں بڑا ہو تو فضا میں پرواز کرتا ہوا رک کر کسی غریب کی حاجت روائی کے لیے نیچے اُتر آتا ہے۔ مگر چھوٹا انسان چند ٹکوں کی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر کسی کی حاجت روائی کے لیے نیچے اترنا اپنی شان میں گستاخی و بے ادبی تصور کرتا ہے۔ اگر کچھ کہنے کی جسارت کی جائے تو ''ادب واحترام اور موقع و محل'' کے حکیمانہ پہلوؤں پر نصیحتوں سے نوازا جاتا ہے۔

قرآن مجید اور بائبل مقدس کے مطابق تو خدا پرستی یہ ہے کہ نیکی، تقویٰ اور خیرات کے کاموں میں ایک دوسرے کی نہ صرف مدد بلکہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانی چاہیے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ المائدہ: ۲

اور نیکی اور پرہیزگاری (کے کاموں) پر ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔

پولس رسول بھی یہی بات یوں فرماتے ہیں:

﴿۔۔۔ خیرات کے کام میں بھی سبقت لے جاؤ﴾ ۲۔کرنتھیوں ۸:۷

مگر ہماری مذہبی و سیاسی جماعتوں کے قائدین کو نیکی اور خیرات کے کام صرف حصولِ اقتدار کی جدوجہد میں نظر آتے ہیں، اور دوسروں کی پریشانیاں اس وقت حل نہیں کر سکتے جب تک قومی اسمبلی کے ممبر منتخب نہ ہو جائیں۔ یہاں اقتدار کی ہوس میں بڑے بڑے سیاسی اتحاد تو ہو سکتے ہیں مگر ''عَيَالَ اللّٰه'' کے لیے اتحاد جماعتوں کی بقا اور نیک نامی کے لیے خطرناک سمجھے جاتے ہیں۔ ان مذہبی جماعتوں کے قائدین کے احوال پر تبصرہ کرتے ہوئے محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

آج صورت حالات بعینہ یہ ہے کہ ہم اپنی بات ماننے والوں پر خوش ہوتے ہیں لیکن جو ہماری

کسی بات سے اختلاف کرے اسے کافر بنا کر اسلام سے خارج کر دیتے ہیں۔ ہم نے دین میں اپنی اجارہ داریاں بنا رکھی ہیں جس کے پاس تھوڑے اختیارات ہوں وہ دوسروں کو مسلک سے نکال دیتا ہے۔ جو تھوڑا بڑا ہو وہ دوسرے کو دائرہ اسلام ہی سے نکال دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ ہم نے اسلام کو بازیچۂ اطفال بنا کر سکول کے ہیڈ ماسٹر کی طرح داخل خارج کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے امت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے لیکن امت سے نکالنے کا اختیار ہر کس و ناکس کے پاس ہے۔ اسی طرح دین اسلام تو اللہ کا ہے۔ وہ بندوں کے حال کو خود بہتر جانتا ہے لیکن دین کے داخل خارج کے انچارج بھی آج کے علماء دین بن گئے ہیں (الاماشاء اللہ) یہ شرک فی التوحید اور شرک فی الرسالت نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے مذہبی وارث الاماشاء اللہ، ملت کی پاسبانی کی بجائے دین کی مسندوں پر بیٹھتے ہی گویا کافر و مشرک اور ملحد و بے دین کے القابات سے نوازنے کے لیے ہیں۔ دین کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ٹکے ٹکے کے عوض بیچا جاتا ہے۔ شریعت کو اپنی ذاتی استعمال کی چیز سمجھتے ہوئے اپنی پسند و ناپسند کے مطابق گھمایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل اول تو علماء سے مانوس ہی بہت کم ہے اور اگر کوئی نوجوان اصلاحِ احوال کے لیے ان کے قریب چلا بھی جاتا ہے تو بجائے اصلاح احوال کے متنفر ہو کر اٹھتا ہے۔ (۴۵)

پاکستان میں متفقہ دینی وسیاسی قیادت کا بحران

عالم اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص، اکثر و بیشتر دینی و سیاسی جماعتیں مستقل طور پر معاشرہ کی توانائی ضائع کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ ایسے سیاسی عمل کی طرف مائل رہتی ہیں جس میں جاہ طلب لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ وہ اُن میں شامل ہو کر اپنے ذاتی مفادات کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ جاہ طلبی کی نسبت سے ان لوگوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو اقتدار کی خواہش مند ہے۔ یہ لوگ اپنے پیروکاروں میں ہیجان اور انقلابات کے جذبات پیدا کر کے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ جب وہ اپنا مقصد پالیتے ہیں تو اپنے ساتھیوں کو ختم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اپنے معاونین سے سبقت لے کر اول حیثیت پر قابض ہو جاتے ہیں اور پھر اُن کے کاموں پر منصف بن جاتے ہیں۔

ایک دوسری قسم کی نظر وزارت اور دیگر اعلیٰ مناصب پر ہوتی ہے۔ یہ لوگ دو قسم کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک کردار یہ ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کو تقریروں اور بدزبانی کے ذریعے حکومت کے خلاف ابھارتے ہیں اور حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ان کا مقام نظروں میں آ جائے۔ دوسرا کردار یہ کہ وہ خفیہ طور پر حکومت سے اعلیٰ منصب کے حصول کے لیے معاملہ کرتے ہیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں جماعتوں کی صفوں میں خلل ڈالتی رہتی ہیں۔

ان غیر شفاف سرگرمیوں کی وجہ سے جماعت کے مجمع میں متضاد رجحانات پھیل جاتے ہیں۔ بعض افراد انتہا پسندی کو اپنا لیتے ہیں اور بعض اعتدال کو۔ اس صورتحال سے جماعت کے ملغوبا میں دائمی انقلاب جاری رہتے ہیں۔ کچھ لوگ جماعت چھوڑتے ہیں اور کچھ نئے داخل ہوتے ہیں۔ جناب پروفیسر محمد رفیق صاحب، سابقہ امیر تحریک آزاد جموں وکشمیر تحریک منہاج القرآن، ان حالات پر یوں مزید تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں:

> بحیثیت مجموعی پچھلی دو تین صدیوں سے عالم اسلام کو کوئی متفقہ قیادت میسر نہیں جو امت کی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچا سکے۔ ہر ملک میں مذہبی اور دنیاوی راہنماؤں کے الگ الگ طبقات ہیں اور یہ اپنی اپنی مسلکی اور جماعتی وفاداریوں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اتحاد و اتفاق کا کہیں دور دور تک امکان موجود نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی ان قیادتوں کے بتوں کی پوجا کا عمل جاری ہے اپنے سوا ہر ایک کو گمراہ اور ملک دشمن گردانا جاتا ہے۔ قائدین نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے اور اپنے اپنے حلقہ احباب اور حواریوں میں شخصیت پرستی کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے گہرے عقیدت مندوں کو استعمال کر کے حیلے حربوں سے قیادت وسیادت کا سکہ جمائے رکھنا معمول بن چکا ہے۔

آگے لکھتے ہیں۔

> لیکن اکثر و بیشتر مذہبی لیڈروں نے وطیرہ بنا رکھا ہے کہ دوسروں سے تعاون تو مانگتے ہیں خود کسی کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے لہٰذا جواباً دوسرے بھی عدم تعاون کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مظلوموں کی مدد کے لیے رسول اکرم ﷺ نے جوانی میں معاہدہ ''حلف الفضول'' میں شمولیت اختیار کی تھی۔ مدینہ ہجرت کے بعد زمانہ عروج میں بھی آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی مجھے کوئی اس طرح کے معاہدے کی طرف بلائے تو میں تیار ہوں۔ اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں تعاون کرنا تو درکنار ستم بالائے ستم یہ کہ ایک دوسرے کو حریف سمجھنے لگ جاتے ہیں اپنے معمولی کام پر بھی مبالغہ آرائی

سے کام لیا جاتا ہے جبکہ دوسرے بہت بڑا کارنامہ بھی سرانجام دیں تو تعریف کا ایک لفظ ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ اتحاد و اتفاق کی باتیں محض دکھاوا ہوتی ہیں جبکہ اندر سے ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ قول و فعل کے تضاد، منافقت اور اس شان افتراق کے ساتھ اسلامی انقلاب کے نعرے بھی جاری رہتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کے دعویدار قائدین کی شاہانہ طرز زندگی کے متعلق لکھتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کے ان قائدین کے شاہانہ طرز زندگی کو دیکھ کر قیصر و کسریٰ بھی شرما جائیں۔ اس کر و فر اور شان و شوکت سے باہر نکلتے ہیں کہ ہر طرف ہٹو، بچو کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بایں ہمہ غریبوں کی ہمدردی کا دعویٰ بھی ہے۔ جدت پسندی کا رجحان غالب ہوتا جا رہا ہے۔ من مانی کارروائیاں سند جواز حاصل کر لیتی ہیں بظاہر جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے ضابطے کی کارروائی بھی مکمل کر لی جاتی ہے لیکن اپنی روح کے اعتبار سے فیصلے آمرانہ ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف ہتھکنڈے استعمال کر کے اپنی رائے رکھنے والوں اور معاملات کا تنقیدی جائزہ لینے والوں کو بے اثر بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پے در پے غلطیاں تحریک کے تشخص کو مجروح کر دیتی ہیں۔ لیکن غلطی تسلیم کرنے کی بجائے پردہ پوشی سے کام لیا جاتا ہے۔ انا کا مسئلہ بنا کر اپنی غلطی کے حق میں بھی دلائل لائے جاتے ہیں۔

ہمعصروں کو نہ صرف تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ ہمسر کا درجہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ فرض کر لیا جاتا ہے کہ میرے علاوہ امت کی اصلاح کرنے کے قابل اور کوئی ہے ہی نہیں۔ بہت سے محاذ بیک وقت کھل جانے کے باعث کسی ایک میدان میں بھی نمایاں کامیابی کے اثرات نظر نہیں آتے اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھ لینے کا مفروضہ عجلت پسندی کی طرف لے جاتا ہے اور جب مطلوبہ نتائج حسب توقع برآمد نہیں ہوتے تو پھر ہر جائز و ناجائز کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ اپنا بھرم رکھنے کے لیے حصول مقصد کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرتے ہوئے By Hook or Crook کی پالیسی اختیار کر لی جاتی ہے۔ یوں مذہبی اور عام سیاسی راہنماؤں کے طریق کار میں فرق مٹ جانے کے باعث اپنی ساکھ کھو دیتے ہیں۔

مذہبی لیڈروں کے لادینی رویوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

ہمارے دور میں ایک اور المیہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا کی جانب سے بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے

الزامات کا اس شدت کے ساتھ پراپیگنڈا کیا گیا کہ اس سے مذہبی لیڈر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لہٰذا طرز عمل میں ایک نمایاں تبدیلی یہ بھی سامنے آئی کہ وہ عالمی سطح پر اپنے آپ کو قابل قبول بنانے کے لیے ایسے اقدامات کرنے سے گریز کرتے ہیں جن سے وہ اس الزام کی زد میں آ سکیں۔ مذہبی راہنما آپس میں ملنے کے لیے تیار نہیں لیکن لادینوں کو بڑی آسانی سے گلے لگا لیتے ہیں۔ بہت سے مخلص کارکن ایسے ہی غیر صحتمند رویوں سے تنگ آ کر کنارہ کشی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ فہم و بصیرت کی کمی اور بین الاقوامی احوال و ظروف پر گہری نظر نہ ہونے کے باعث ذرائع کو ہی مقاصد بنا کر سفر لمبا کر لیا جاتا ہے اور جب درمیانی ٹارگٹ پورے نہیں ہوتے تو کارکنوں کو چپ کرانے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کی یہی مرضی تھی دیر آید درست آید۔ بس تھوڑا اور انتظار کریں کامیابی ہمارے قدم چومنے والی ہے۔ خوش عقیدہ کارکن خوش فہمیوں کے سہارے رواں دواں رہتے ہیں۔

زور بیان کا جادو مسحور کیے رکھتا ہے۔ قائد کو معصوم عن الخطاء سمجھا جاتا ہے لہٰذا کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کرتا۔ کبھی بھولے سے کوئی کسی غلطی کی جانب توجہ مبذول کروا بیٹھے تو منافقت اور غداری کے الزامات کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے۔ گستاخی اور بے ادبی کا مرتکب قرار دے کر گردن زدنی کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ مشورہ بھی ناگوار گزرتا ہے۔

سب کارکن ایک جیسے نہیں ہوتے جذباتی اور انتہا پسند لوگ یا تو مخالفت پر اتر آتے ہیں یا پھر کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں جبکہ معتدل مزاج افراد اس لیے ساتھ لگے رہتے ہیں کہ انہیں تو کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ اب آئیڈیل حالات تو کہیں ملنے سے رہے۔ کہیں اور جائیں گے تو وہاں بھی ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کچھ اصلاح احوال کے خیال سے ساتھ چپکے رہتے ہیں شاید اللہ تعالیٰ مہربانی کرے اور کوئی بہتری کی صورت نکل آئے لیکن ایسے لوگوں کی کسی سطح پر دال نہیں گلتی بس اندر ہی اندر کڑھ کر رہ جاتے ہیں۔

قائدین کے منظور نظر غیر اخلاقی کارکنان کے متعلق لکھتے ہیں۔

کسی تحریک میں نئے آنے والے اپنا غیر اخلاقی کلچر بھی ساتھ لاتے ہیں۔ قائدین کی دیگر مصروفیات کے باعث ان کی مناسب تربیت نہ ہونے کے باعث یہ دوسرے تحریکی پرزوں کو خراب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن اپنے مخصوص سیاسی و معاشی پس منظر کے باعث قائدین کے منظور نظر ہوتے ہیں اس لیے کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا کوئی لب کشائی کی ہمت کر لے تو الٹا اسی کو تنظیم سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں؟

قائدین نے معاشرے کی نفسیات کا کماحقہ تجزیہ نہ کیا ظاہر ہے وی آئی پی کلچر کے دلدادہ نام نہاد قائدین وڈیروں کے خلاف تقریریں کرتے کرتے خود مذہبی وڈیرے بن جاتے ہیں لہٰذا عوام سے حقیقی رابطہ کٹ جاتا ہے۔ اعتقادی اور فقہی مسائل کی تشریحات میں الجھ کر اپنے آپ کو متنازعہ بنالینا بھی عام روش رہی ہے۔ سیاسی میدان میں بغیر مناسب تیاری کے اتر جانا اور جمی جمائی سیکولر حکومتوں کے ساتھ قبل از وقت تصادم بھی بہت بڑا مسئلہ رہا ہے۔ افسوس بعد میں آنے والوں نے اپنے سابقین کی ناکامیوں سے کوئی سبق نہ سیکھا اور اسی روش پر چل نکلے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

شروع میں لوگ تقویٰ و پرہیزگاری کے باعث کھنچے چلے آتے ہیں۔ جیسے جیسے شہرت ہوتی چلی جاتی ہے انداز بدلتے ہیں اور روایتی ہتھکنڈوں کا استعمال شروع ہو جاتا ہے بعض اوقات نیت نیک ہوتی ہے لیکن معروضی حالات کی وجہ سے عمل میں کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ بعض صورتوں میں فکری انحراف عملی کوتاہی پر منتج ہوتا ہے۔ انفرادی غلطیاں توبہ کرنے سے معاف ہو جاتی ہیں لیکن اجتماعی غلطیوں کے نتائج بد کا خمیازہ ساری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پچھلی صدی میں قوم نے ہمیشہ وفاداری کی جبکہ قائدین نے ہمیشہ مایوس کیا۔ یہ قوم اپنے حقیقی قائد کو ہمیشہ ترستی ہی رہی۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ابھی راہبر کو میں

محترم جناب پروفیسر محمد رفیق صاحب نے اسلامی دنیا میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص ہمارے مذہبی قائدین کی قیادت وسیادت کے شوق کی بیماری کو ان خوبصورت لفظوں میں بیان کیا ہے:

اسلامی انقلاب کے دعویداروں کو تقویٰ کے اونچے معیار کا حامل ہونا بہت ضروری ہے۔ مسلمان آئیڈیل پسند واقع ہوئے ہیں، بہت کم کوئی نگاہوں میں جچتا ہے اور ذرا سی کمزوری بدگمانیاں پیدا کر دیتی ہے۔ جبکہ انقلاب کے اکثر و بیشتر داعیوں کا یہ حال رہا ہے کہ وہ تو معروف و مستند طبقہ علماء سے بھی تعلق نہ رکھتے تھے۔ انقلابی سوچ کے باعث فہیم عناصر کا طبقہ ان کے گرد جمع تو ہوا لیکن جب حقیقت حال کھلی تو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گیا۔ جن پر شروع شروع میں حب الٰہی اور حب رسول ﷺ کا غلبہ رہا وہ اپنے دور عروج کی دیگر مصروفیات

کے باعث معیار قائم نہ رکھ سکے۔ کچھ غفلت اور تن آسانی نے کام خراب کیا اور کچھ مرتبہ اور حیثیت کا خیال آڑے آ گیا۔ مسجد اور عوام سے رابطہ ٹوٹا اور وہ ناقابل رسائی ہوتے چلے گئے۔ قیادت کے مزعومہ مفادات کے سبب قول وفعل کا تضاد نمایاں ہوتا گیا لیکن وہ دلائل کی قوت سے اپنے انحراف کو بھی سند جواز عطا کرتے رہے پروین شاکر نے کہا تھا:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

وقت کے ساتھ خیالات بدلنے کا تو سنا تھا لیکن اب تو معیار بھی بدل جاتے ہیں جو چاہے ان کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

کون جانے کے نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

کسی نے کیا خوب کہا کہ ”بڑے آدمی زندگی میں دیکھنے کو کم اور کتابوں میں زیادہ ملتے ہیں یہی حال تقویٰ کا ہے اب متقی لیڈر کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں“۔(۲۶)

مسیحی لیڈروں کی ناکامی

کم وبیش یہی صورت حال ہمیں مسیحی قائدین اور چرچ میں نظر آتی ہے۔ آر جے میکن برکت اللہ ایم اے اپنی کتاب ”مغلیہ سلطنت اور مسیحیت“ میں فرماتے ہیں:

”یہ ایک حقیقت ہے کہ دور حاضرہ میں تعداد کے لحاظ سے روئے زمین کے تمام ملکوں سے زیادہ ہمارے ملک میں مسیحی فرقے موجود ہیں جنہوں نے ہندوستان کی کلیسیا میں مستقل انتشار قائم کر رکھا ہے اور ملکی کلیسیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں لیکن پھر بھی کلیسیا کے قائد اپنی کھال میں مست ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے“۔(۲۷)

آج کے مسیحی اور مسلم قائدین اپنے معمولی خیراتی کام پر بھی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں اخبارات میں بڑی بڑی سرخیاں چھپتی ہیں اور خصوصی انٹرویوز شائع کروائے جاتے ہیں۔ جبکہ حضور مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا:

پس جب تو خیرات کرے تو اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا جیسا ریاکار عبادتخانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔

بلکہ جب تو خیرات کرے تو جو تیرا دہنا ہاتھ کرتا ہے اُسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے۔ تا کہ تیری خیرات پوشیدہ رہے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دیگا

(متی باب ۶: ۲ تا ۶)

اسلام اور مسیحیت دونوں مذاہب اس ایک نقطہ پر متفق ہیں کہ خدمتِ خلق کے رستہ پر چل کر خدا کی رضا اور قربت کا حصول ہی عظیم کامیابی ہے۔ خدا کی خوشنودی کے بغیر جنت بھی دوزخ کا ہی دوسرا نام ہے۔ ایسے مذہبی مبلغین کی اسلامی اور مسیحی معاشروں میں کمی نہیں جو خدمتِ خلق کے نام پر ذاتی کاروبار چلا رہے ہیں۔ سابقہ امریکی صدر اور راسخ العقیدہ مسیحی جمی کارٹر بعض مسیحی لیڈروں کی اس دوکانداری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یسوع مسیح نے اعلان کیا تھا کہ ان کی نبوت کا مقصد ''غریبوں کو خوش خبری سنانا، قیدیوں کو آزادی عطا کرنا، اندھوں کو بینائی لوٹانا اور مجبوروں کو جبر سے آزاد کرانا ہے''۔ تمام عیسائی ہمیشہ اس بیان سے آگاہ رہے ہیں لیکن میں مذہبی اور سیاسی ہر دو میدانوں میں اپنے عمر بھر کے تجربے کے بعد ایک ایسے نتیجے پر پہنچا ہوں جسے میرے لیے قبول کرنا مشکل تھا۔ حکومتی عہدوں کو فائز اشخاص اور چرچ کے اراکین غریبوں کی دستگیری کرنے، ان کی تکلیفوں کو دور کرنے، بے گھروں کو گھر فراہم کرنے، غربت اور نسلی امتیاز کو ختم کرنے، امن کے تحفظ، اور قیدیوں کی بحالی جیسے نیک کاموں کو سرانجام دینے میں ناکام رہے ہیں۔ (۲۸)

دینی جماعتوں کا کارنامہ تو یہ ہے کہ انہوں نے اطمینان قلب جیسی عظیم نعمت کو بھی اختلافی بنا دیا ہے۔ بقول ان کے اب وہ اطمینان قلب کافی نہیں جو محض مسلمان ہونے سے ہی حاصل ہو جاتا ہے۔ ان دینی جماعتوں نے ایسا ماحول تخلیق کیا ہے کہ آج جب تک کسی جماعت سے وابستگی اختیار نہ کر لی جائے اپنا ہی ایمان و اسلام مشکوک لگتا ہے۔

ان مذہبی جماعتوں کو پاکستان کا پرچم اسلام کی عظمت اور دعوت کا آئینہ دار نظر نہیں آتا۔ اس لیے ہر جماعت کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اپنا علیحدہ پرچم تخلیق کرے۔ کیا صرف پاکستان کا پرچم ہاتھوں میں بلند کرنے سے دعوت اسلام کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے؟

ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی جماعتوں کے قائدین اپنی قیادت کی دکانداری چمکانے کی بجائے اسلام کے فروغ کے لیے اخلاص سے کام کریں۔ اپنی تقاریر اور تبلیغی رویوں میں اس اطمینانِ قلب کا ذکر کریں جو صرف کلمہ طیبہ پڑھنے سے حاصل ہو جاتا تھا۔ جس کے لیے کسی جماعت کو اپنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ حضور ﷺ کے دین سے بڑی تنظیم اور جماعت کس کی ہے؟ کیا اس میں شمولیت کے

بعد بھی ایمان کی سلامتی اور پختگی کے لیے کسی اور جماعت میں شمولیت ضروری رہ جاتی ہے؟

ہم پھر گزارش کریں گے کہ احیائے اسلام کے لیے مل جل کر جماعت کی شکل میں کوشش کرنا نہ ہی اسلام میں ممنوع ہے اور نہ ہی کوئی بُری بات۔ ہمارا موقف فقط اتنا ہے کہ رویوں میں جماعتی پہچان کو دینی پہچان پر فوقیت دینا ہی ہمارے معاشرتی مسائل کی جڑ ہے۔

عنوان پرستی ہے، قابلیت پرستی نہیں

آج جب تک نام کے ساتھ حضرت، علامہ، مفکر قرآن، بشپ پادری وغیرہ کے عنوانات نہ لکھے ہوئے ہوں تو کوئی غور سے بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ہماری بعض مذہبی جماعتوں کے قائدین نے عنوان پرستی کو پھیلا کر یہ بات معاشرے کو باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ کسی کی قابلیت کو پرکھنے کا معیار اس کے نام کے ساتھ لگا ہوا اضافی عنوان ہے۔ اس عنوان پرستی نے عام آدمی سے یہ حق چھین لیا ہے کہ وہ بھی اپنے سینے میں چھپی ہوئی محبت کو اپنے سادہ لفظوں میں بیان کر سکے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> یہ ضعیف العقل لوگوں کی عادت ہے کہ حق کو لوگوں کی نسبت سے پہچانتے ہیں، لوگوں کو حق کی وجہ سے نہیں اور عقلمند آدمی حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پیروی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حق وراستی آدمیوں سے نہیں پہچانی جاتی۔ تم پہلے حق کو پہچانو! پھر اہل حق کو بھی پہچان لو گے۔ (۲۹)

اب اس کے برعکس آج خیالات کے معیار کو ان کے مفاہم سے نہیں پرکھا جاتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کہہ رہا ہے؟ اگر کہنے والا خود کو ''مفکر قرآن''، ''حضرت'' اور ''بشپ'' کہلاتا ہے یا ان القابات کے ساتھ جانا جاتا ہے تو واہ واہ کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور اگر کہنے والا ایک غیر معروف اہل علم یا سادہ دل مزدور ہے تو تنقید کے سارے تیروں کا رخ اس کی طرف کر دیا جاتا ہے، خواہ اس کی سوچ کا معیار ''مفکر قرآن'' اور ''بشپ'' کے عنوانات سے بلند ہو۔ اس عنوان پرستی نے ہر شخص سے اُس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے اظہار کا حق چھین لیا ہے۔

بعض لوگ اہل اور نا اہل میں تمیز کرنے کی لیاقت اور اہلیت نہیں رکھتے اور ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں اور ہر دستار و جبہ والے، جھوم جھوم کر اشعار اور خوب بیان کرنے والے کو علامہ، فہامہ، پیر طریقت، رہبر شریعت اور امیر فلاں وغیرہ کے القاب سے نوازتے اور پکارتے ہیں۔

اس بے تمیزی کا نوجوانوں پر برا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جب علم کی صعوبتوں کے بغیر یہ تمام

القابات، مقامات اور درجات مل جاتے ہیں تو پھر خود کو جان جوکھوں میں ڈال کر علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چونکہ اس قسم کے مبالغہ آمیز بلکہ جھوٹے القابات سے اتنا بڑا نقصان ہوتا ہے کہ انسان علم کی روشنی سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لیے سلف صالحین اس معاملہ میں بہت محتاط تھے، وہ کسی شخص کو ایسے اوصاف سے متصف نہیں کرتے تھے جو اس میں موجود نہ ہوں۔ کیونکہ وہ حضرات روحانی اطباء تھے۔ انہوں نے قلب و روح کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے حکم فرمایا ہے کہ کسی شخص کو ایسے القاب نہ دو جس کا وہ اہل نہ ہو کیونکہ بھاری القاب سن کر انسان رعونت اور خود پسندی کی بیماریوں کا مریض ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلویؒ فرماتے ہیں کہ ''بعض ناواقف حضرات میرے نام کے ساتھ حافظ لکھ دیا کرتے ہیں، حالانکہ میں اس لقب کا اہل نہیں ہوں''۔ اس کے بعد آپ نے ایک ماہ میں قرآن حفظ کرلیا اور حفظ کرنے کی وجہ بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

بحمد اللہ میں نے کلام پاک بالترتیب بکوشش یاد کرلیا اور یہ اس لیے کہ ان بندگان خدا کا کہنا غلط ثابت نہ ہو۔ (۳۰)

یہ ہے اسلاف کا طرز عمل کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا بریلویؒ نے خود کو خلاف واقعہ فقط حافظ قرآن کہلوانا گوارا نہیں فرمایا۔ جبکہ ہمارے دور میں یہ بات عام ہو چکی ہے کہ لوگ غیر حافظ کو حافظ، غیر قاری کو قاری، غیر عالم کو عالم اور مزید ترنگ میں آجائیں تو جعلی پیروں، دینی قائدین کو مجدد دین، شیخ المشائخ، غوث، قطب اور ابدال تک بنا دیتے ہیں۔ اکثر ایسی مبالغہ آرائی جاہل مبلغین، جاہل پیروں کے پروردہ پروفیشنل مقررین اور پیشہ ور نقیبانِ محفل کرتے ہیں۔ یہ لوگ چند ٹکوں کی خاطر جاہل، پیشہ ور، عیاش، اور بہروپیے، پیروں کو شہنشاہِ ولایت اور وقت کا جنید و بایزید بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ آج کل تو فنِ نقابت کاروبار کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس پر باقاعدہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں بھاری الفاظ و ذخیرہ القاب درج ہیں۔ نقیب حضرات ان الفاظ کو رٹ لیتے ہیں اور جو شخص ان کی مجلس کی زینت بنے اس پر وہ تمام الفاظ فٹ کر دیتے ہیں۔ جبکہ ام المومنین سیدہ عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا:

﴿اَنْ نُنَزِّلَ النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ﴾

لوگوں کو ان کے مراتب کے مطابق مقام دو۔ (۳۱)

یعنی علم و عمل میں جس کا جتنا مرتبہ ہے اس کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کریں۔ حسب ذیل حدیث سے یہ مفہوم اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی

کریم ﷺ نے مجھے حکم دیا:

﴿اَنْزِلِ النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ مِنَ الْخَيْرِ وَالشَّرِّ﴾

لوگوں کو خیر اور شر میں ان کے مرتبے کے مطابق مقام دو۔ (۳۲)

چونکہ اب ہم نے اپنے معاشرے میں قابلیت کو عنوانات کا محتاج کر دیا ہے لہٰذا ہماری اکثریت اپنی قابلیت کو دوسروں کی بھلائی اور بہتری کے لیے استعمال نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے اب ''مفکر اسلام'' اور ''بشپ'' ہونا ضروری ہے

حلیہ پرستی ہے، کردار پرستی نہیں

تبلیغ دین کا ذمہ اٹھانے والی جماعتوں کا ایک قابل ذکر ''کارنامہ'' یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے ''فکری و نظریاتی تشخص'' کے نام پر مخصوص حلیوں کو فروغ دے کر یہ بات معاشرے کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ صرف مخصوص حلیے کے لوگ ہی خدا پرست ہیں اور اس حلیے کو نہ اپنانے والے دنیا پرست۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں کردار کا اندازہ حلیوں سے لگایا جاتا ہے۔ داڑھی رکھ کر مخصوص حلیہ اپنانے والے کو مذہبی طبقہ جس عزت سے نوازتا ہے وہ کوٹ اور ٹائی والے کلین شیو کو اتنا ہی عزت کا حقدار نہیں سمجھتا خواہ وہ علم اور عمل میں کئی گنا بہتر ہو۔ انجیل برناس میں یسوع مسیح علیہ السلام کا ایک خوبصورت قول درج ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

﴿خدائے زندہ کی قسم، ایسے لوگ بھی ہیں جن کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ ٹپکا اور وہ ان ہزاروں سے زیادہ روتے ہیں جو آنسو بہاتے ہیں﴾ (۳۳)

مگر ہمارے ہاں تو جو کوئی اعلیٰ اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف لفظ ''اللہ'' کی آخری ''ہ'' کو جس قدر درد انگیز آواز میں نکالتا ہے وہ اسی قدر قربتِ الٰہی سے فیض یاب سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں: (۳۴)

گر حدیثے کژ بود معنیست راست — اگر لفظ ٹیڑھے ہوں اور معنی سیدھے ہوں (یعنی نیت ٹھیک ہو تو)

آں کژی لفظ مقبول خداست — وہ لفظوں کی ٹیڑھ، اللہ کے ہاں مقبول ہے۔

حضرت سید شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس حلیہ پرستی کے مرض پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے اپنے قول و فعل سے زُہد کا دعویٰ کرنے والو! یہ تم پر حجت ہے، تم نے زاہدوں کے کپڑے

پہن لیے ہیں اور تمہارے باطن رغبت اور دنیا پر حسرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر تم ان
کپڑوں کو اتار ڈالتے اور اس رغبت کو جو تمہارے دلوں میں ہے ظاہر کر دیتے تو تمہارے
لیے اچھا ہوتا اور نفاق سے تم کو زیادہ دور لے جانے والا ہوتا۔ (۳۵)

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ حلیہ پرستی کے اس مرض پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (۳۶)

بت پرستی گربمانی درصور اگر تو صورتوں میں (لگا) رہا ، تو بت پرست ہے
صورتش بگذار ودر معنیٰ نگر صورت سے گزرجا اور معنیٰ کو دیکھ
منکر اندر نقش واندر رنگِ اُو تصویر اور اس کے رنگ کو نہ دیکھ
بنگر اندر عزم و درآهنگ اُو اس کے ارادے اور قصد کو دیکھ

اس حلیہ پرستی سے جو سب سے بڑا نقصان پہنچا ہے وہ یہ کہ اب مکالمہ محبت کی ذمہ داری مخصوص طبقات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ پہلے ہر فرد اسے اپنا ذاتی فرض سمجھتا تھا کہ اپنے عمل سے مذہب اور معاشرے کی ترقی وخوشحالی کے لیے کام کرے مگر اب یہ صرف مذہبی طبقوں کی ذمہ داری بن گئی ہے۔ پہلے سب مل جل کر کام کرتے تھے اب اس کام کے لیے تنخواہ دار مولوی اور پادری رکھے جاتے ہیں۔

نصاب پرستی ہے، قرآن پرستی نہیں

نصاب پرستی بنیادی طور پر اس رویے کا نام ہے جو دلائل میں نہیں بلکہ عمل میں نظر آتا ہے۔ دلائل سے تو نصاب کی علمی افادیت کا دفاع کیا جاتا ہے مگر عملاً اکثریت نصاب پرستی ہی میں مبتلا ہے۔ دینی مدارس اور سمینریوں کے ان نصابوں کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ یہ اپنے اپنے مسالک کے اکابرین سے طلباء کی شدید جذباتی وابستگی پیدا کرتے ہیں تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ مذہبی سیاسی اختلافات کی بھینٹ چڑھ جائیں۔ ہمارے آج کے دینی مدارس کے نصاب کی علمی اور فکری حیثیت پر محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

دورِ زوال سے قبل علمائے دین نصاب میں وقت کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق تبدیلی کرتے تھے اور اس طرح اس میں ترمیم ہوتی رہتی تھی۔ جس طرح آج کل پرانے نصاب کی نظر ثانی ہوتی ہے۔ اسی طرح دینی نصاب بھی بدلتا تھا۔ یہ تبدیلی غیر مذہبی علوم میں ہوتی تھی۔ اصل مذہبی علوم قرآن وحدیث، فقہ وغیرہ میں تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح دینی نصاب تقریباً چھ ادوار سے گزرا، ساتواں ایڈیشن علامہ نظام الدین سہالوی

(۱۶۷۷-۱۷۴۸) نے مرتب کیا جو درس نظامی کے طور پر مشہور ہوا۔ جب دور غلامی آیا تو ان کے ذہن جمود کے شکار ہو گئے اور انہوں نے درسِ نظامی کو ہی آخری ایڈیشن قرار دیا۔ یہاں علوم کی تدریس کا ارتقاء رک گیا۔ ذہنوں کے مفلوج ہونے سے دینی نصاب بھی مفلوج ہو گیا اور اس سے غلامی کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کبھی بھی ریویو نہ کیا جا سکا اور غلامی کے جو اثرات دینی نصاب پر پڑے انہیں مسلمانوں نے قبول کر لیا۔ آج سے صدیوں پہلے کے داخل نصاب علوم کو جسے سینکڑوں سال گزر چکے ہیں علماء آج بھی انہیں رائج کرنا چاہتے ہیں حالانکہ تقاضائے وقت ہے کہ آج کے سائنسی علوم کو داخل نصاب کیا جائے۔ اور اس کے ذریعے ذہن کی تربیت کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ دورِ نو کی ضروریات کے مطابق قرآن وحدیث کی توضیح کر سکیں۔ (۳۷)

ان نصابوں کے مضامین اور متعلقہ کتب بھی بڑی ''سوچ بچار'' کے بعد منتخب کی جاتی ہیں تاکہ ہمارے مسلک کے پڑھنے والے خدانخواستہ مخالف مسلک کے اکابر کے علمی وفکری کارناموں سے آگاہ نہ ہو جائیں۔ اگر دوران کورس مخالفین مسلک پر بحث بھی ہوتی ہے تو صرف منفی نقطہ نظر سے۔ ان کو سو فیصد گمراہ ثابت کرنے پر زور لگایا جاتا ہے اس طرح طلبہ کے ذہنی تصورات کی منفی طرز پر تعمیر ہوتی ہے۔ انہیں اپنے سوا ہر دوسرا گمراہ اور معاشرے میں پھیلی ہوئی تمام خرابیوں کا ذمہ دار نظر آتا ہے اور پھر انہوں نے ہی تو آگے چل کر حسب توفیق معاشرے کے مختلف شعبوں کی قیادت سنبھالنی ہوتی ہے۔ ذرا انداز لگائیے یہی طلبہ آگے چل کر حالات کا رخ کس طرف موڑیں گے؟ علامہ نے یونہی تو نہیں کہا تھا:

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

مستی کردار قرآن پرستی سے پیدا ہوتی ہے نصاب پرستی سے نہیں۔ ایک تو ہمارے دینی مدارس کا سارا موضوع اسلام ہے انسان نہیں، پھر اس پر ستم کہ نصاب پرستی۔

اسلام علوم وفنون پڑھ کر کبھی انسان پیدا نہیں ہوئے۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ انسان صرف قرآن پرستی ہی نے پیدا کیے ہیں تاریخ انسانی نے ایک وقت وہ دیکھا تھا جب حالات جنگ میں صحابہ کرام قرآنی آیات کی زبانی تلاوت سے ناقابلِ تسخیر قلعے فتح کر لیا کرتے تھے اور وہ قرآن پرست ۳۱۳ ہی تو تھے جو

ایک ہزار پر غالب آئے۔ آج ایک ہزار نصاب پرستوں پر ۳۱۳ کافر ہی کافی ہیں۔ اب تو صورت حال اس حد تک خراب ہو چکی ہے کہ اب ان نصاب پرستوں کے لیے ۳۱۳ کافر نہیں بلکہ ان کا اپنا نصاب ہی کافی ہے۔ علامہ نے اسی لیے کہا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ
تو کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں!

مدرسوں سے نصاب پرستی کے اثرات اب عوام میں بھی پھیل چکے ہیں۔ جن آیات کی صرف زبانی تلاوت سے ناقابل تسخیر قلعے فتح کیے جاتے تھے آج وہ ہماری کاروباری اور گھریلو پریشانیوں کے لیے کافی نہیں سمجھی جاتیں۔ آج ہماری تمام مشکلات کا حل تعویذ دھاگے سمجھے جاتے ہیں۔

اس نصاب پرستی نے ماحول اس حد تک خراب کر دیا ہے کہ اگر کوئی دورانِ گفتگو قرآن کے حوالے زیادہ دے تو اسے ''پرویزی'' سمجھا جاتا ہے۔ حدیث پاک کے حوالے زیادہ دے تو اہل حدیث سمجھا جاتا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کی بات کرے تو بریلوی سمجھا جاتا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو گمراہ، مشرک، مردود سمجھتا ہے۔ ہر کوئی شیعہ، سنی، وہابی ہے۔ مسلمان کوئی نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام الناس کو قرآن باترجمہ پڑھانے کی تحریک چلائی جائے۔ ہم نے محض تلاوت قرآن سے بہت ثواب کما لیا اب وقت کا تقاضا ہے کہ قرآن مجید کے بنیادی معنی و مفہوم سے معاشرہ کے ہر فرد کو فیض یاب کیا جائے تا کہ نام نہاد علماء، پیروں اور فقیروں کی دکانداری ختم کر کے قوم کے ہر فرد کو روز مرہ زندگی گزارنے کے لیے بنیادی خود اعتمادی فراہم کی جا سکے۔ طلبا اور پیروکاروں کی علمی و عشقی وابستگی مسلکی و فرقہ وارانہ تفسیروں کی بجائے ''کُتبِ مُقدسہ'' کے متن سے پیدا کی جائے تا کہ وہ خدا کے پیغام سے براہ راست آگاہ ہو کر رنگ، نسل، جنس اور مذہب سے قطع نظر معاشرے کے ہر فرد کی بہتری اور بھلائی کے لیے کام کر سکیں۔

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ حافظ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، جلد ۳، ص ۳۵

۲۔ صحیح بخاری، باب التواضع

۳۔ بخاری، **کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ**، حدیث ۴۴۲، **مسلم من کتاب البر و الصلة**

۴۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، لا اکراہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ، ص ۴۰

۵۔ **الصحیح البخاری، کتاب الجهاد و السیر، باب السمع و الطاعة الامام**، حدیث: ۲۱۰

۶۔ شیخ ابو طالب مکی، قوت القلوب، جلد اول، ص ۶۰۳

۷۔ ایضاً، ص ۶۰۲

۸۔ ڈاکٹر علی اکبر قادری الازہری، تحریک منہاج القرآن کی فکری و نظریاتی اساس، ص ۴۴، مطبوعہ فرید الدین اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ منہاج القرآن - لاہور

۹۔ ایضاً، ص ۴۵ - ۴۶

۱۰۔ **الصحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء، باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن**

۱۱۔ رومی

۱۲۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، سفر انقلاب، ص ۱۵، مطبوعہ منہاج القرآن پبلی کیشنز - لاہور،

۱۳۔ صحیح بخاری، باب العلم، حدیث ۵۷

۱۴۔ مولانا مفتی محمد شفیع، تفسیر معارف القرآن، جلد ۲، ص ۴۴۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۴۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۴۷

۱۷۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۳۶۲

۱۸۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری، تفسیر ضیاء القرآن، جلد اول، ص ۳۵۵

۱۹۔ ص ۳۲۶، جلد ۹ فتاویٰ رضویہ، مطبوعہ کراچی

۲۰۔ مولانا مفتی محمد شفیع، تفسیر معارف القرآن، جلد سوم، ص ۲۴۹ - ۲۵۰

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔مشکوۃ المصابیح ، باب الشفقة و الرحمة علیٰ الخلق، ص ۴۴۷
۲۴۔قاضی عیاض مالکی،الشفاء بتعریف حقو ق المصطفیٰ،ص۱۴۰،مطبوعہ مکتبہ اعلیٰ حضرت-لاہور
۲۵۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہرالقادری، لا اکراہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ،ص ۴۱
۲۶۔ پروفیسر محمد رفیق، عالم اسلام اور بیسویں صدی کی احیائی اسلامی کاوشیں،ص ۸۶-۸۸، ماہنامہ منہاج القرآن جنوری ۲۰۰۰ء۔
۲۷۔آرچڈیکن برکت اللہ ایم اے، مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، ص ۱۵، ،مطبوعہ ۱۹۷۰ء، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی،انارکلی-لاہور
۲۸۔جمی کارٹر، امریکہ کا اخلاقی بحران،ص ۶۵
۲۹۔امام غزالی، المنقدمن الضلال،ص ۲۹، بترجمہ تلاشِ حق از خالق حسن قادری،مطبوعہ ۱۹۷۱ء،محکمہ اوقاف پنجاب-لاہور
۳۰۔حیات اعلیٰ حضرت، ج ا،ص ۳۶
۳۱۔سنن ابی داؤد: ۴۸۴۲، جامع رقم الحدیث ۲۷۳۵
۳۲۔جامع صغیر، رقم الحدیث ۲۸۳۶
۳۳۔انجیل برناس، باب ۱۰۳
۳۴۔ مولانا جلال الدین رومی، مثنوی، دفتر سوم
۳۵۔شیخ عبدالقادر جیلانی، پچیسویں مجلس، الفتح الربانی
۳۶۔ مولانا جلال الدین رومی، مثنوی
۳۷۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہرالقادری، قرآنی فلسفۂ انقلاب، جلد اول، ص ۴۲۰-۴۲۱

﴿باب ۳﴾

مَسیحی مُسلِم مُکالِمہِ محبّت کے چار بُنیادی تصوّرات

☆

اگر میں آدمیوں اور فرشتوں کی زبانیں بولوں اور محبت نہ رکھوں تو میں ٹھنٹھناتا پیتل یا جھنجھناتی جھانجھ ہوں۔ اور اگر مجھے نبوت ملے اور سب بھیدوں اور کل علم کی واقفیت ہو اور میرا ایمان یہاں تک کامل ہو کہ پہاڑوں کو ہٹادوں اور محبت نہ رکھوں تو میں کچھ بھی نہیں۔ اور اگر اپنا سارا مال غریبوں کو کھلا دوں یا اپنا بدن جلانے کو دے دوں اور محبت نہ رکھوں تو مجھے کچھ بھی فائدہ نہیں۔ محبت صابر ہے اور مہربان۔ محبت حسد نہیں کرتی۔ محبت شیخی نہیں مارتی اور پھولتی نہیں۔ نازیبا کام نہیں کرتی۔ اپنی بہتری نہیں چاہتی۔ جھنجھلاتی نہیں۔ بدگمانی نہیں کرتی۔ بدکاری سے خوش نہیں ہوتی بلکہ راستی سے خوش ہوتی ہے۔ سب کچھ سہہ لیتی ہے۔ سب کچھ یقین کرتی ہے سب باتوں کی امید رکھتی ہے۔ سب باتوں کی برداشت کرتی ہے۔ محبت کو زوال نہیں۔۔۔
غرض ایمان امید محبت یہ تینوں دائمی ہیں مگر افضل ان میں محبت ہے''

بائبل مقدس
﴿۱- کرنتھیوں ۱۳:۱-۱۳﴾

حقیقی اور موثر مکالمہ محبت کی بنیاد چار بنیادی تصورات پر قائم ہے۔ یہ تصورات ستون (Pillars) کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور انہی پر مکالمہ محبت کی عمارت قائم ہے۔ آیئے ان چار تصورات کا ایک جائزہ لیتے ہیں:

پہلا تصور: انسان خدا کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے

مسیحیت اور اسلام، دونوں عظیم مذاہب اپنے پیروکاروں کو اس بات کی خوشخبری دیتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ بائبل مقدس میں انسان کی تخلیق کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں گے﴾ پیدائش، ۱:۲۶

پھر اسی آیت (۲۶) اور ۲۷ میں ارشاد ہے:

﴿اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا﴾

بائبل مقدس کی آیت کے معنیٰ و مفہوم کی تصدیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

﴿عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا قَاتَلَ اَحَدُکُمْ اَخَاهُ فَلْیَجْتَنِبِ الْوَجْهَ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی سے لڑے تو اس کے چہرے پر نہ مارے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو اپنی صورت پر پیدا ہے۔(۱)

بائبل مقدس او ۔ ث نبوی ﷺ میں انسان کو اللہ کی صورت کے حوالے سے بیان کرنا لفظی معنی میں نہیں بلکہ اس میں اضافت تشریف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف انسان کی تخلیق کی نسبت صرف اس لیے کی گئی ہے

تاکہ دیگر مخلوقات پر انسان کی فضیلت وعظمت واضح ہو جائے۔ چنانچہ حدیث نبوی ﷺ کی شرح کرتے ہوئے شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''اللہ کی طرف صورت کی نسبت تشریف وتکریم کے لیے ہے جیسے

نَفَخْتُ مِنْ رُّوْحِیْ میں ہے۔'' (۲)

مگر دوسری جانب اسلام اور مسیحیت کی تعلیمات ہی کے مطابق انسان کو اللہ کی صورت پر تب سمجھا جائے گا اور انسان قابل احترام تب ٹھہرے گا جب وہ اللہ کی مخلوق کے لیے باعث امن ومحبت ہوگا۔ انسان کو اشرف المخلوقات کا اعزاز تب دیا جائے گا جب وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرے کہ وہ معاشرہ کے لیے امن وسلامتی کا باعث ہے وگرنہ یہی اللہ کی صورت پر اور اشرف المخلوقات بننے والا انسان اسلام اور مسیحیت کے متفقہ فتویٰ کے مطابق جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ چنانچہ پطرس فرماتے ہیں:

﴿لیکن یہ لوگ بے عقل جانوروں کی مانند ہیں جو پکڑے جانے اور ہلاک ہونے کے لیے حیوان مطلق پیدا ہوئے ہیں﴾ ۲۔پطرس ۲:۱۲

آگے چل کر پطرس اسی اشرف المخلوقات کو اس کی بداعمالی کے باعث ''لعنت کی اولاد'' کے اعزاز سے نوازتے ہیں۔ قرآن مجید نے بھی اسی اشرف المخلوقات کو معاشرے میں بدامنی، دہشت گردی اور بدکرداری پھیلانے کے باعث جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ سورۃ الاعراف ۷:۱۷۹

اور بے شک ہم نے جہنم کے لیے جنوں اور انسانوں میں سے بہت سے (افراد) کو پیدا فرمایا وہ دل (ودماغ) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سمجھ نہیں سکتے اور وہ آنکھیں رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) دیکھ نہیں سکتے اور وہ کان (بھی) رکھتے ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سن نہیں سکتے، وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ، وہی لوگ ہی غافل ہیں۔

مسیحی مسلم مکالمہ محبت میں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم مکالمہ کے عمل کو اپنے اشرف المخلوقات

کے ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں یا پھر بدتر المخلوقات ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی سیاسی وفرقہ وارانہ دکانداری چمکانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔

دوسرا تصور: الہامی کتب کے نزول کا مقصد تکریم انسانیت اور قیام امن ہے۔

قرآن مجید میں نزول کتب سماوی کی سب سے اہم وجہ یہی بیان کی گئی ہے کہ

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط﴾

(ابتداء میں) سب لوگ ایک ہی دین پر جمع تھے، (پھر جب ان میں اختلافات رونما ہوگئے) تو اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبروں کو بھیجا، اور ان کے ساتھ حق پر مبنی کتاب اتاری تاکہ وہ لوگوں میں ان امور کا فیصلہ کردے جن میں وہ اختلاف کرنے لگے تھے۔ سورۃ البقرہ ۲:۲۱۳

یعنی کتب مقدمہ کے نزول سے انبیاء علیہم السلام ان معاملات کو نپٹا سکیں جنہوں نے نسل انسانی کا سکون اور اطمینان برباد کردیا تھا۔ بائبل مقدس میں بھی نزول کتب کی یہی وجہ بیان کی گئی ہے۔ کتاب زبور میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿احمق اپنی خطاؤں کے سبب سے اور اپنی بدکاری کے باعث مصیبت میں پڑتے ہیں۔ ان کے جی کو ہر طرح کے کھانے سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ موت کے پھاٹکوں کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں۔ تب وہ اپنی مصیبت میں خداوند سے فریاد کرتے ہیں اور وہ ان کو ان کے دکھوں سے رہائی بخشتا ہے۔ اور وہ اپنا کلام نازل فرما کر ان کو شفاء دیتا ہے اور ان کو ان کی ہلاکت سے رہائی بخشتا ہے﴾ زبور ۱۰۷:۱۷-۲۰

قرآن مجید اور بائبل مقدس کی آیات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے قرآن مجید سمیت تمام کتب اور صحیفوں کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کتب کی روشنی میں اپنے اضطراب وانتشار کو وحدت اور سکون وطمانیت میں بدل سکیں اور اپنے اختلافات کو ختم کر کے جسد واحد کی طرح متحدہ ہو سکیں۔ ان کتب کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اس کی ذہنی، جسمانی اور معاشرتی پریشانیوں سے نجات دلا کر امن ومحبت کے ساتھ زندگی گزارنے کے قابل بنایا جائے مگر حیرت ہے کہ ہمارے آج کے نام نہاد دینی وسیاسی راہنماؤں کی

مذہبی تفسیرات نے خود فرد کی ذہنی حالت اور معاشرے کے امن کو بگڑنے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔
بقول علامہ محمد اقبالؒ:

عجب واعظ کی دیں داری ہے یا رب
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے
(غزلیات، بانگ درا)

اللہ نے اپنی کتب اپنے محبوب نبیوں کے وسیلے سے ہر شخص کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل فرمائیں تھیں نہ کہ کسی سیاسی جماعت یا گروپ کے لیے۔ اللہ کا پیغام سب کے لیے عام تھا اور اس پیغام کی روشنی میں ہر فرد خاص تھا۔ بقول امام غزالیؒ نے ہر عام شخص میں بھی پیغمبرانہ صلاحیتیں رکھی ہیں (کیمیائے سعادت) مگر ہمارے معاشرے میں یہ حق صرف کسی سیاسی یا مذہبی جماعت کے قائد کے لیے ہی مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ سید محمد بن علوی مالکیؒ اپنی کتاب نہج السلف میں فرماتے ہیں۔

ابو القاسم اصفہانی نے ''الترغیب والترہیب'' میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ نے اٹھارہ اصول وضع فرمائے جن میں سے ایک یہ ہے کہ جو تیرے بارے اللہ کی نافرمانی کرے (برا بھلا کہے) تو اس کے بارے اللہ کی اطاعت کو (اچھے لفظوں میں یاد کر) اور اپنے بھائی کے کام کی اچھی تعبیر کر حتیٰ کہ تجھے اس کے بارے میں کوئی غالب یقین آ جائے اور مسلمان کے منہ سے جو بات نکلے اسے ہرگز شر خیال نہ کر کہ جب تک تو اس میں کوئی بھلائی کا پہلو سمجھ سکتا ہے۔ (۳)

مگر ہمارے ہاں تو جب تک دینی و سیاسی قائد کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے تب تک دوسرے سے بدتہذیبی و بداخلاقی سے پیش آنا بھی اخلاقی و مذہبی ذمہ داری اور دینی غیرت سمجھی جاتی ہے۔

دینی قیادت کا معیار: بائبل مقدس کی روشنی میں

بائبل مقدس نے دینی قیادت کا معیار ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

﴿یہ بات سچ ہے کہ جو شخص نگہبان کا عہدہ چاہتا ہے وہ اچھے کام کی خواہش کرتا ہے۔ پس نگہبان کو بے الزام، ایک بیوی کا شوہر، پرہیزگار، متقی، شائستہ، مسافر پرور اور تعلیم دینے

کے لائق ہونا چاہیے۔ نشہ میں غل مچانے والا یا مارپیٹ کرنے والا نہ ہو بلکہ حلیم ہو۔ نہ تکراری نہ زر دوست۔ اپنے گھر کا بخوبی بندوبست کرتا ہو اور اپنے بچوں کو کمال سنجیدگی سے تابع رکھتا ہو۔ (جب کوئی اپنے گھر ہی کا بندوبست کرنا نہیں جانتا تو خدا کی کلیسیا کی خبرگیری کیونکر کرے گا؟)۔ نو مرید نہ ہو تا کہ تکبر کر کے کہیں ابلیس کی سی سزا نہ پائے۔ اور باہر والوں کے نزدیک بھی نیک نام ہونا چاہیے تا کہ ملامت میں اور ابلیس کے پھندے میں نہ پھنسے﴾

۱۔ تیمتھیس ۳: ۱-۷

یہی بات حضرت علی بن ابی طالبؓ نے یوں فرمائی ہے:

﴿مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ اِمَاماً فَلْيَبْدَاْءُ بِتَعْلِيْمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيْمِ غَيْرِهِ ۔ وَلْيَكُنْ تَادِيْبُهُ بِسِيْرَتِهِ قَبْلَ تَادِيْبِهِ بِلِسَانِهِ وَ مُعَلِّمُ نَفْسِهِ وَمُؤَدِّبُهَا اَحَقُّ بِالْاِجْلَالِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَ مُؤَدِّبِهِمْ﴾

جو لوگوں کا پیشوا بنتا ہے تو اسے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے کو تعلیم دینی چاہیے اور زبان سے درس اخلاق دینے سے پہلے اپنی سیرت و کردار سے تعلیم دینی چاہیے۔ اور جو اپنے نفس کی تعلیم و تادیب کر لے وہ دوسروں کی تعلیم و تادیب کرنے والے سے زیادہ احترام کا مستحق ہے۔ (۴)

حقیقی قیادت تو وہی ہے جو معاشرے میں امن، محبت اور بھائی چارہ کے فروغ کا باعث بنے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو بائبل مقدس اور حضرت علیؓ کے بیان [illegible] سادہ سے معیار پر بھی پورا اترتے ہیں۔ بائبل مقدس کے اس معیار کا عملی نمونہ ہمیں سیرۃ النبی ﷺ میں یوں نظر آتا ہے کہ بقول قاضی عیاض مالکیؒ:

''حضرت علیؓ نے سفیان بن وکیعؒ کی حدیث میں فرمایا ''صحابہ آپ کی مجلس میں حاجت مند ہوتے اور شکم سیر ہو کر جدا ہوتے اور فقیہ بن کر نکلتے۔ میں نے کہا: آپ ﷺ کے نکلنے کی مجھ کو حالت بیان فرمایئے آپ ﷺ اور کیا کرتے تھے۔ فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنی زبان مبارک کو قبضہ میں رکھتے۔ وہی فرماتے جو امت کے لیے نفع بخش ہوتا۔ ان سے محبت کرتے ان کو جدا نہ کرتے، ہر قوم کے کریم کی عزت فرماتے اور اس کو ان پر حاکم مقرر کرتے، برے لوگوں سے حذر (خوف) کرتے اور ان سے بچتے نہ یہ کہ ان سے منہ پھیر لیتے یا بدخلقی کرتے۔ اپنے صحابہ کی خبرگیری کرتے اور لوگوں سے لوگوں کے حل پوچھتے،

اچھی چیز کی تعریف وخوبی بیان کرتے اور بُری چیز کی برائی اور اس کی رسوائی بیان کرتے۔

آپ ﷺ کا حکم متوسط ہوتا نہ کہ مختلف یعنی زیادہ نرم وسخت نہ ہوتا۔

آپ ﷺ اس خوف سے غافل نہ رہتے کہ لوگ کہیں غافل نہ ہو جائیں یا ست نہ پڑ جائیں۔ آپ ﷺ ہر حالت کے لیے تیار تھے۔ آپ حق میں کمی نہ کرتے اور غیر حق کی طرف تجاوز نہ کرتے۔ جو لوگ آپ ﷺ کے قریب ہوتے وہ بہتر لوگوں میں سے ہوتے۔ آپ ﷺ کے نزدیک ان میں وہ افضل تھا جو خیر خواہی کی باتیں زیادہ کرتا اور آپ ﷺ کے نزدیک وہ بڑے مرتبہ والا ہوتا جو لوگوں کے لیے نفع رساں اور موجب تقویت ہوتا۔

اس کے بعد میں نے مجلسی کیفیت معلوم کی کہ آپ ﷺ اس میں کیا کرتے تھے؟

فرمایا: رسول اللہ ﷺ کی نشست و برخاست اللہ عزوجل کے ذکر کے لیے ہی ہوتی اور کسی جگہ کو اپنے لیے وطن نہ بناتے اور دوسروں کو وطن بنانے سے منع فرماتے۔ جب کسی قوم کی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے اور اس کا حکم بھی دیتے۔ ہر مصاحب کو اس کا حصہ دیتے یہاں تک کہ کوئی مصاحب یہ گمان نہیں کرتا تھا کہ کوئی بھی اس سے بڑھ کر آپ ﷺ کے نزدیک مکرم ہے۔ جو شخص بھی کسی ضرورت سے آپ ﷺ کے پاس بیٹھتا یا کھڑا ہوتا تو آپ رکے رہتے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی چلا جاتا۔ جو شخص بھی آپ سے اپنی حاجت کے لیے سوال کرتا، آپ ﷺ یا تو اسے کچھ دیتے یا نرم بات کہہ فرمادیتے۔ آپ ﷺ کا دست مبارک اور آپ ﷺ کا خلق کریم لوگوں کے لیے وسیع تھا گویا آپ ﷺ ان کے لیے بمنزلہ باپ کے تھے۔ آپ ﷺ کے نزدیک حق میں سب برابر تھے۔ البتہ تقویٰ ان (لوگوں) کو زیادہ قریب اور بڑھانے والا تھا۔

دوسری روایت میں صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ کے نزدیک وہ سب حق میں برابر تھے۔ آپ ﷺ کی مجلس حلم وحیاء اور صبر وامانت کی مجلس تھی۔ کوئی شخص اس میں آواز اونچی نہ کرتا اور اس میں عورتیں بے پردہ نہ ہوتیں اور نہ اس میں کوئی یاوہ گوئی ہوتی اور یہ فقرہ ان دونوں روایتوں کے علاوہ ہے کہ صحابہ باہم تقویٰ کی بنا پر مہربانی اور انکساری کرتے۔ بڑوں کی عزت کی جاتی اور چھوٹوں پر لطف وکرم، حاجت مندوں کی مدد کرتے اور مسافروں پر مہربانی''۔ (۵)

جب تک نزولِ کتب کے حقیقی مقصد کو مکالمہ کے عمل میں اولیت نہیں دی جائے گی۔ مسیحی مسلم

مکالمہ اس وقت تک ایک گھٹیا سیاسی ہتھیار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

تیسرا تصور: طعن فی الدین ﴿وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ کی ممانعت

مسیحی مسلم مکالمہ محبت میں سنجیدہ علمی اختلاف کی اجازت ہے مگر طعن فی الدین کی قطعاً ممانعت ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ﴾ سورة توبه ٩: ١٢

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو تم (ان) کفر کے سرغنوں سے جنگ کرو بے شک ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں تاکہ وہ (اپنی فتنہ پروری سے) باز آ جائیں۔

طعن کا لغوی معنی ہے نیزہ کا وار کرنا، اسی طرح ہر وہ بات جو دل کو دکھ پہنچانے والی ہو اس کو بھی استعارہ کے طور پر طعن کہتے ہیں۔ طعن فی الدین کا مطلب یہ ہے کہ اہل دین کی دل آزاری یا دین کے وہ عقائد واحکام جو دلائل عقلیہ سے قطعی ثابت ہیں ان کا مذاق اڑایا جائے۔ طعن فی الدین کا اطلاق سنجیدہ علمی وعقلی اختلاف رائے پر نہیں ہوتا۔ چنانچہ علمائے اسلام کی تصریحات کے مطابق اسلام میں علمی تنقید کی تو اجازت ہے تحقیر طعن وتشنیع کی اجازت نہیں۔ سورۃ توبہ کی اسی آیت کے تحت مفسرین قرآن امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور دیگر علمائے اسلام نے طعن فی الدین کے مرتکب کو واجب القتل قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ اسی آیت کی تفسیر میں گستاخ رسول کی سزا موت کا نتیجہ اخذ فرماتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

یہ مشرک اپنی قسموں کو توڑ کر وعدہ خلافی اور عہد شکنی کریں اور تمہارے دین پر اعتراض کرنے لگیں تو تم ان کفر کے سروں کو توڑ مروڑ دو۔ اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دے دین میں عیب جوئی کرے اس کا ذکر اہانت کے ساتھ کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ ان کی قسمیں محض بے اعتبار ہیں۔ یہی طریقہ ان کے کفر وعناد سے روکنے کا ہے۔ (۶)

بت پرستی سے بھی بڑا کون سا گناہ ہوگا مگر اسلام نے ان مشرکین کے جھوٹے معبودان کا مذاق اڑانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْواً بِغَیْرِ عِلْمٍ ط کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَھُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّھِمْ مَّرْجِعُھُمْ فَیُنَبِّئُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾

''اور (اے مسلمانو!) تم ان (جھوٹے معبودوں) کو گالی مت دو جنہیں یہ (مشرک لوگ) اللہ کے سوا پوجتے ہیں، پھر وہ لوگ (بھی جواباً) جہالت کے باعث ظلم کرتے ہوئے اللہ کی شان میں دشنام طرازی کرنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر فرقہ (و جماعت) کے لیے ان کا عمل (ان کی آنکھوں میں) مرغوب کر رکھا ہے (اور وہ اسی حق کو سمجھتے رہتے ہیں) پھر سب کو اپنے رب ہی طرف لوٹنا ہے اور وہ انہیں ان اعمال کے نتائج سے آگاہ فرما دے گا جو وہ انجام دیتے تھے''۔ سورۃ الانعام ۶:۱۰۸

بائبل مقدس نے بھی طعن فی الدین نہ کرنے کی ان لفظوں کی تعلیم دی ہے۔

﴿ مگر بیوقوفی کی حجتوں اور نسب ناموں اور جھگڑوں اور ان لڑائیوں سے جو شریعت کی بابت ہوں پرہیز کر۔ اس لیے کہ یہ لاحاصل اور بے فائدہ ہیں ﴾ ططس ۳:۹

ایک اور مقام پر پولس رسول نے بڑی خوبصورتی سے طعن فی الدین کے تصور کو ان لفظوں میں واضح کیا ہے:

﴿ لیکن بیوقوفی اور نادانی کی حجتوں سے کنارہ کر۔ کیونکہ تو جانتا ہے کہ ان سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں، اور مناسب نہیں کہ خداوند کا بندہ جھگڑا کرے، بلکہ سب کے ساتھ نرمی کرے اور تعلیم دینے کے لائق اور بردبار ہو، اور مخالفوں کو حلیمی سے تادیب کرے۔ شائد خدا انہیں توبہ کی توفیق بخشے تا کہ وہ حق کو پہچانیں، اور خداوند کے بندہ کے ہاتھ سے خدا کی مرضی کے اسیر ہو کر ابلیس کے پھندے سے چھوٹیں ﴾ ۲۔ تیمتھیس ۲:۲۳-۲۶

مسیحی مسلم مکالمہ محبت میں خلوصِ نیت پر مبنی علمی اور عقلی اختلاف کی ادب اور احترام کے دائرے میں اجازت تو ہے مگر طعن فی الدین کی قطعاً اجازت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ عمل معاشرے میں فتنہ وفساد کا باعث بنے گا۔ اختلاف کے انداز و آداب سے انسان کی فطرت اور نیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

چوتھا تصور: کائنات کی سب سے بڑی کرامت خدمتِ خلق ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے نیک بندوں سے خواہ وہ مسیحی ہوں یا مسلم کرامت اور خرقِ عادت کا ظہور برحق ہے۔ جمہور علماء اسلام، فقہاء و محدثین، اور مشائخ و صوفیا سب ظہور کرامات کے قائل ہیں اور علمائے اسلام نے اس پر مستقل کتب بھی لکھی ہیں۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ﴾ یونس ۱۰:۶۲-۶۳

خبردار! بے شک اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ و غمگین ہوں گے۔ (وہ) ایسے لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (ہمیشہ) تقویٰ شعار رہے۔

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ ﷺ اِنَّ اللّٰہ قَالَ مَنْ عَادٰ لِی وَلِیّاً فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلٰی عَبْدِی بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِی یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِی یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِی یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہُ الَّتِی یَمْشِی بِھَا وَ اِنَّ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ وَلَئِنْ سْتَعَاذَنِی لَاُعِیْذَنَّہٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُہٗ تَرَدُّدِی عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَہُ مَسَاءَتَہٗ ۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں اور میرا بندہ ایسی کسی چیز کے ذریعے قرب حاصل نہیں کرتا جو مجھے پسند ہیں اور میں نے اس پر فرض کی ہیں بلکہ میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور اسے عطا فرماتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ پکڑے تو ضرور میں اسے پناہ دیتا ہوں اور کسی کام میں مجھے تردد نہیں ہوتا جس کو میں کرتا ہوں مگر مومن کی موت کو برا سمجھنے میں کیونکہ میں اس کے اس برا سمجھنے کو بُرا سمجھتا ہوں۔ (۷)

کرامات کا ظہور مسیحیت میں بھی برحق ہے۔ یسوع مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ حواریوں کو اپنے پیغام کی تبلیغ پر بھیجتے وقت ان کو کرامات پر قدرت بخشی۔ آپ نے فرمایا:

﴿بیماروں کو اچھا کرنا۔ مردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔﴾ متی: باب ۱۰:۸

اسلام اور مسیحیت میں جہاں کرامات کا ظہور برحق تسلیم کیا گیا ہے وہاں یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ کرامت بذات خود ایک آزمائش بھی ہے۔ اگر انسان کرامات کو مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے استعمال کرنے کی بجائے اپنی ذاتی شہرت اور نفس پرستی کا ذریعہ بنالے تو پھر یہی کرامت اس کے جہنمی ہونے کا ذریعہ بن جائے گی۔ چنانچہ یسوع مسیح علیہ السلام ان کرامات و معجزات دکھانے والوں کو فرماتے ہیں:

﴿جو مجھ سے اے خداوند اے خداوند! کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہی میں داخل نہ ہوگا مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ اس دن بہتیرے مجھ سے یہ کہیں گے اے خداوند اے خداوند! کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے بدروحوں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سے معجزے نہیں دکھائے؟۔ اُس وقت میں ان سے صاف کہہ دوں گا کہ میری کبھی تم سے واقفیت نہ تھی۔ اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ۔﴾ انجیل متی ۷:۲۰-۲۳

ایک اور مقام پر مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے یہ فرمایا کہ بلاشک وشبہ کرامات حق ہیں۔ مگر سچے مسیحی کے لیے اس کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں۔ اصل خوشی قربت ورضائے الٰہی ہے:

﴿وہ ستر خوش ہو کر پھر آئے اور کہنے لگے اے خداوند تیرے نام سے بدروحیں بھی ہمارے تابع ہیں۔ اُس نے اُن سے کہا میں شیطان کو بجلی کی طرح آسمان سے گرا ہوا دیکھ رہا تھا۔ دیکھو میں نے تم کو اختیار دیا کہ سانپوں اور بچھوؤں کو کچلو اور دُشمن کی ساری قدرت پر غالب آؤ اور تم کو ہرگز کسی چیز سے ضرر نہ پہنچے گا۔ تو بھی اس سے خوش نہ ہو کہ روحیں تمہارے تابع ہیں بلکہ اس سے خوش ہو کہ تمہارے نام آسمان پر لکھے ہوئے ہیں۔﴾ لوقا ۱۰:۱۷-۲۰

تمام علماء وصوفیاء اسلام بھی اس نکتہ پر متفق ہیں کہ اسلام میں خدمت خلق کا رتبہ کرامات دکھانے سے ہزار گنا زیادہ ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے خدمت خلق سے بڑھ کر کوئی کرامت اور خدمت گار سے بڑھ

کر کوئی اور ولی نہیں ہے۔ اسی لیے علمائے اسلام نے اپنی کتب میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی کرامت صادر ہو مگر وہ اتباع شریعت محمدی ﷺ کو ضروری خیال نہ کرتا ہو اور اس کے کردار سے اردگرد کے لوگ اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھیں تو یہ کرامت ولایت کی نہیں بلکہ شیطانیت کی علامت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ آل عمران ۳:۳۱

حضرت حسن بصریؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ایک قوم والوں نے دعویٰ کیا کہ وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ عزوجل نے مذکورہ آیت ان کے امتحان کے لیے نازل فرمائی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمادی کہ جس شخص نے رسول خدا کی اتباع کی، اللہ اس شخص سے محبت رکھتے ہیں۔ اور جس شخص نے رسول خداؐ کی اتباع نہ کی تو وہ شخص اولیاء اللہ میں سے نہیں۔ (۸)

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ اولیاء اللہ کا خاص راستہ ہے جس میں سیدنا محمد ﷺ کی اتباع کی ضرورت نہیں، وہ کافر ہے اور اولیاء الشیطان میں داخل ہے۔ (۹)

حضرت امام شافعیؒ کا قول ہے:

﴿إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَمْشِي عَلَى الْمَاءِ أَوْ يَطِيرُ فِي الْهَوَاءِ فَلَا تُصَدِّقُوهُ وَلَا تَغْتَرُّوا بِهِ حَتَّى تَعْلَمُوا مُتَابَعَةً لِلرَّسُولِ ﷺ﴾

جب تم کسی آدمی کو پانی پر چلتے یا ہوا میں اڑتے دیکھو تو اس کی تصدیق نہ کرو۔ اور اس سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ جب تک تمہیں یہ معلوم نہ ہوجائے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کر رہا ہے یا نہیں۔ (۱۰)

فتوحات مکیہ میں ہے کہ ابویزید بسطامیؒ سے طی ارض کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ یہ قبولیت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ ابلیس مشرق سے مغرب تک ایک دم میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اللہ کے نزدیک اس کا کچھ بھی مرتبہ نہیں اور ہوا پر اڑنے کو پوچھا گیا تو فرمایا کہ چڑیاں ہوا پر اڑا کرتی ہیں۔ اور جب مومن ان

سے افضل ہے تو ایسی چیز کرامت کیسے شمار کی جاسکتی ہے جس میں چڑیاں شریک ہوں۔ اور فرمایا کہ اگر تم ایسا آدمی دیکھو کہ بہت کرامتیں دیا گیا ہو یہاں تک کہ ہوا میں اڑتا ہے تو تم دھوکے میں نہ آجاؤ، اس کے معتقد نہ بنو جب تک اس کو نہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور پابندی شریعت میں کیسا ہے۔ (۱۱)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے حالات وواقعات میں ایک مشہور واقعہ درج ہے کہ آپ ایک مرتبہ حسب معمول درس وتدریس میں مشغول تھے اور ہزاروں کی تعداد میں شاگردوں کے حلقہ میں آپ انہیں شریعت وطریقت کی تعلیم دینے میں مشغول تھے کہ اچانک سب نے دیکھا کہ ایک شخص ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور آپ کے پاس چند لمحے محو گفتگو رہنے کے بعد دوبارہ واپس ہوا میں اُڑ کر غائب ہو گیا۔ لوگوں نے جب اس شخص کی ہوا میں اڑنے کی یہ کرامت دیکھی تو سمجھے کہ یہ شاید کوئی بہت بڑا ولی اللہ ہے۔ چنانچہ آپ سے پوچھا کہ یہ شخص کون تھا اور آپ کے پاس کیوں آیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ شخص میرا شاگرد ہے اور میرے پاس محبت اور اخلاق کا درس لینے آیا تھا۔ لوگ بہت حیران ہوئے کہ اتنی بڑی کرامت کے بعد بھی یہ شخص کیا سیکھنے آیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہوا میں اُڑنا اور بات ہے اور لوگوں سے محبت واخلاق سے پیش آنا اور بات ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی رضا اور قربت کے لیے مخلوق کی خدمت کرنا او معاشرے میں پیار ومحبت پھیلانے سے بڑھ کر کوئی اور بڑی کرامت نہیں۔ جبکہ ہوا میں تو گندگی پر بیٹھنے والی ایک مکھی بھی اڑ سکتی ہے۔ (۱۲) لہٰذا حق بات یہی ہے کہ سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ انسان اللہ کی رضا کے لیے اس کی مخلوق کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کردے۔ پولس رسول نے کیا خوبصورت بات کہی:

﴿اگر میں آدمیوں اور فرشتوں کی زبانیں بولوں اور محبت نہ رکھوں تو میں ٹھنٹھناتا پیتل یا جھنجھناتی جھانجھ ہوں۔ اور اگر مجھے نبوت ملے اور سب بھیدوں اور کل علم کی واقفیت ہو اور میرا ایمان یہاں تک کامل ہو کہ پہاڑوں کو ہٹادوں اور محبت نہ رکھوں تو میں کچھ بھی نہیں﴾

۱۔کرنتھیوں ۱۳: ۱-۲

اسلام اور مسیحیت نے ہمیشہ اپنے پیروکاروں کو یہی تلقین کی ہے کہ اگر دنیا میں کسی معاملے میں دوسروں پر سبقت لے جانی ہے تو وہ دوسروں کے سامنے کرامات دکھا کر نہیں بلکہ کسی دکھی دل کو سکون پہنچانے میں لے جانی چاہیے۔ نیکی اور محبت کے کاموں میں سبقت لے جانا ہی سب سے بڑی کرامت ہے۔ چنانچہ پولس رسول فرماتے ہیں:

﴿۔۔۔خیرات کے کاموں میں بھی سبقت لے جاؤ﴾ ۲۔ کرنتھیوں ۸: ۷

قرآن مجید نے بھی اس تعلیم کی تصدیق فرمائی ہے:

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ المائدہ ۵: ۴۸

سو تم نیکیوں میں جلدی کرو۔

مولانا ابوالکلام آزاد سورہ فاتحہ کی تفسیر میں کیا خوبصورت اور حق بات لکھتے ہیں کہ:

''خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزری ہے جو انسان چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے، اسے چاہیے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے''۔ (۱۳)

حضور نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہوگئے۔ صحابہؓ نے آپؐ سے عرض کی کہ حضور ﷺ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا ﴿الیست نفساً﴾ کیا وہ انسان نہیں تھا؟ (۱۴)

رحمۃ للعالمین ایک یہودی کے جنازہ کے پاس سے گزرنے پر دنیا کو احترام انسانیت کا سبق سکھانے کے لیے تعظیماً کھڑے ہوگئے اور ایک ہم ہیں کہ غیر مسلم کی بات تو بڑی دور تک، محض علمی معاملہ پر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اپنے ہی بھائی کو نفرت وحقارت سے دیکھنا بھی ''غیرتِ ایمانی'' کا تقاضا سمجھتے ہیں۔

یہ وہ چار بنیادی تصورات ہیں جن کو نظرانداز کر کے کسی بھی حقیقی اور سنجیدہ مکالمہ محبت کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حضور مسیح علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کی سیرتوں کو سمجھنے اور آپ کی سنتوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے خدمت خلق کی توفیق عطا فرمائے اور مسیحی مسلم مکالمہ محبت کے عمل کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا اور قربت کا ذریعہ اور وسیلہ بنائے (آمین)۔

انشاءاللہ وہ دن دور نہیں جب اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سرزمین پر مسیحی مسلم پیروکار اپنے اعتقادی اختلافات کے باوجود پیار اور محبت کی فضا میں آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہتر پاکستان تیار کریں گے۔

﴿حوالہ جات﴾

۱۔امام مسلم نیشاپوریؒ،الصحیح مسلم ، کتاب البر والصلّہ والادب، باب النھی عن ضرب الوجہ
۲۔شاہ عبدالحق محدث دہلوی، اشعۃ اللمعات ج۴،ص۶۰۵
۳۔علامہ سید محمد بن علوی مالکیؒ،نہج السلف، ترجمہ مولانا محمد اکرام اللہ زاہد بعنوان مسلک سلفِ صالحین،ص ۴۵۶،مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور
۴۔سید رضیؒ، نہج البلاغہ،ص۶۹۱ ،مطبوعہ امامیہ پبلی کیشنز لاہور
۵۔ابوالفضل قاضی عیاض مالکی، الشفاء بہ تعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ، مترجم: حضرت سید مفتی غلام معین الدین نعیمی ،مطبوعہ مکتبہ اعلیٰ حضرت، اُردو بازار-لاہور، ایڈیشن ۲۰۰۴ء، جلد اول، فصل ۲۵،ص۱۱۴۴-۱۴۵
۶۔حافظ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، جلد۲،ص۳۵
۷۔صحیح بخاری شریف، کتاب الرقاق، حدیث نمبر۱۴۲۲
۸۔امام ابن تیمیہ، الفرقان بین الاولیاء الرحمن واولیاء الشیطان،ص۲۲،مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی
۹۔ایضاً،ص۳۴
۱۰۔شرح الطحاویہ، ص۵۷۳
۱۱۔مولانا اشرف علی تھانویؒ، شریعت وطریقت، ،ص۳۹۹-۴۰۰، مطبوعہ ادارہ اسلامیات-لاہور
۱۲۔علامہ محمد بن یحییٰ تاذفیؒ، قلائد الجواہر فی مناقب شیخ عبدالقادر گیلانیؒ
۱۳۔مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن ج۱،ص۱۳۸
۱۴۔صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث ۱۲۲۸

﴿باب۴﴾

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بین الاقوامی معاندانہ مہم اور مسیحی مسلم مکالمہ پر اس کے اثرات

☆

ابوجہل نے احمد ﷺ کو دیکھا اور کہا ''تو بدصورت ہے جو بنی ہاشم میں پیدا ہوا''۔احمد ﷺ نے فرمایا ''تو سچ کہتا ہے۔اگر چہ کہ تو بیہودہ گو ہے''۔حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کو دیکھا اور کہا اے آفتاب کہ تو خوب روشن ہے۔تیرے جیسا کوئی نہ مشرق میں ہے اور نہ مغرب میں۔انہوںؓ نے فرمایا ''اے عزیز تو نے سچ کہا کیونکہ تو اس ناچیز دنیا سے آزاد ہے۔حاضرین نے پوچھا اے سرورِ عالم آپ نے تو دو متضاد باتیں کہنے والوں کو سچا کہا۔ ایسا کیوں؟

آپ ﷺ نے فرمایا میں ایک نہایت صاف آئینہ ہوں تُرک اور ہندوستانی مجھے وہی دیکھے گا جو وہ خود ہے جس کے منہ کے سامنے آئینہ ہو وہ اچھے اور بُرے کو اس میں دیکھے گا۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ
﴿مثنوی، دفترِ اوّل﴾

مغرب میں اسلام کے خلاف چلنے والی تحریک کی وجوہات کو سمجھنے کے لیے ہمیں مغربی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ لینا ہوگا کہ اس تحریک کے بیج کس نے بوئے اور اس کے اثرات کس کس طرح سے تاریخ میں پھیلائے گئے۔ ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کی تحریک کو صیہونی یہودی اور مسیحیوں نے اس شدت کے ساتھ پروان چڑھایا کہ دیکھنے والے یوں محسوس کرتے ہیں کہ شاید دنیا کی سب برائیوں کی جڑ اسلام ہی ہے۔ آیئے مغرب کے ان رویوں کے اسباب جاننے کے لیے تاریخ کا ایک مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

یوحنا دمشقی اور مسیحی مسلم مناظراتی مکالمہ کا آغاز

یوں تو عہد رسالت مآب ﷺ میں ہی اسلام کا دیگر مذاہب بالخصوص مسیحیت کے ساتھ تبلیغی بنیادوں پر مکالمہ شروع ہوگیا تھا مگر نفرت وتعصب کی بنیادوں پر مناظراتی لٹریچر کا باقاعدہ آغاز مسیحی عالم دین یوحنا دمشقی نے شروع کیا۔

یوحنا دمشقی (۶۷۶ء-۷۴۹ء) میں دمشق کے ایک مسیحی خاندان میں پیدا ہوا۔ یوحنا دمشقی کا عربی نام یحییٰ ابن منصور تھا۔ اسلامی حکومت میں مسیحی ہونے کے باوجود اس کا والد خلیفہ عبدالمالک کے دربار میں اعلیٰ عہدہ دار تھا اور پورے شام کے علاقے کے محصول کا سربراہ تھا۔ یوحنا دمشقی ایک ماہر فلکیات، ریاضی دان، ماہر موسیقی اور مسیحی علم الٰہیات کا اپنے وقت میں ایک مستند عالم سمجھا جاتا تھا۔ یہ امیر معاویہؓ اور ان کے بیٹے یزید کا ہم عصر تھا۔ دمشق کا مالی انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس منصب پر خلیفہ ہشام کے زمانے تک فائز رہا۔

یوحنا نے کئی موضوعات پر لکھا۔ اُس کی ایک قابل ذکر تصنیف ''بدعتوں کے متعلق'' ہے جس کے سوویں (۱۰۰) باب میں اُس نے ''اسماعیلیوں (مسلمانوں) کی بدعت'' کے عنوان کے تحت پیغمبر اسلام، اسلام اور قرآن کے حوالے سے غیر عالمانہ طرز تحریر اختیار کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت سارہ علیہا السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بت پرست قرار دیا اور نبی کریم ﷺ کو جھوٹا نبی قرار دیتے ہوئے قرآن کو ایک مضحکہ خیز کتاب کہا (نعوذ باللہ)۔ پھر قرآن مجید کی اکثر آیات پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے ایک من گھڑت کتاب قرار دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اسلام درحقیقت وہ بدعت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے ایک مسیحی راہب سے مل کر عہد نامہ قدیم وجدید کی تعلیمات کی بنیاد پر ایجاد کیا۔

یوحنا دمشقی ۵ دسمبر ۷۴۹ء میں یروشلم کی مارسبا خانقاہ میں مشرق کی کلیسا کے ایک اہم عالم کی حیثیت سے انتقال کر گیا۔ مشرقی آرتھوڈوکس کلیسا اُسے ''ولی اللہ'' کا درجہ دیتی ہے۔ کیتھولک کلیسا نے ۱۸۸ء میں اُسے کلیسا کے ایک اہم عالمِ دین کی حیثیت دینے کا اعلان کیا۔ یوحنا دمشقی کے شاگرد بشپ تھوڈور ابوقرہ نے بھی مسلمانوں کے خلاف مناظرانہ انداز میں متعدد مکالمات قلمبند کیے۔

قرطبہ کے مسیحی شہدا اور توہین رسالت کی منظم تحریک

تاریخ اندلس کا اسلامی عہد مذہبی نوعیت کے ظلم و ستم سے قطعاً پاک ہے، سوائے تین چار مسیحیوں کے جنہوں نے اپنی جانیں فی الحقیقت اپنے مذہب کی خاطر قربان کیں۔ اسلامی حکومت کے سارے عہد میں اگر ہمیں کوئی ایسا واقعہ نظر آتا ہے جسے مذہبی نوعیت کے جور و تعدی سے کوئی مشابہت ہو سکتی ہے، تو وہ سخت قوانین ہیں جن کو اسلامی حکومت نے محض اس لئے نافذ کیا تھا کہ ان سے اس مذہبی جنون کو دبانا مقصود تھا جو نویں صدی میں قرطبہ میں اٹھا تھا۔ اس زمانے میں قرطبہ کے مسیحیوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس کے ساتھ ملک کے دیگر مسیحیوں کو بظاہر کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس جماعت نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ اسلام کے خلاف نازیبا کلمات استعمال کرتے تھے۔ اس بدکلامی سے ان کی نیت یہ ہوتی تھی کہ اپنی مذہبی عصبیت کا بے جا اظہار کر کے اپنے آپ کو سزائے موت کا مستوجب بنائیں۔

اپنے آپ کو قربان کرنے کا عجیب و غریب جذبہ بیشتر پادریوں، راہبوں اور راہبات میں ۸۵۰ء کے درمیان پیدا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی خانقاہوں کی خاموشی میں مسیحی سلطنت کے زوال اور مذہبی جذبے کے انحطاط پر غور کر کے رنجیدہ خاطر ہوتے تھے اور پھر اسی عالم حزن میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور شہادت کا تاج پہننے کے لئے اسلام اور بانی اسلام پر تیز و تند حملے کرتے تھے۔ یہ وہ تاج شہادت تھا جس سے مسلمان حکمرانوں کی بے تعصبی اور مذہبی رواداری ان کو محروم کر دیتی تھی۔

راہب پرفیکٹس کا واقعہ

۸۵۰ء میں ایک راہب پرفیکٹس (Perfectus) اندلس کے دارالحکومت قرطبہ کے بازار میں خریداری کے لئے گیا۔ یہاں اسے عربوں کا ایک گروہ ملا۔ بات چیت کے دوران اس سے پوچھا گیا کہ اس کے خیال میں حضرت محمد ﷺ اور یسوع مسیح علیہ السلام میں سے کون بڑا پیغمبر ہے؟ پرفیکٹس سمجھ گیا کہ یہ چکرا دینے والا سوال تھا۔ اگر وہ حضرت محمد ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو یہ مسلم حکومت کی نظر میں ایک سنگین جرم تھا۔ سو اس نے نہایت احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ بات چلتی رہی۔ تب

اچانک وہ اٹھا اور ایک عرب کو طمانچہ مارا اور حضرت محمد ﷺ پر دھوکے بازی اور جنسی بے راہ روی کا شکار ہونے اور مسیحیت کے دشمن جیسے الزامات لگائے (نعوذ باللہ) اسے فوراً پکڑ لیا گیا۔

جب پرفیکٹس جیل میں پہنچا تو سخت خوف زدہ تھا۔ قاضی نے اسے سزائے موت نہ دینے کا فیصلہ کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے اسے اشتعال دلایا تھا جس کی وجہ سے اس سے ایسی حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن چند دن بعد اس پر پھر سے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کا دورہ پڑا اور اس نے ایسے بیانات دیئے کہ قاضی کے پاس اسے سخت ترین سزا دینے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ بچا۔ اس راہب کو سزائے موت دے دی گئی۔ (۱)

اس طرح کا واقعہ قرطبہ میں معمول سے ہٹ کر تھا جہاں مسلمان اور مسیحی اچھے تعلقات سے مل کر زندگی گزار رہے تھے۔ یہودیوں کی طرح مسیحیوں کو بھی اپنے مذہبی فرائض کی بجا آوری کی مکمل آزادی حاصل تھی جس پر اہل ہسپانیہ فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ وہ ایسے مہذب معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں مذہبی رواداری موجود ہے۔ انہیں عام طور پر ''مستعربین (Mozaribs)'' کہا جاتا تھا۔

مستعربین (Mozaribs)

سپین کے مسیحی جو اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہتے تھے (اور جنہوں نے عربوں کے اصول و آداب اختیار کر لئے تھے) مستعرب کہلاتے تھے۔ اس لفظ سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اس زمانے کے مسیحیوں کا میلانِ خاطر کس طرف تھا۔ عربی زبان نے ملک بھر میں بہت جلد لاطینی کی جگہ لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس زبان میں مسیحیوں کا علم دین مدون تھا اس کو مسیحی رفتہ رفتہ بھولنے لگے اور اس کی طرف سے غفلت کرنے لگے، حتیٰ کہ کلیسا کے بعض بلند مرتبہ عہدے دار بھی صحیح لاطینی سے ایسے نابلد ہو گئے کہ ان پر اہل علم کو ہنسی آتی تھی۔ ان حالات میں عوام الناس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس معاملے میں وہ ارباب کلیسا سے زیادہ سرگرمی دکھائیں گے۔ چنانچہ ۸۵۴ء میں سپین کے ایک مصنف یعنی [illegible] کے بشپ الوارد (Alvaro) نے اپنے مسیحی ہم وطنوں کی ذیل کے الفاظ میں شکایت کی ہے:

> ''جب ہم مسلمانوں کے شرعی احکام کی تحقیق کرتے ہیں اور ان کے حکما (بلکہ حمقاء) کے طبقات کے مطالعے کے لئے جمع ہوتے ہیں (ان کی ضلالتوں کی تردید کی غرض سے نہیں بلکہ ان کی زبان کی لطافت اور اس کی فصاحت و بلاغت سے محظوظ ہونے کے لئے) تو ہم اپنی مقدس کتابوں سے غافل ہو گئے ہیں اور پرستش کے لئے ایک حیوان کو اپنا بت بنا رہے ہیں (مکاشفہ ۱۳: ۱۸)۔ اب مسیحیوں میں ایسے ذی علم کہاں ہیں جو مقدس کتابیں پڑھنے

میں انہاک رکھتے ہوں اور لاطینی علمائے دین کی کتابوں پر نگاہ ڈالنے کی پروا کرتے ہوں؟ کون ہے جو انجیلوں یا انبیاء اور رسولوں کی کتابوں کو پڑھنے کا شوق رکھتا ہو۔ ہمارے مسیحی نوجوان جو اطوار کی شستگی اور چرب زبانی سے متصف ہیں، اپنے لباس اور چال ڈھال کی نمائش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے علوم میں شہرت رکھتے ہیں۔ وہ عربی بلاغت کے نشے میں سرشار ہیں۔ اور مسلمانوں کی کتابوں کو اٹھاتے ہیں اور بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں ان پر بحث کرتے ہیں اور ان کی تعریف وتوصیف میں علم خطابت کے سارے صنائع و بدائع صرف کر دیتے ہیں اور ان کا خوب چرچا کرتے ہیں، لیکن وہ کلیسا کی کتابوں کی خوبیوں سے قطعاً ناآشنا ہیں اور کلیسا کے چشموں کو جن کا منبع بہشت ہے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

افسوس! مسیحی لوگ اپنی شریعت سے ایسے ناواقف ہیں اور لاطینی لوگ اپنی زبان سے ایسے بے پروا ہو گئے ہیں کہ تمام مسیحی امت میں ہزار اشخاص میں سے بمشکل ایک شخص ایسا ملے گا جو لاطینی زبان میں اپنے کسی دوست کو مزاج پرسی کا ایک خط بھی لکھ سکے، البتہ ایسے مسیحی بے شمار ہیں جو عربی زبان کے رنگین جملے بڑے طمطراق سے بولتے ہیں بلکہ وہ نظم بھی لکھ سکتے ہیں جس کا طرز شعر ردیف کے با یک ہی حرف پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ان کے حسن خیال کی علیٰ پرواز کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے لکھنے میں وہ عربوں سے بھی بڑھ کر وزن اور بحر کی پابندی کرتے ہیں''۔(۲)

فی الواقعہ لاطینی زبان کے علم کو سپین کے ایک حصے میں اس قدر تنزل ہوا کہ سپین کے کلیسا کے قدیم قوانین اور بائبل کو مسیحیوں کے مطالعے کے لئے عربی میں ترجمہ کرنا پڑا۔

عربوں کے شان دار ادب نے سپین کے مسیحیوں پر ایسا جادو کر رکھا تھا کہ [illegible]بی زبان کو بڑے ذوق وشوق سے دیکھتے تھے مگر (اس کے برعکس) جو لوگ مسیحی لٹریچر کی تحصیل کرنا چاہتے تھے ان کے لئے تعلیم کا سامان اس سے زیادہ میسر نہ تھا جتنا کہ قوطیوں کی وحشی قوم کی تربیت کے لئے مستعمل ہوا تھا۔ تہذیب و تمدن کی اس ادنیٰ درجے کی تعلیم کے لیے بھی ان کو معلم بہ مشکل ملتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا مسیحی معلموں کی تعداد میں کمی آتی گئی۔ چنانچہ ۱۱۲۵ء میں مستعربین مسیحیوں نے الفانسو شاہ ارغون کو لکھا کہ:

ہمارے اور ہمارے آباؤ اجداد کی نشوونما آج تک غیر مسیحی اقوام کے درمیان ہوئی ہے۔ بپتسمہ لینے کے بعد ہم لوگ اپنے مذہب کے احکام کی آزادی سے پیروی کرتے ہیں، لیکن

ہمیں آج تک اس بات کا مقدور نہیں ہوا کہ ہم اپنے خدائی مذہب کی پوری تعلیم حاصل کر سکیں۔ چونکہ ہم کفار (مسلمانوں) کے محکوم ہیں جنہوں نے ہمیں مدت سے دبا رکھا ہے اس لئے ہمیں اس بات کی جرات نہیں ہوئی کہ ہم رومہ یا فرانس سے معلم طلب کرتے۔ اور یہ معلم ازخود ہمارے پاس اُن کافروں (مسلمانوں) کی جہالت کے خوف سے کبھی نہیں آئے جن کے ہم زیر نگین ہیں۔ (۳)

اسحٰق راہب کا واقعہ

پرفیکٹس کی طرح ایک اور راہب، جس کا نام اسحٰق تھا، قاضی کے پاس آیا اور یہ اظہار کیا کہ وہ دین اسلام کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جس وقت قاضی نے رسول خدا ﷺ کی تعلیمات اس کے سامنے بیان کیں تو راہب کڑک کر بولا:

> اس نے تم سے جھوٹ کہا ہے (خدا کی لعنت اس کو تلف کرے)۔ وہ خباثت سے بھرا پڑا تھا جس نے اتنے لوگوں کی ہلاکت کی طرف رہنمائی کی اور اس نے اپنے ساتھ ان کو بھی قعر جہنم کا سزاوار بنایا۔ وہ شیطنت سے پر تھا اور شیطانی شعبدے دکھا کر اس نے تم کو مہلک شراب کا پیالہ دیا اور مرض میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنے گناہ کے بدلے ابدی عذاب اٹھائے گا۔ جب تم فہم اور عقل رکھتے ہو تو پھر اپنے تئیں ان خطروں سے کیوں نہیں بچاتے اور اس کے وبائی عقیدوں کے ناسور کو چھوڑ کر تم کیوں دین مسیح کی انجیل سے ابدی نجات تلاش نہیں کرتے؟ (۴)

قاضی نے یہ تصور کرتے ہوئے کہ شاید یہ نشے میں ہے، اسے طمانچے رسید کئے لیکن اسحاق نے گستاخ کلامی جاری رکھی حتیٰ کہ قاضی نے اسے توہین رسالت کے جرم میں موت کی سزا سنائی۔

نویں صدی کے قرطبہ میں مسلمان پُراعتماد اور طاقت ور تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان مذہبی جنونیوں کو موت کی سزا دینے میں مسلسل ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ جانتے تھے یہ لوگ اپنے حواس میں نہیں تھے کہ ان سے کسی معقول رویے کی توقع کی جا سکے، لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آہستہ آہستہ ان شہدا کا ایک گروہ پیدا ہو رہا ہے جو امن عامہ اور معاشرتی استحکام کے لئے نہایت مضر ہے۔

قرطبہ میں قاضی اور امیر دونوں ہی اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ پرفیکٹس اور اسحاق کو سزائے موت دی جائے لیکن اسلامی قونین کی خلاف ورزی کی بھی کسی کو اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

اسحاق کی موت کے چند دن بعد اسی کی خانقاہ سے راہبوں کا ایک گروہ قاضی کے سامنے پیش ہوا اور توہین رسالت کا ارتکاب کیا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ایک مسیحی مسجد میں زبردستی گھس آیا اور وہاں دین اسلام کی مذمت کی اور کہا کہ اسلام بہت جلد اپنے پیروؤں پر نار جہنم کی تباہی لائے گا۔ اُس برس پچاس افراد کو سزائے موت دی گئی۔(۵)

ان شہداء کی قرطبہ کے بشپ اور موضربوں دونوں نے ہی مذمت کی کیونکہ وہ ایسے ہی شہدا کے جارحیت پسند گروہ کی پیدائش کے آثار دیکھ رہے تھے۔ شہداء کی اس برادری کو دو نہایت موثر حمایتی ملے، پادری یولوجیو(Eulogio) اور پاؤل الوارو(Alvaro)۔ دونوں نے ہی یہ موقف اختیار کیا کہ یہ شہدا ''خدا کے سپاہی'' تھے اور اپنے عقیدے کے تحفظ کے لئے جہاد کر رہے تھے۔ اس نئی تحریک پر گرفت کرنا مسلمانوں کے لئے خاصا دشوار تھا کیونکہ اس سے حالات سنگین سے سنگین تر ہوئے۔ کیرن آرم سٹرانگ لکھتی ہیں:

> ان شہدا کا تعلق معاشرے کے تمام طبقات سے تھا: عورتیں اور مرد، راہب، پادری، عام شہری اور مسیحی علماء دین۔ ان میں سے زیادہ تر وہ تھے جو کسی واضح مغربی تشخص کی جستجو میں مبتلا تھے۔ تاہم کچھ ایسے بھی تھے جو مسلمان اور عیسائی والدین کی اولاد تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے کہ جو عیسائی ہونے کے باوجود اس حد تک اسلامی تہذیب کا حصہ بن چکے تھے کہ ان کے نام اسلامی تھے۔ اپنی تہذیبی جڑوں سے دوری ایسا تلخ تجربہ ہے جو ہم جانتے ہیں کہ آج بھی متشدانہ ردعمل کا باعث بن سکتا ہے۔ انہی واقعات کی روشنی میں ہم ان علاقوں کے مسلمانوں کے متشدانہ رویوں کی تفہیم کر سکتے ہیں جہاں مغربی تہذیب نے ان کے تہذیبی تشخص کو خطرے میں ڈالا اور انہیں ذہنی انتشار کا شکار کیا۔ بہرحال یولوجیو اور الوارو کی حمایت میں جاری ہونے والی شہدا کی تحریک کی مسلمانوں نے ہی نہیں بلکہ مستغربین نے بھی سخت مخالفت کی۔(۶)

یولوجیو ایک قریبی مسیحی ریاست پامپلونا گیا اور وہاں سے مغربی حکما کی کتابیں اپنے ساتھ لایا جن میں ورجل اور جیووینل جیسے کلیسیا کے اماموں کی تحریریں شامل تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ مسیحیوں کے عرب تہذیب میں ضم ہو جانے کے عمل کو روکا جائے۔ وہ عربوں کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے یہاں لاطینی ادب اور تہذیب کا احیائے نو کرنا چاہتا تھا۔ تاہم یہ تحریک تب ختم ہوگئی جب یولوجیو کو قاضی نے موت کی سزا سنائی۔ اسے کہا گیا تھا کہ اگر وہ اسلام کے خلاف اپنی کارروائیوں سے باز آ جائے اور دوسرے،

احمقوں اور بیوقوفوں، کی طرح اپنی ہلاکت کا سامان نہ کرنے تو اس کی جان بخشی کر دی جائے گی اور آئندہ اس کے خلاف کوئی کاروائی عمل میں نہیں لائی جائے گی مگر وہ نہیں مانا اور جلاد سے بولا کہ اپنی تلوار تیز کرے(۷)۔

کلیسا کی اعتدال پسند جماعت

کلیسا کے اندر جو اعتدال پسند جماعت تھی اس نے اسلامی حکومت کی کوششوں میں اعانت کی اور بشپوں نے ان مذہبی دیوانوں کو مسیحی برادری سے خارج کر دیا۔ ارباب کلیسا کی ایک مجلس نے جو اس معاملے پر غور کرنے کے لئے ۸۵۲ء میں منعقد ہوئی تھی اس تحریک کو دبانے کے لئے چند تجاویز پر اتفاق کیا۔ چنانچہ ان پر عمل کرنے سے اس تحریک کو آخر کار کچل دیا گیا۔ بعد کے زمانے میں ایسی شہادت کے ایک یا دو متفرق واقعات کا ذکر آیا ہے۔ سب سے آخری واقعہ ۹۸۳ء میں ظہور پذیر ہوا مگر اس کے بعد جب تک عربوں کی حکومت اندلس میں رہی، دوسرا کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔

ہسپانیہ کے اسلامی دور حکومت میں یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد واقعہ تھا جس کی مثال اس سے پہلے وہاں نہیں ملتی۔ خدائے مطلق کو ماننے والے تینوں مذاہب کے لوگ یعنی یہودی، مسیحی اور مسلمان کوئی چھ سو سال تک امن و آشتی کی کیفیت میں ایک ہی سلطنت میں شیر و شکر رہے۔ یہودی جنہیں یورپ بھر میں جانوروں کی طرح ہلاک کیا جا رہا تھا، یہاں مساوی حقوق کے حامل شہری کی حیثیت سے اعلیٰ تہذیبی زندگی گزار رہے تھے۔ تاہم قرطبہ میں مسیحی شہدا کی تحریک ایک خاص رویے کی غمازی کرتی ہے جو آئندہ برسوں میں یورپ بھر میں عام ہوا۔

کتاب مکاشفہ، اسلام اور مسلمان

آج امریکہ کے صہیونی یہودی اور صہیونی مسیحی مبلغین کا یہ عام عقیدہ ہے کہ اسلام کے ظہور کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ یہ دجال کی آمد کا اعلان ہے۔ دجال کا کردار مسلمان اور مسیحی مذہب میں سب کو معلوم ہے۔ اس کا ذکر عہد نامہ جدید میں آیا ہے کہ وہ روز قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا اور دنیا میں حکومت کرے گا۔ پولس رسول لکھتے ہیں:

> ﴿اے بھائیو! ہم اپنے خداوند یسوع مسیح کے آنے اور اُس کے پاس اپنے جمع ہونے کی بابت تم سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ کسی روح یا کلام یا خط سے جو گویا ہماری طرف سے ہو یہ سمجھ کر کہ خداوند کا دن آ پہنچا ہے تمہاری عقل دفعتہً پریشان نہ ہو جائے اور نہ تم گھبراؤ۔

کسی طرح سے کسی کے فریب میں نہ آنا کیونکہ وہ دن نہیں آئے گا جب تک کہ پہلے برگشتگی نہ ہو اور وہ گناہ کا شخص یعنی ہلاکت کا فرزند ظاہر نہ ہو۔ جو مخالفت کرتا ہے اور ہر ایک سے جو خدا یا معبود کہلاتا ہے اپنے آپ کو بڑا ٹھہراتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے مقدس میں بیٹھ کر اپنے آپ کو خدا ظاہر کرتا ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ جب میں تمہارے پاس تھا تو تم سے باتیں کہا کرتا تھا؟۔ اب جو چیز اُسے روک رہی ہے تا کہ وہ اپنے خاص وقت پر ظاہر ہو اُس کو تم جانتے ہو۔ کیونکہ بے دینی کا بھید تو اب بھی تاثیر کرتا جاتا ہے مگر اب ایک روکنے والا ہے اور جب تک کہ وہ دور نہ کیا جائے روکے رہے گا۔ اُس وقت وہ بے دین ظاہر ہوگا جسے خداوند یسوع اپنے منہ کی پھونک سے ہلاک اور اپنی آمد کی تجلی سے نیست کرے گا۔ اور جس کی آمد شیطان کی تاثیر کے موافق ہر طرح کی جھوٹی قدرت اور نشانوں اور عجیب کاموں کے ساتھ۔ اور ہلاک ہونے والوں کے لئے ناراستی کے ہر طرح کے دھوکے کے ساتھ ہوگی اس واسطے کہ انہوں نے حق کی محبت کو اختیار نہ کیا جس سے اُن کی نجات ہوتی۔ اسی سبب سے خدا اُن کے پاس گمراہ کرنے والی تاثیر بھیجے گا تا کہ وہ جھوٹ کو سچ جانیں۔ اور جتنے لوگ حق کا یقین نہیں کرتے بلکہ ناراستی کو پسند کرتے ہیں وہ سب سزا پائیں ﴾

۲ تھسلنیکیوں ۲:۱ تا ۱۲

اسلام مخالف پادری پولوس رسول کے اس اقتباس میں ''ہلاکت کا فرزند'' سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات مراد لیتے ہیں (نعوذ باللہ) اور اسلام اور اسلامی تعلیمات کو دجالی فتنہ قرار دیتے آئے ہیں۔

کتاب مکاشفہ میں بھی ایک حیوان کا ذکر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پوری دنیا پر اپنی حکومت قائم کرے گا:

﴿ پھر میں نے اُس حیوان اور زمین کے بادشاہوں اور اُن کی فوجوں کو اُس گھوڑے کے سوار اور اس کی فوج سے جنگ کرنے کے لئے اکٹھے دیکھا۔ اور وہ حیوان اور اس کے ساتھ وہ جھوٹا نبی پکڑا گیا جس نے اس کے سامنے ایسے نشان دکھائے تھے جن سے اس نے حیوان کی چھاپ لینے والوں اور اس کے بُت کی پرستش کرنے والوں کو گمراہ کیا تھا۔ وہ دونوں آگ کی اُس جھیل میں زندہ ڈالے گئے جو گندھک سے جلتی ہے۔ اور باقی اُس گھوڑے کی سوار کی تلوار سے جو اس کے منہ سے نکلتی تھی قتل کئے گئے اور سب پرندے اُن کے گوشت سے سیر ہو گئے ﴾ مکاشفہ ۱۹:۱۹-۲۰

اس حیوان کی ذات کے ساتھ 666 کے ہندسے کا حوالہ دیا جاتا ہے:

﴿ جو سمجھ رکھتا ہے وہ اس حیوان کا عدد گن لے کیونکہ وہ آدمی کا عدد ہے اور اُس کا عدد چھ سو چھیاسٹھ ہے۔ ﴾ مکاشفہ ۱۳:۱۸

اس عبارت میں بھی حیوان سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ اور دین اسلام کو لیا جاتا ہے۔ (معاذ اللہ) مثلاً وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے 638ء میں یروشلم پر قبضہ کیا۔ انہوں نے مندر والے پہاڑ پر دو شاندار مسجدیں تعمیر کرائیں۔ جس طرح مسلمان پے در پے فتوحات حاصل کر رہے تھے اس سے صاف لگتا تھا کہ جلد ہی پوری دنیا میں ان کی بادشاہت قائم ہو جائے گی۔ ایسی صورت کا خیال ہے کہ یسوع مسیح علیہ السلام کے بعد کسی نبی یا شریعت کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی صورت میں اسلام کا ظہور سراسر غیر ضروری تھا۔ (۸)

نبی کریم کی ذاتِ اقدس: مغربی تشخص کے لئے ایک خطرہ

کیرن آرم سٹرانگ لکھتی ہیں کہ اصل میں اس دور میں پیغمبر اسلام کی ایک غلط واقعات پر مبنی سوانح عمری کا یورپ میں بہت چرچا تھا۔ یہ سوانح عمری آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی تھی۔ اس کا مصنف بھی کوئی مغربی پادری تھا اور اس کتاب کو پامپلونا کے قریب ایک خانقاہ میں تیار کیا گیا تھا۔ اس سوانح عمری نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں مغریب عیسائی دنیا میں پھیلائیں۔ تاہم اس کتاب کے عام ہونے سے دو طرح کے سوالات عام ہوئے:

خدا تعالیٰ نے ایسے کھلے اور جھوٹے مذہب کو کیوں پھلنے پھولنے دیا؟

اور یہ کہ کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں کو فراموش کر بیٹھا ہے؟

قرطبہ کے شہداء نے جو توہین رسالت کا ارتکاب کیا تو اس کی بنیاد بھی یہی سوانح عمری بنی۔ اس کتاب میں واضح اور سخت الفاظ میں نبی کریم کو جھوٹا قرار دیا گیا اور اسلام کو بے بنیاد مذہب کہا گیا تھا جس نے دنیا کو دھوکہ دیا۔ اسی کتاب میں اسلام پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ اسلام تلوار کی نوک پر پھیلا! لوگوں کو بزور مسلمان بنایا گیا۔ اس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ اسلام کی اپنی کوئی علیحدہ شناخت اور حیثیت نہیں ہے۔ یہ عیسائیت ہی کی ایک بدعتی شکل ہے۔ (۹)

اس واقعہ سے 250 سال بعد جب یورپ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا عالمی منظر نامے میں نمایاں ہو رہا تھا، مسیحی حکماء نے اسی آٹھویں صدی میں تیار کی گئی حضرت محمد ﷺ کی سوانح عمری کی تفصیلات کی

ازسرنو صرحت کا سلسلہ شروع کیا۔ سنجیدہ محققین نے حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ سے متعلق اصل تفصیلات اکٹھی کرنے اور اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن عمومی سطح پر مذکورہ بالا سوانح عمری کے اثرات جوں کے توں قائم رہے۔ یوں آہستہ آہستہ نبی کریم کی ذات مغربی تشخص کے لئے ایک خطرہ بن گئی۔ وہ ان کے لئے ہر اس شے کی ترجمان تھی جسے وہ رد کرتے تھے۔ اس سوانح عمری کے اثرات آج بھی قائم ہیں۔ آج بھی اہل مغرب میں یہ تصور عام ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے مذہب کی طاقت کے ذریعے دنیا کو تسخیر کرنے کی کوشش کی۔ یا یہ کہ اسلام ایک تشدد پسند مذہب ہے جو تلوار کی نوک پر پھیلا۔ یہ تصورات اس کے باوجود ہنوز موجود ہیں کہ مغربی علماء اور محققین نے اسلام اور پیغمبر خدا کی ذات کے حوالے سے معروضی تحقیق پر مبنی کتابیں تصنیف کی ہیں جو اسلام کے بارے میں اہل مغرب کی بیشتر غلط فہمیوں کو رد کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

صلیبی جنگوں کا آغاز

گیارہویں صدی کے اختتام تک یورپ میں پوپ کے زیر تحت پھر سے غلبہ پانے کی لہر بیدار ہوئی اور لوگ اسلامی سلطنت کی حدود کو مختصر کرنے کے لئے متحدہ ہونا شروع ہوئے۔ 1061ء میں نارمن قوم نے جنوبی اٹلی اور سسلی میں مسلمان ریاستوں پر حملے شروع کئے اور 1091ء میں ان علاقوں پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ شمالی سپین کے عیسائیوں نے بھی ان علاقوں کی بازیابی کے لئے اندلس کے مسلمانوں کے خلاف عسکری یوشیں شروع کر دی تھیں۔ 1085ء میں وہ تولیدو پر تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ 1095ء میں پوپ اربن دوم نے یورپ کے فرمانرواؤں کو حکم دیا کہ وہ ایک جھنڈے تلے اکٹھے ہو کر مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہو جائیں اور یروشلم میں واقع یسوع مسیح علیہ السلام کی ذات سے منسوب مقدس مقامات کو ان کے تسلط سے آزاد کرائیں۔ یوں صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا۔ 1099ء میں جنگوں کے ایک خونریز سلسلے کے بعد مسیحی فوجیں یروشلم میں داخل ہونے میں کامیاب ہوئیں اور وہاں اولین مغربی کالونیوں کی بنا رکھی گئی۔

مغربی ممالک کی فوجوں کی اس کامیابی نے اسلام کے خلاف ایک مستقل جنگ کی بنا رکھی۔ ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ فتوحات حاصل کرنا اور پاپائی یورپ کی حدود کو زیادہ سے زیادہ علاقے میں پھیلانا تھا۔ پہلی صلیبی جنگ کے موقع پر ترتیب دیا جانے والا، رولینڈ کا گیت، سن کر اس تلخ حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ تب وہ لوگ اسلامی عقیدے کی اساس اور روح سے قطعی نابلد تھے۔ اس گیت میں بتایا گیا ہے کہ شارلیمان اور رولینڈ کے دشمن مسلمان اصنام پرستی میں مبتلا ہیں۔ وہ تین دیوتاؤں اپالو، ترویگنٹ اور

حضرت محمد ﷺ کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ خون آشامی کے دلدادہ سپاہی ہیں جن کے لئے سب سے اعلیٰ لذت جنگ کے دوران قتل و غارت گری کرنا ہے۔ پہلی صلیبی جنگ کے موقع پر جب ایشیائے کوچک میں مسیحی فوجیں ترکوں سے ٹکرائیں تو ان کے دلوں میں ترک سپاہیوں کی بہادری کا خوف موجود تھا۔

کوئی چاہے کتنا ہی آزمودہ کار اور صاحب علم ہو، ترک سپاہیوں کی جرات مندی اور طاقتوری کو بیان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھ سکتا جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنے تیروں کی طاقت سے فرینکس کی فوجوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیں گے۔ ویسے ہی جیسے انہوں نے عرب، آرمینی، شامی اور یونی فوجوں کے ساتھ کیا تھا، لیکن اے خداوند ہمارے سپاہیوں کو ان کی بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اور یہ کہ ان کی طرح وہ بھی راج کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے اور کوئی اسے رد نہیں کر سکتا کہ اگر وہ ایک خدا اور اس کے بیٹے پر ایمان مضبوط رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان سے زیادہ نڈر، جانباز اور مشاق سپاہی کوئی اور نہیں ہو گا۔ پھر خدا کی رحمت سے وہ ترک فوجیوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ (۱۰)

یروشلم میں مسلمانوں کا قتل عام

معروف مسیحی مصنف کیرن آرمسٹرانگ اپنی کتاب ''یروشلم: ایک شہر تین مذاہب'' میں لکھتی ہیں:

تین دن تک صلیبی مجاہدین نے یروشلم میں منظم انداز میں قتل عام کیا۔ تیس ہزار کے قریب شہری تہ تیغ ہوئے۔ گیستا فرینکورم کا مصنف لکھتا ہے کہ انہوں نے نظر آنے والے ہر ترک اور مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ کسی مرد یا عورت کو نہ بخشا گیا۔ 10 ہزار مسلمان مسجد اقصیٰ کی چھت پر پناہ لئے ہوئے تھے۔ ان کو چن چن کر قتل کیا گیا۔ اسی طرح یہودیوں کو ان کے صلواۃ میں گھیر کر موت کی وادی میں اتار دیا گیا۔ شہر کے مقامی باشندوں میں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شہریوں کو ختم کرنے کے بعد ان کی املاک پر قبضہ کرنے کی دوڑ شروع ہوئی۔ جو سپاہی یا افسر سب سے پہلے جس گھر میں داخل ہو جاتا وہ بلا شرکت غیرے اس کا مالک بن جاتا۔ قابض ہونے والوں میں نہ تو کسی امیر غریب کی تمیز تھی اور نہ قبضہ میں لئے جانے والی دکان، مکان یا محل کا کوئی امتیاز تھا۔ گلیاں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ سروں، ہاتھوں اور اعضائے جسمانی کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ اس بربریت کا چشم دید گواہ اگیولیس کا ریمنڈ انتہائی تفاخر کے ساتھ تفصیلات بتاتا ہے۔ اسے اس وحشیانہ پن پہ کوئی شرمساری محسوس

نہیں ہوتی۔ وہ پوری ڈھٹائی سے لکھتا ہے: ''قتل عام عیسائیت کی فتح کی علامت اور حرم پر اس کا مظاہرہ ایک بھرپور ثبوت تھا۔ اگر میں آپ کو سچ بتا دوں تو آپ یقین نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ میں یہی بتانے پر اکتفا کروں گا کہ معبد میں اور ہیکل سلیمانی (مسجد عمر) کی ڈیوڑھی میں سوار ہو کر جانے والے صلیبیوں کے گھوڑوں کے گھٹنے اور زینوں کی رکابیں خون میں ڈوب گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے احتساب اور انصاف کا یہ ایک علیشان مظاہرہ تھا۔ وہ جگہ کافروں (مسلمانوں) کے خون سے لبریز ہوگئی جہاں ایک طویل عرصہ سے خدا کی توہین ہوتی رہی تھی۔'' (۱۱)

کیرن مزید لکھتی ہیں:

شہر مقدس کو یہودیوں اور مسلمانوں سے حشرات الارض کی طرح صاف کر دیا گیا۔ آخر کار وہاں قتل ہونے کے لئے کوئی نہ بچا۔ عیسائی مذہبی جلوس کی صورت میں حمد و ثنا کے گیت گاتے ہوئے ''حیات نو'' میں گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ مرقد مسیح کے گرد جمع ہو کر انہوں نے حیات نو کی آیات پڑھیں۔ ان کی مذہبی رسوم نئے دور کی نقیب محسوس ہو رہی تھیں۔ ریمنڈ لکھتا ہے: ''یہ دن، میرے خیال میں، آنے والے تمام ادوار میں سب سے زیادہ شہرت کا حامل رہے گا۔ کیونکہ اس نے ہمارے دکھوں اور مصیبتوں کو سرور و انبساط میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج کا دن مسیحیت کے حق بجانب ہونے اور کفر (اسلام) کی تکذیب کا دن ہے۔ آج کا دن احیائے دین کا دن ہے۔ یہی وہ دن ہے جو خدا نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ ہمیں آج مسرت و شادمانی کا اظہار کرنا چاہیے۔ کیونکہ خدا اپنی قوم پر ظاہر ہوا ہے اور اس نے اسے اپنی برکت سے معمور کیا ہے۔'' (۱۲)

کیرن لکھتی ہیں صلیبی جنگجوں نے مسیحی پادریوں کی مدد سے یہ پراپیگنڈا کیا کہ خدا کی خوشنودی اس اقدام (مسلمانوں کا قتل عام) میں شامل ہے:

یہ تصور بہت جلد پورے یورپ میں پھیل گیا اور لوگ مطمئن ہو گئے ورنہ قتل عام کی خبریں سن کر وہ خوف زدہ ہو گئے۔ صلیبی جہاد ایک خوش کن عقیدہ تھا تمام تر دشواریوں اور مزاحمتوں کے خلاف اس کی کامیابی نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ خدا کی خوشنودی اس اقدام میں شامل ہے۔ اگلے دس برسوں کے دوران پہلی صلیبی جنگ کا احوال تین مشہور مسیحی مورخین نے لکھا۔ ان میں نوجنٹ کا راہب گلبرٹ، راہب رابرٹ اور بورجیئل کا بالڈریک شامل ہیں۔ یہ لوگ

صلیبی لشکریوں کے جذبہ جہاد کی زبردست تعریف کرتے ہیں۔ اب تک مسلمانوں کو نسبتاً غیر جانبدار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن صلیبی جنگ کے بعد مغرب میں انہیں ''قابل نفرت اور خبیث نسل'' قرار دیا جانے لگا جو خدا کو نہیں مانتے تھے اور ختم کر دیئے جانے کے قابل تھے۔ جس طرح مصر سے اسرائیلیوں کا خروج خدا کا کام تھا اسی طرح صلیبی جنگ کو خدا کا اقدام کہا گیا۔ چونکہ صلیبی جہاد میں فرانسیسیوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا چنانچہ فرانسیسی اب خدا کے نئے منتخب کردہ لوگ تھے۔ انہوں نے وہ فریضہ سرانجام دیا تھا جو یہودی بھول چکے تھے۔ راہب رابرٹ نے ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ صلیب کے واقعہ کے بعد یروشلم کی تسخیر تاریخ عالم کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ جلد ہی مسیح کے دشمن یروشلم میں داخل ہوں گے اور آخری دنوں کی جنگ شروع ہو جائے گی۔

''لیکن الہامی فتوحات رونما ہونے سے پہلے اگر شہر کی تطہیر نہ کی گئی تو صلیبی مجاہدین کی کارروائیاں کوئی اہمیت نہیں رکھیں گی۔'' مشہور مسیحی مورخ بشپ ولیم آف ٹائر بتاتا ہے کہ نعشوں کو پھرتی سے جلایا گیا تا کہ مقدس مقامات تک پہنچنے کے لئے راستے صاف ہو جائیں۔ لیکن یہ کام خاصا دشوار اور طویل تھا۔ پانچ مہینے بعد بھی شہر کے گرد انسانی لاشیں پڑی ہوئی تھیں جب چارٹریس کا فلچر اس سال کرسمس منانے کے لئے یروشلم پہنچا تو صورت حال دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ ''اوہ۔۔۔ یہاں کس قدر تعفن پھیلا ہوا ہے۔ شہر کے اندر اور باہر دیواروں کے پاس ان مسلمانوں کی لاشیں گل سڑ رہی ہیں جنہیں ہم نے شہر پر قبضہ کرتے ہوئے قتل کیا تھا۔ جہاں پر کوئی تلوار کے نیچے آیا، اس کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہے۔''

صلیبی لشکریوں نے انسانوں سے بھرے شہر کو راتوں رات ایک بدبودار مردہ خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ قتل عام کے تین دن بعد جب صلیبیوں نے بازار لگایا تو متعفن لاشوں کے انبار گلیوں میں موجود تھے۔ انتہائی جوش و خروش اور تقریباتی انداز میں انہوں نے لوٹ کا مال ایک دوسرے کو فروخت کیا۔ انہیں اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں تھی کہ انہوں نے کس قدر خون ریزی کی ہے اور اس کا نفرت انگیز ثبوت ان کے قدموں تلے کراہ رہا ہے۔ اگر اپنے پیشرووں کے مقدس حقوق کا احترام یروشلم کے کسی توحید پرست فاتح کے ایمان کا امتحان ہو سکتا ہے تو صلیبی لشکری اس میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ (۱۳)

ایک اور مشہور برطانوی محقق و مورخ ٹیری جونز (Terry Jones) نے بی بی سی پر صلیبی جنگوں کے موضوع پر سات آٹھ گھنٹے کی ڈاکومنٹری فلم بنائی۔ اس فلم اور اس کے حوالے سے اس نے کتاب بھی

شائع کی۔ اس کتاب میں وہ ''یروشلم میں قتل عام'' کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

آنے والے سالوں میں مورخ جب مسلمانوں کے یروشلم پر قبضہ اور بعد میں عیسائیوں کے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کی داستان رقم کرے گا اور ان دونوں عسکری مہمات کا موازنہ کرے گا تو اسے ایک واضح نظر آئے گا۔ ایک نے مذہب کے نام پر رواداری کی ایک ایسی مثال قائم کی جو رہتی دنیا تک قائم رہے گی اور دوسرے نے مذہب کے نام پر ظلم و ستم، درندگی اور بربریت کا وہ بدترین نمونہ پیش کیا جو اپنی مثال آپ تھا۔(۱۴)

ٹیری جونز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھتا ہے:

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں جب یروشلم فتح ہوا اور آپ وہاں تشریف لے گئے تو آپ نے وہاں کی مسیحی آبادی کو یقین دلایا کہ ''وہ بالکل محفوظ ہیں۔ ان کے مذہبی مقامات مکمل طور پر محفوظ ہیں اور انہیں کچھ بھی نہ کہا جائے گا۔'' اور ایسا ہی ہوا۔ ایک بھی عیسائی نہ مارا گیا۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ان کے مذہبی مقامات کا دورہ کیا اور جب انہیں کہا گیا کہ وہ کلیسا میں دو رکعت نماز شکرانہ ادا کریں تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ''آج میں اگر گرجا میں دو رکعت نماز ادا کرتا ہوں تو کل آنے والے پورے گرجا پر قبضہ جما لیں گے۔'' ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت عیسائیوں کے حقوق احاطہ تحریر میں لائے گئے۔ جس میں جان و مال کا تحفظ، عبادت گاہوں کا اور صلیب کا تحفظ اور یہ بھی تحریر تھا کہ انہیں زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا۔(۱۵)

مسیحی فوج کے یروشلم میں داخل ہو کر قتل و غارت کرنے کے متعلق لکھتا ہے:

جب صلیبی شہر میں داخل ہوئے تو Fulcher of Charteris کے مطابق ''ہمارے سپاہیوں نے لوگوں کو بے دریغ قتل کیا۔ ان کے پیٹ پھاڑ کر انتڑیاں بکھیر دیں۔ انہیں شک تھا کہ انہوں نے شاید قیمتی اشیا نگل لی تھیں۔ ننگی تلواریں گھماتے ہمارے بہادر سپاہی دیوانہ وار اِدھر اُدھر کسی ذی روح کی تلاش میں سرگرداں تھے اور جو کوئی بھی نظر آیا، مارا گیا۔ انہوں نے گھروں میں گھس کر وہ لوٹ مار مچائی کہ الامان۔ جس گھر میں جو پہلے داخل ہوتا وہ اسی کی ملکیت قرار پاتا۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے غریب دولت مند بن گئے۔''(۱۶)

ٹیری جونز مسیح کے نام پر اس قتل و غارت گری کے واقعہ کو نقل کر کے لکھتا ہے:

ان صلیبی جنگ جوؤں کی سوچ جو کچھ بھی ہو ان کا عمل یقینی طور پر یسوع مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم سے یکسر مختلف تھا۔(۱۷)

آگے چل کر لکھتا ہے:

پہلا فوجی دستہ شمال سے شہر میں داخل ہوا۔ مسلمان ٹیمپل کے مضافات کی طرف پسپا ہو گئے۔ انہوں نے مسجد اقصیٰ اور ڈوم آف روک میں پناہ لے لی۔ مگر Tancard نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا اور خوب لوٹ مار مچائی۔ جنوبی سمت سے Raymond آگے بڑھا اور جنرل افتخار جو David's Tower میں قلعہ بند تھا، کا محاصرہ کر لیا۔ ریمنڈ نے حملہ روک کر افتخار کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو اسے بحفاظت جانے دیا جائے گا۔ افتخار کو صلیبیوں کے وعدوں پر یقین نہ تھا مگر کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ادھر اپنی فطرت کے برعکس عیسائیوں نے اسے وعدہ کے مطابق بحفاظت نکل جانے دیا۔ دوسرے دن صلیبی مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے اور باوجود یہ کہ ٹینکرڈ نے ان لوگوں کو پناہ دے رکھی تھی، سب مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا۔ ان لوگوں میں بڑے بڑے عالم فاضل لوگ بھی تھے جنہیں لڑنے لڑانے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ وہ درویش اور عبادت گزار تھے جو زندگی کے باقی دن اس مقدس جگہ پر گزارنے آئے تھے۔ اسی طرح یہودیوں نے بھی اپنی عبادت گاہ میں پناہ لے رکھی تھی۔ اس عمارت کو آگ لگا دی گئی اور تمام یہودی اندر جل کر خاک ہو گئے۔

یہ کسی بھی فاتح فوج کا عمومی ردعمل نہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان میں کوئی شیطانی روح سرایت کر گئی تھی اور وہ اسی کے تحت ہر غیر مسیحی ذی روح کو تلف کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اور کسی چیز سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے بعد کلیسا میں انہوں نے شکرانہ کی نماز ادا کی۔ Fulcher لکھتا ہے ''خدا کی مہربانی سے آج ہمیں یہ مبارک دن نصیب ہوا۔ یہ ایک یادگار موقع ہے۔ یہ جگہ ایک مدت سے وحشیوں (مسلمانوں) کے زیر تسلط تھی اور آخر کار ہم نے اسے ان کے ناپاک وجود سے آزاد کرا لیا ہے۔''(۱۸)

یروشلم کے گلی کوچوں میں پڑے مسلمانوں کی لاشوں کے انبار کے متعلق لکھتے ہیں:

بعد میں بڑا مسئلہ لاشوں کے انبار تھے جن سے گلی کوچے پٹے پڑے تھے۔ تعفن اور گندگی کی باعث سانس لینا دشوار تھا۔ ایک فرانسیسی تاریخ دان کی بات میں ہٹلر کے نازی

کیمپوں کی بازگشت تھی۔۔۔۔حکم ہوا کہ مسلمانوں کی لاشوں کو شہر سے باہر پھینک دیا جائے۔ بو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ بچے کھچے مسلمان ان لاشوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لے جا رہے تھے۔اس طرح کے باہر لاشوں کے ڈھیر جمع ہو گئے۔ایسے لگتا تھا کہ جیسے لاشوں کے احرام کھڑے ہوں۔آج تک مسلمانوں کا ایسا قتل عام نہ دیکھا نہ سنا۔(۱۹)

یہ سارے حقائق بیان کرنے کے بعد ٹیری جونز لکھتے ہیں کہ یروشلم میں مسیحی فوج کے ہاتھوں مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کا قتل عام تاریخ کے صفحات پر کالے حرفوں سے لکھا جائیگا۔(۲۰)

مسلمانوں کے لیے لفظ کافر، گند، خبیث قوم، وحشی لوگ، جانور وغیرہ کا استعمال

قسطنطنیہ کی عثمانیوں کے ہاتھوں فتح کے بعد اُن کے زیر حکومت غیر مسلموں بالخصوص مسیحیوں کو مذہبی و معاشرتی آزادی میسر تھی۔ اس کا اعتراف اُس دور کے مسیحی و مغربی مورخین نے بھی کیا ہے۔ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ اپنے خبیث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کو لفظ گند، کافر، خبیث قوم، جانور وغیرہ کے القابات سے بھی نوازا ہے۔ چند حوالے ملاحظہ فرمائیں۔ کیرن آرم سٹرانگ لکھتی ہیں:

۱۰۹۷ء میں ڈوریلیئم میں ہونے والی جنگ میں فرینک فوجی ترک سپاہیوں کے ساتھ تعلق پر مان کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن صرف دو سال بعد ہی جب صلیبی جنگوں کے نتیجے میں یروشلم مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تو ان کا رویہ ایسا تھا جیسے وہ مسلمان سپاہیوں کو شاید انسان کی حیثیت سے بھی تسلیم کرنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔انہوں نے فتح کے نشے میں چور مسلمان شہریوں کو اس بے دردی سے تہہ تیغ کیا کہ اس دور کے عیسائی بھی دہشت زدہ ہو گئے۔اس کے بعد کے برسوں میں مسلمانوں کو زہریلے کیڑے تصور کیا جانے لگا کہ جنہیں تمام تر مقدس مقامات اور علاقوں سے ختم کر دینا ضروری تھا۔صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کے لئے کلیسیا کی طرف سے استعمال کیا جانے والا لفظ ''گند'' تھا۔(۲۱)

مارٹن کروسیوس لکھتے ہیں:

یہ تعجب کی بات ہے کہ ان وحشی لوگوں (یعنی ترکوں) میں اور ایسے بڑے اور گنجان شہر میں قتل و غارت کے واقعات سننے میں نہیں آتے اور کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سلطان دوم اپنے درار الحکومت قسطنطنیہ کو تمام

دنیا کا دار الامان کہتا ہے، کیونکہ جس قدر آفت زدہ لوگ ہیں، ان کو اس شہر میں پناہ ملتی ہے۔ سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف ہوتا ہے، خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، مسیحی ہو یا کافر (مسلمان)۔(۲۲)

اسی قسم کا تبصرہ ایک انگریز سوداگر رچرڈ سٹیپر نے کیا ہے، جس نے ۱۵۷۸ء میں ترکی کا سفر کیا تھا۔اس کا قول ہے:

اگرچہ ترک بالعموم ایک بڑی خبیث قوم ہے، جو تاریکی میں رہتی ہے اس کے باوجود وہ تمام مسیحیوں کو جن میں یونانی اور لاطینی شامل ہیں اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنے دین پر قائم رہیں اور انے ضمیر کا آزادی سے استعمال کریں۔ان کی طرف سے مسیحیوں کو اجازت ہے کہ وہ قسطنطنیہ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں اپنے گرجاؤں میں عبادت کریں۔ اس کے برعکس سپین میں بارہ برس کی اقامت کے بعد میں یہ بات سچے دل کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ہم سپین میں نہ صرف کیتھولک فرقے کی رسومات کی پابندی کرنے پر مجبور تھے بلکہ ہمارا جان و مال بھی خطرے میں رہتا تھا۔(۲۳)

ایک اور مسیحی مورخ کہتا ہے کہ مسیحیوں کا اسلامی حکومت میں خوش رہنا ایک کافرانہ جسارت ہے:

میں نہایت تعجب سے سنتا ہوں کہ یہ بات صرف عام مسیحیوں ہی میں مشہور نہیں ہے کہ ترکوں کی سلطنت میں رہنا اچھا ہے کیونکہ جب ایک ڈیوکٹ ادا کر دیا جاتا ہے تو مسیحی بالکل آزاد ہو جاتے ہیں اور ترک ان کو مذہبی آزادی دیتے ہیں اور وہ اپنے گرجاؤں میں عبادت کے لئے جا سکتے ہیں بلکہ اعلیٰ طبقے کے مسیحی بھی ایسے ہیں جن کو ترکوں کی بابت یہ اچھے خیالات رکھنے ہرگز مناسب نہ تھے لیکن وہ ان باتوں سے خوش ہوتے ہیں گویا اپنی مصیبتوں پر خوش ہیں۔ یہ بات خطرناک ہی نہیں ہے بلکہ کافرانہ جسارت ہے اور سوائے بدعتی خیالات کے یہ حالت کسی اور شیئز سے پیدا نہیں ہوتی۔اس بات کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسیحی اپنے مذہب سے برگشتہ ہو جائیں گے اور مسیحی دین سے اکھڑ جائے گا۔(۲۴)

سینٹ بونی فاس نے ۷۴۵ء میں اپنے مکتوب نمبر ۶۲ میں لکھا ہے:

پس ایسا ہی ہوا۔سپین اور جنوبی فرانس اور برگنڈی کے باشندوں کے حق میں جنہوں نے خدا کی اطاعت سے روگردانی کی تھی یہاں تک کہ خدائے قادر نے جوان کے گناہوں کو دیکھ رہا

تھا ان پر عذاب بھیجا اور یہ عذاب قانون الٰہی سے لاعلمی کی صورت میں اور عربوں کی شکل میں نازل ہوا تا کہ ان کو نیست و نابود کر دے۔۔۔ یہ ہماری گنہگاری کا نتیجہ ہے کہ سپین کی حکومت عربوں کے قبضے میں آ گئی ہے۔ (۲۵)

اسی طرح الوار لکھتا ہے:

میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ عذاب ہم پر ہمارے ہی قصور کے سبب سے نازل ہوا ہے۔ ہاں بھائیو! یہ ہماری سہل نگاری، ہماری ناپاکی، ہمارے تلون اور ہمارے ہی اخلاق کی خرابی ہے جس نے ہمیں ان مصائب تک پہنچایا ہے۔ پس خدا نے جو انصاف کو عزیز رکھتا ہے اور جس کا چہرہ عدل دکھلاتا ہے ہمیں جانور (مسلمانوں) کے حوالے کر دیا ہے تا کہ وہ ہم کو نگل جائے۔ (۲۶)

یولوگیوس لکھتا ہے:

مذہبی معاملات میں بغیر کسی مداخلت کے ہم ان مسلمانوں میں آباد ہیں''۔ اسلامی حکومت کی طرف سے کسی طرح کی سختی نہ تھی جس کے سبب مسیحی اپنے مذہب سے انکار کرتے یا اپنے مقدس دین کی پیروی سے باز رہتے۔'' سیجی ساکن گورز جس نے دسویں صدی کے وسط میں سپین کی سیاحت کی تھی لکھتا ہے کہ ''اُس کی حکومت میں مسیحی آزادی سے اپنے مذہب کی پیروی کرتے تے اور اپنے مال سے نفع اٹھاتے تھے۔'' سپین کے ایک اسقف نے بےبسی سے مسیحیوں کی حالت یوں بیان کی: ''ہم اپنے گناہوں سے اس درجے کو پہنچے کہ اب کفار ہم پر حاکم ہیں، پالوس رسول کے حکم سے ہمارے لئے حاکم وقت کا مقابلہ کرنا منوع ہے لیکن ایک بات باعث تسکین ہے اور وہ یہ کہ ان تمام مصائب میں مسلمان ہم کو اپنے دین کی پیروی سے منع نہیں کرتے بلکہ وہ ایسے مسیحیوں پر جو اپنے مہب کے سخت پابند ہیں مہربانی کرتے ہیں اور انس سے رسم دوستی پیدا کرتے ہیں ان سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور جب تک یہ برا وقت ہم پر ہے ہم نے اس کو قرین مصلحت جانا ہے کہ جب مسلمانوں نے ہمارے دین کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا تو باقی باتوں میں بھی ہم ان کی فرمان برداری کریں۔ ان کے احکام کی جہاں تک وہ ہمارے دین میں مخل نہ ہوں تعمیل کریں۔ (۲۷)

من گھڑت اور غلط واقعات پر مبنی مسیحی مبلغین کی سیرۃ النبی ﷺ

۱۱۰۰ء سے پہلے یورپ حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس میں کسی یورپی کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ۱۱۲۰ء کے بعد جیسے لوگوں کو اچانک ہوش آیا اور یہ عالم تھا کہ کم ہی پڑھے لکھے ایسے ہوں گے جو نبی کریم کو نہ جانتے ہوں۔ اسی دور میں شارلیمان بادشاہ آرتھر اور روبن ہڈ وغیرہ کی کہانیاں زبان زد عام تھیں لیکن اہل مغرب کے ذہنوں میں پیغمبر اسلام کا تصور مسیحیت کے دشمن کے طور پر بٹھایا گیا۔ ایک مصنف آر ڈبلیو ساؤتھرن اسلام کے بارے میں مغربی تصورات کی متعلق لکھتا ہے:

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب یہ کہانیاں بنائی گئیں تو اس وقت ضرور ان کی بنیاد سچ پر رکھی گئی ہوگی اور یہ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے عام کی گئیں، لیکن جوں ہی ایسی کہانی تیار ہونے کے بعد عوام کے ہاتھ میں آتی ہے تو اس کی اپنی الگ حیثیت بن جاتی ہے۔ عوامی شاعری میں حضرت محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کرام کے بارے میں جو تصور موجود تھا اس میں سالوں کے طویل عرصے میں معمولی سی ہی تبدیلیاں ہوئیں۔ مقبول ادبی ہیروؤں کی طرح ان کی مخصوص شخصیت تھی جنہیں مصنفین ایمانداری کے ساتھ سال ہا سال تک لکھتے رہے۔ (۲۸)

نبی کریم کی فتوحات اور عوامی سطح پر کامیابیوں کا احوال بیان کرتے ہوئے ایسی کہانیاں وجود میں آئیں جن میں انہیں معاذ اللہ جادوگر ثابت کیا جاتا تھا جس نیا اپنے جادوئی شعبدوں کی مدد سے عربوں کو اپنا اسیر کیا اور مشرق وسطیٰ اور افریقہ میں کلیسیا کی جڑیں کھوکھلی کیں۔ ایسی ہی ایک کہانی میں ایک سفید سانڈ کا ذکر موجود ہے جو لوگوں کو خوف زدہ کرتا ہوا ظاہر ہوتا تھا اور جس کے سینگوں کے درمیان قرآن مجید معجزاتی طور پر تیر رہا ہوتا تھا۔ اسی طرح ایک کہانی میں بیان کیا جاتا تھا کہ حضرت محمد ﷺ نے ایک فاختہ کو سدھایا ہوا تھا۔ وہ ان کے کان میں سے مٹر کے دانے کھاتی تھی جس سے وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے یہ ان کے کان میں سرگوشی کر کے کوئی الہامی پیغام ان تک پہنچا رہی ہے۔ اسی طرح آپ کے روحانی تجربات کے بارے میں (نعوذ باللہ) یہاں تک کہا جاتا تھا کہ آپ مرگی کا شکار ہیں۔ آپ اصل میں اس مرض کے دورے کا شکار ہوتے ہیں جب آپ سمجھتے ہیں کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے یا جبرئیل آپ سے ملنے آیا ہوا ہے۔ اسی طرح آپ کی ازدواجی زندگی کو بھی ہدف تنقید بنایا جاتا تھا۔ ہر طرح کی خلاقی اور جنسی گمراہی کو آپ کی ذات سے منسوب کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور یہ کہا جاتا تھا کہ آپ لوگوں کو لالچ

دیتے تھے کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو تمہیں جنسی حوالے سے مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ آپ کو جعل سازی کا مرتکب ٹھہرایا جاتا تھا اور یہ کہا جاتا کہ آپ نے عربوں کو دھوکہ دیا ہے۔ ایسی کہانیاں بنائی جاتی تھیں جن میں بتایا جاتا کہ جن صحابہ کو نبی کریم کی معاذ اللہ جعل سازی کا علم ہو جاتا وہ اس لئے خاموش رہتے کہ خود ان کی اپنی حیثیت بھی مشکوک قرار پاتی تھی۔ (نعوذ باللہ)

اصل میں مغربی مذہبی علما کا زور اس بات پر تھا کہ اسلام کی آزادانہ حیثیت کو ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اسی صورت میں اس کی قابلِ ذکر کامیابیوں کی اہمیت کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ وہ یہ مؤقف اختیار کرتے تھے کہ اسلام دراصل مسیحیت میں سے ہی نکلا ہے لیکن ایک بدعت کی صورت میں۔ یہ مسیحیت کی تردید کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ اس حوالے سے یہ کہانی گھڑی گئی کہ کلیسیا نے کسی ایک راہب کو بدعتی قرار دے کر برادری سے باہر نکال دیا۔ وہ بحیرہ عرب چلا گیا جہاں اس کی ملاقات حضرت محمد ﷺ سے ہوئی جنہیں اس نے مسیحیت کے مسخ شدہ تصور کی تبلیغ کی۔ اسی تصور کو لے کر مسلمان سپاہی فتوحات حاصل کرتے دوسرے ملکوں میں گئے اور یوں اسلام تلوار کے زور پر دنیا کے بڑے حصے میں پھیل گیا لیکن کسی بھی جگہ مسلمانوں کو آزادی کے ساتھ مذہب پر بات کرنے کی اجازت نہیں تھی، وغیرہ وغیرہ۔

کیرن آرمسٹرانگ لکھتی ہیں:

> ان تمام کہانیوں سے ہمیں واضح انداز میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عیسائی اسلام کی بڑھتی ہوئی فتوحات سے خوف زدہ تھے اور انہیں اپنا تشخص خطرے میں دکھائی دیتا تھا۔ اسلام کے بارے میں یہ تصور کہ یہ تلوار کے زور پر پھیلنے والا مذہب ہے۔ مسیحیوں نے اس دور میں عام کرنا شروع کیا جب وہ خود صلیبی جنگوں میں مصروف تھے۔ یعنی جب وہ خود جنگ و جدل کی راہ پر گامزن تھے۔ ایسی راہ پر جس کا یسوع مسیح کی تعلیمات سے دور سے بھی کوئی واسطہ نہیں تھا۔ جس زمانے میں کلیسیا اپنے راہبوں اور دوسرے پادریوں کے لئے تجرد کی زندگی کو لازمی قرار دینے کی تحریک چلا رہا تھا تب حضرت محمد ﷺ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں چونکا دینے والی من گھڑت کہانیاں بھی زبان زد عام تھیں۔ اسلام پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ یہ اپنے ماننے والوں کو مذہبی امور پر بات کرنے سے منع کرتا ہے۔ حالانکہ بعد ازاں خود کلیسا ہی نے مذہبی امور پر بات کرنے کے تمام حقوق اپنے پاس محفوظ رکھے۔ صلیبی جنگوں کے دوران یورپ بھر میں یہ جنون عام تھا کہ ان جنگوں کے بارے میں کلیسیا کے مؤقف کو مان لیا جائے اور کوئی چوں چرا نہ کی جائے۔ اس دور میں کلیسیا پر حرف تنقید کہنے والوں کے

> ساتھ جیسا بہیمانہ سلوک کیا گیا اس کی تاریخ میں کم ہی مثالیں ملتی ہیں۔ جادوگرنیوں کا شکار کیا گیا اور پرٹسٹنٹ فرقے کے حمایتیوں کے ساتھ جیسی درندگی برتی گئی وہ ایسی باتوں کو بنیاد بنا کر کی گئی جو اسلام اور یہودیت دونوں مذاہب میں ذاتی امور قرار دیئے جاتے ہیں۔ دونوں مذاہب ہی مسیحیوں کے بدعت کے نظریے سے اتفاق نہیں کرتے کہ جس میں خدا کے بارے میں انسانی اعتقاد کو اس درجہ ارفع بنا دیا جائے کہ وہ اصنام پرستی کے قریب ہو جائے۔ صلیبی جنگوں کا دور جب پیغمبر اسلام کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں عام کی گئیں، یورپ بھر کے لئے نہایت نازک اور تناؤ بھرا دور تھا۔ یہ تناؤ اسلام کے خلاف نفرت کی صورت میں ظاہر ہوا کہ تب ہر کوئی اس مذہب کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف کھائے ہوئے تھا۔ (۲۹)

مسیحیوں کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام

آہستہ آہستہ یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آئی کہ مغربی عیسائیوں میں اتنی ذہنی وسعت نہیں ہے کہ وہ مختلف مذہبی اعتقادات اور برادریوں کو اپنے معاشرے میں جگہ دیں اور قبول کریں جیسی کامیابی کے ساتھ تاریخ میں مسلمانوں اور بازنطینی قوم نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔

صلیبی جنگوں کے مسیحی مجاہدوں نے یورپ سے مشرق وسطی کے سفر کا آغاز وادی رہائن میں آبادیوں کو تہ تیغ کرنے کی صورت میں کیا۔ اصل میں صلیبی جنگوں کے دوران سامی لوگوں کے خلاف نفرت یورپی ذہنیت کی پہچان بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جس دور میں مسیحیوں نے پیغمبر اسلام کی ذات مبارک کے بارے میں من گھڑت کہانیاں عام کیں، قریب قریب اسی دور میں یہودیوں کے بارے میں بھی حیرت انگیز اور دہشت ناک قصے زبان زد عام ہوئے۔ یہودیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ننھے بچوں کو قتل کر دیتے ہیں اور ان کا خون روٹی میں ملاتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ عشائے ربانی کی رسم کی توہین کریں۔ جب کہ اس فعل سے ان کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ عالمی سطح پر مسیحی برادری کو بدنام کر کے ختم کر دیں۔ ایسی کوئی تحریر مسلم دنیا میں یہودیوں کے بارے میں موجود نہیں تھی۔ اس طرح کی کہانیوں سے اس دور کے یورپ کی ذہنی خستہ حالی اور اختلال کا پتہ چلتا ہے۔ جب کہ سپین، جنوبی اٹلی اور سسلی میں مسلمان فوجوں کی فتوحات کا مطلب یہ تھا کہ مسیحی دنیا کی سرحدوں پر مسلمانوں کا اجتماع بڑھتا جا رہا تھا۔ ان اجنبیوں سے معاملہ کرنے کا اس دور کے مسیحی حکمرانوں کو بس یہی ایک طریقہ سجھائی دیا کہ وہ مسیحیوں کو سختی سے منع کر دیں کہ وہ یہودیوں اور مسلمانوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں اور کسی طرح کے سماجی روابط ان

سے پیدا نہ کریں۔(۳۰)

مسیحیوں کے ہاتھوں مسیحیوں کا قتل عام

سترھویں صدی میں جب انطاکیہ کے بطریرک مکاریوس نے اُن خوف ناک مظالم کو دیکھا جو پولینڈ کے کیتھولک فرقے نے آرتھوڈوکس کلیسا کے روسیوں پر کئے تھے تو اُس نے اپنے آپ کو ان الفاظ میں مبارکباد دی:

''ہم اُن ہزاروں صلیبیوں پر بہت روئے جن کو ان فاجر کم بختوں نے جو دین کے دشمن ہیں گزشتہ چالیس پچاس سال کے عرصے میں ہلاک کر ڈالا ہے۔ ان کی تعداد کم و بیش ستر یا اسی ہزار تک پہنچی ہے۔ اے کافرو! اے ناپاکی کے شیطانو! اے سنگ دلو! راہبا اور عورتوں نے کیا کیا تھا؟ لڑکیوں، لڑکوں اور چھوٹے بچوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ تم نے ان کو مار ڈالا؟ اور میں اُن (پولینڈ والوں) کو ملعون کیوں کہتا ہوں؟ اس لئے کہ انہوں نے مسیحیوں پر ظلم کر کے اپنے تئیں بت پرستوں سے بھی زیادہ ذلیل اور خبیث ثابت کیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح آرتھوڈوکس فرقے کا نام و نشان تک مٹا دیں گے۔ خدا ترکوں کی سلطنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلامت رکھے! کیونکہ وہ اپنا جزیہ لیتے ہیں لیکن رعایا کے مذہب میں دخل اندازی نہیں کرتے خواہ وہ نصرانی ہوں یا یہودی یا سامری۔ لیکن ان ملعون محصول اور عشر وصول کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو مسیح کے دشمنوں یعنی ظالم یہودیوں کے حوالے کر دیا جنہوں نے ان کو نہ تو گرجے تعمیر کرنے کی اجازت دی اور نہ ہی ان کے پاس کسی مذہبی پیشوا کو چھوڑا جو ان کے دین کے اسرار سے واقف ہو۔(۳۲)

کلیسیا کی یہودیوں اور مسلمانوں کیخلاف قوانین

اس حوالے سے ۱۱۷۹ء اور ۱۲۱۵ء کی کلیسیا کی کونسلوں نے یہودیوں اور مسلمانوں کو مسیحیوں کے دشمن قرار دینے کے حوالے سے قوانین منظور کئے۔ جو مسیحی کسی مسلمان یا یہودی کے گھر میں ملازمت کرتا اس کے بچوں کی نگہداشت کرتا، ان سے کاروبار کرتا یا ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا، کلیسیا اسے برادری بدر کر دیتا اور اس کی تمام جائیداد قانونی طور پر ضبط کر لی جاتی۔ ۱۲۲۷ء میں پوپ گریگوری نہم نے ان قوانین میں کئی اہم اضافے کئے جو یوں ہیں: مسلمانوں اور یہودیوں کو خاص لباس پہننا چاہیے تاکہ ان

کی شناخت ہو سکے۔ مسیحی تقریبات اور میلوں وغیرہ کے دوران انہیں باہر چلنے پھرنے سے احتراز کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی مسیحی ملک میں انہیں نوکری ہی دی جائے گی۔ اسی طرح مؤذن پر پابندی تھی کہ وہ اتنی اونچی آواز میں اذان نہ دے کہ وہ کسی مسیحی کے کانوں تک جائے۔(۳۳)

مسیحی دنیا میں مسلمانوں کی موجودگی اصل میں خدا کی توہین ہے

پوپ کلیمنٹ (۱۳۰۵-۱۴) نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ مسیحی دنیا میں مسلمانوں کی موجودگی اصل میں خدا کی توہین کے مترادف ہے(۳۴)۔ تب تک مسیحی افواج خدا کی توہین کی صورت میں موجود ان اقوام کو اپنے ملکوں سے بھگانے میں جت گئی تھیں۔ ۱۳۰۱ء میں فرانس کے بادشاہ چارلس نے سسلی اور جنوبی اٹلی کے علاقے لیوسیرا میں موجود آخری مسلمانوں کا قتل عام کیا یہ کہتے ہوئے کہ ان کی وجہ سے اس علاقے میں نحوست اور برائی پنپ رہی ہے۔ ۱۴۹۲ءمیں یورپ میں مسلمانوں کی سب سے مضبوط سلطنت کو فرڈیننڈ اور ازبیلا نے غرناطہ پر قبضہ کر کے ختم کیا۔ اس فتح کی خوشی میں تمام یورپ میں گرجا گھروں میں خوشی کے اظہار کے طور پر گھنٹیاں بجائی گئیں۔ چند سال بعد سپین میں رہنے والے مسلمانوں کو کہا گیا کہ یا تو وہ اپنا مذہب تبدیل کر کے مسیحی ہو جائیں یا پھر یہ ملک چھوڑ دیں۔ زیادہ تر لوگوں نے ہجرت کو ترجیح دی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تب عیسائی بھی ہوئی، لیکن ان مسیحی ہونے والوں کی اولادوں کو اگلے تین سو سال تک ہسپانیہ کی عدالت احتساب (Inquisition) طرح طرح سے اذیتیں دے کر مارتی رہی۔ قرطبہ کے شہدا سے منسوب واقعات نے سپین کے لوگوں اور حکمرانوں میں مسلمانوں کے خلاف ایسی نفرت اور خوف بھر دیا تھا کہ انہوں نے مسیحی مذہب قبول کرنے والے مسلمانوں کو کبھی قبول نہیں کیا۔ ہمیشہ انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے درمیان دشمنوں کے نمائندے کے طور پر سمجھا۔

اسلام کے خلاف مغرب کا معاندانہ رویہ اکثر ہسٹیریائی انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔ رومی شہنشاہ فریڈرک دوم اسلامی اقدار اور عقائد کے لئے دل میں گداز گوشہ رکھنے والا انسان تھا لیکن اس نے بھی نہایت باقاعدہ انداز میں اپنے ملک سسلی میں مسلمانوں کا قتل عام کروایا اور انہیں ملک بدر کیا۔ ایک طرف مشرق قریب میں عیسائی مسلمانوں کا قتل عام کروایا اور انہیں ملک بدر کیا۔ ایک طرف مشرق قریب میں مسیحی مسلمانوں کو ختم کرنے میں مصروف تھے تو دوسری طرف سپین میں وہ مسلمان علما کے زیرنگرانی حصول علم کا کام کر رہے تھے۔ وہاں یہودی، مسیحی اور مغربی علما نے مشترکہ طور پر تراجم کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کے ذریعے وہ اسلامی تعلیمات کو مغرب سے متعارف کروا رہے تھے اور وہ دانش و بینش یورپ کو از سر نو سکھا رہے تھے جو اس نے جہالت کے تاریک دور میں گنوا دی تھی۔ مغرب میں ابن سینا اور ابن رشد کو علم و

حکمت کے روشن مینار تصور کیا جاتا تھا، لیکن اس حقیقت کو ماننا ان کے لئے رفتہ رفتہ مشکل ہوتا گیا کہ یہ دونوں اصحاب واقعی مسلمان تھے۔

ڈانتے کی ڈیوائن کامیڈی

اہل مغرب کے اس دبدھے کا اظہار دانتے کی شہرہ آفاق نظم ڈیوائن کامیڈی میں بھی ہوتا ہے۔ نظم میں ابن راشد اور ابن سینا کو نیک بت پرستوں کے ساتھ عالم برزخ میں دکھایا گیا ہے۔ یہ وہ بت پرست ہیں جنہوں نے تاریخ میں عالی علمی روایت کی بان رکھی اور مغرب کو وہ دانش وحکمت سیکھنے میں مدد دی جو اقلیدس، سقراط، افلاطون اور ارسطو سے منسوب تھی، لیکن دانتے حضرت محمد ﷺ کو (معاذ اللہ) مسیحی تفرقہ بازوں کے ساتھ جہنم کے آٹھویں حلقے میں دکھاتا ہے۔ نہ ہی دانتے پیغمبر اسلام کو کوئی اعلیٰ شخصیت ماننے پر آمادہ تھا۔ وہ انہیں معاذ اللہ محض ایک تفرقہ باز قرار دیتا ہے جس نے اپنے آباواجداد کے مذہب سے انحراف کیا۔ اس نظم سے ہمیں اس نفرت کی مکمل تصویر حاصل ہوتی ہے جو مغربی مسیحیوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف موجود تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سے ہمیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اسلام ان کے لئے ہر اس شے کا نمائندہ بھی تھا جو ان کے لئے گوارہ نہیں تھی۔ اسلام کے لئے ظاہر ہونے والا خوف اور نفرت جو یسوع مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے سراسر منافی بات ہے، ہمیں مغربی عیسائی دنیا کے داخلی انتشار اور شکست وریخت کا پتا بھی دیتی ہے۔ (۳۵)

اس دور میں علماوفضلا کی ایک بڑی تعداد ایسی بھی تھی جو اس عام روش سے ہٹ کر سوچ رہی اور کام کررہی تھی۔ اس دور میں جب مسیحی دنیا میں یہودیوں اور مسلمانوں کو مسیحی تہذیب کا مشترکہ دشمن تصور کیا جارہا تھا، یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ مغرب میں نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک سے متعلق منظر عام پر آنے والی اولین چند سوانحی کتابوں میں سے ایک کا مصنف پیٹر الفونسی تھا جو پہلے ایک ہسپانوی یہودی تھا اور 1106ء میں عیسائی ہوا تھا۔ تب سے وہ انگلستان میں ہنری اول کے طبیب کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ وہ اسلام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن وہ اس بات کا اعتراف کرتا تھا کہ حضرت محمد ﷺ کی پختگی اور اولو العزمی کا مظاہری کرتے ہوئے اپنے اموقف کے ساتھ وابستہ رہے۔ 1120ء میں جب مسلمانوں کے خلاف نفرت اپنے عروج پر تھی۔ ولیم مالمسبری پہلا یورپی تھا جس نے اسلام کے بارے میں لکھا کہ یہ بت پرستی سے جدا ایک مذہب ہے۔ وہ رقم طراز ہے عرب اور ترک افراد خدائے وحد کی عبادت کرتے ہیں اور محمد (ﷺ) کو خدا نہیں بلکہ خدا کا پیغمبر سمجھتے ہیں۔''

یہ وہ بات تھی جو تب بڑے بڑے مغربی علما کے لئے ماننا دشوار تھی۔ آج بھی آپ کو مغرب

میں ایسے لوگ بری تعداد میں مل سکتے ہیں جن کے لئے یہ بات اچنبھے کا باعث ہوگی کہ مسلمان واقعی اسی خدا کی عبادت کرتے ہیں جسے یہودی اور عیسائی پوجتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں لفظ اللہ کے بارے میں اپنے خدا سے مختلف کسی خدا کا تصور موجود ہے۔ چنانچہ معروف امریکی مسیحی مبلغ بلی گراہم کا بیٹا فرینکلن گراہم اپنی کتاب ''The Name'' میں اسلام اور مسیحیت کے مابین تقابلی موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسلام کا ''اللہ'' مسیحیت کے ''خداوند'' سے ایک علیحدہ خدا ہے۔ (۳۶)

۱۱۵۰ء سے پہلے ایک کتاب ''تاریخ شارلیمان'' (History of Charlemagne) منظر عام پر آئی تھی جس کا مصنف سوڈو ترپن (Pseudo-Turpin) تھا۔ اس کتاب میں حقیقت اور افسانہ یوں باہم گڈمڈ ہے کہ دونوں کی الگ الگ شناخت ممکن نہیں ہے۔ اس رومانی کہانی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بت پرست عرب حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ساتھ اپالو دیوتا کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ کہانی میں کسی جگہ رونالڈ اور ایک مسلمان عالم کے درمیان بحث کا منظر پیش کیا گیا ہے جس میں مؤخر الذکر کا مؤقف یہ ہے کہ مسلمان ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ قریب قریب اسی دور میں وقائع نگار اوٹو Otto of Freising نے اپنی تحریروں میں اس خیال کو غلط قرار دیا کہ مسلمان بت پرست ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ تمام عرب ایک خدا کے تصور پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ عہد نامہ قدیم کو بھی مانتے ہیں اور اپنے بچوں کے ختنے کرواتے ہیں۔ نہ ہی وہ عیسائیوں اور کلیسیاؤں کے مخالف ہیں لیکن ان کا یہ ایک عقیدہ ہی ان کی نجات کے راستے میں حائل ناقبل عبور رکاوٹ ہے کہ وہ یسوع مسیح علیہ السلام کے خدا یا یا خدا کا بیٹا ہونے کے تصور کو جھٹلاتے اور (حضرت) محمد (ﷺ) کو خدا کے سب سے محترم اور معتبر پیغمبر مانتے ہیں۔ (۳۷)

''مسلمانوں کے شیطانی مسلک کی بدعتوں کا خلاصہ''

دراصل یہ وہ دور تھا جب مشرق قریب کے ان ملکوں میں عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں پے در پے شکست کا سامنا تھا۔ تمام مسیحی دنیا میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی جوالا مکھی بھڑک اٹھی تھی۔ اس جوالا مکھی کو بھڑکانے میں کلئیر ویکس کی خانقاہ کا سربراہ برنارڈ (Bernard, Abbot of Clairvaux) پیش پیش تھا۔ قرآن مجید کے معروضی اور غیر جانبدار مطالعے کے لئے یہ مناسب وقت نہیں تھا۔ پیٹر نے ایک مقالہ لکھا جس میں اسلامی دنیا کو نہایت مشفقانہ انداز میں مخاطب کیا:

میں تم سے کلام کرنا چاہتا ہوں، دوسرے لوگوں کی طرح ہتھیاروں کی مدد سے نہیں بلکہ الفاظ
کی مدد سے۔ طاقت سے نہیں بلکہ عقل اور دلیل سے اور نفرت سے نہیں بلکہ محبت
سے۔۔۔۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ یہی پسندیدگی وہ وجہ ہے کہ میں تم سے مخاطب ہوں۔
میں یہ لکھ کر تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ آؤ ہم بیٹھ کر بات کریں۔ اس معاملے کو حل
کریں۔(۳۸)

اس مقالے کا عنوان ''مسلمانوں کے شیطانی مسلک کی بدعتوں کا خلاصہ'' تھا۔ اس مقالے میں
پیٹر نے جس انداز میں اسلام کی انتہاپسندی کو بیان کیا ہے اس سے اس دور کے اہل یورپ میں اسلام کے
حوالے سے موجود خوف اور دیگر علامات کا اظہار ہوتا ہے۔ جب فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم نے
1147 میں مشرق وسطی میں دوسری صلیبی جنگ کا آغاز کیا تو پیٹر نے اس کے بارے میں لکھا کہ اسے
امید تھی کہ وہ اس جنگ میں اتنے مسلمانوں کو شہید کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، جتنے کنعانی اور اموری
حضرت موسیٰ علی السلام اور حضرت یوشع نے مارے تھے۔(۳۹)

سینٹ فرانسس آف اسیسی

تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک اور مسیحی صوفی نے صلیبی جنگ کے تناظر میں اسلامی دنیا
سے رابطہ کرنے کی کوشش کری۔ 1218-19 کے سالوں میں پانچویں ہولناک صلیبی جنگ کے دوران
ایک موقع پر جب دونوں طرف سے جنگ رکی ہوئی تھی، ایک راہب فرانسس آف اسیسی (Saint
Francis of Assisi) آگے بڑھا۔ میدان عبور کر کے مسلمان فوج کے پاس آیا اور سپاہیوں سے
درخواست کی کہ اسے سلطان الکامل کے حضور لے جایا جائے۔ کہا جاتا کہ اس نے سلطان کے ہاں تین
روز قیام کی۔ اس دوران وہ سلطان کو انجیل مقدس کے اسباق سناتا اور انہیں مسیحی بننے کی تلقین کرتا رہا۔
چونکہ اس نے حضرت محمد ﷺ کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمات ادا نہیں کئے تھے، اس لئے مسلمانوں کو
اس کے وہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ نہ ہی انہیں اس بات پر کوئی اعراض تھا کہ وہاں انہیں انجیل
مقدس کے اسباق سنائے، بلکہ وہ اس کے جذبے سے بے حد متاثر ہوئے۔ جب وہ جانے لگا تو الکامل
نے اس سے کہا ''میرے لئے دعا کیجئے گا کہ خدا مجھے وہ راستہ سجھائے اور وہ بات سمجھنے کی توفیق دے جو
اسے سب سے عزیز ہے۔'' اس کے بعد سلطان نے فرانسس کو بحفاظت واپس مسیحی فوج کے پاس پہنچا
دیا۔(۴۰)

سینٹ فرانسس آف اسیسی کا توہین رسالت پر مبنی انوکھا تبلیغی مشن

مشرق کے سفر پر روانگی سے قبل فرانسس نے اپنی خانقاہ سے راہبوں کی ٹولیاں تبلیغ کے لئے افریقہ اور
سپین روانہ کیں تا کہ وہ مسلمانوں کو مسیحیت کی تبلیغ کر سکیں، وہ اسلامی دنیا میں ایک مختلف منصوبے کے
ساتھ پہنچے تھے۔ سویلی میں پہنچتے ہی انہوں ں نے قرطبہ کے شہدا کی پیروی میں یادہ گوئی شروع کی۔ سب
سے پہلے تو وہ جمعے کی نماز کے دوران ایک مسجد میں جا گھسے۔ جب انہیں زبردستی باہر نکالا گیا تو وہ عامر کے
محل کے سامنے جا کر رسول اللہ کی شان میں گسا خانہ کلمات کہنے لگے۔ اسلامی دنیا میں جانے والے ان
اولین مبلغین کے ذہنوں میں وہاں اپنے مذہب کی تعلیمات کی تبلیغ کا کوئی ارادہ نہیں تھا نہ ہی وہ مسلمانوں
سے مخلص تھے۔ فرانس کے پیروکاروں کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ مسلمانوں کو مسیحیت کی
جانب راغب کریں بلکہ وہ شاہدت کی خواہش میں وہاں گئے تھے۔ ان کے رویے سے انتظامیہ سخت
تذبذب کا شکار تھی کہ نہ انہیں اس بات کی کھلی چھٹی دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی من مانی کرتے پھریں اور نہ
ہی ان کے ساتھ سختی کر کے وہ بری مثال قائم کرنا چاہتی تھی۔ آخر جب بات حد سے گزر گئی اور وہ کسی طور
اپنے جنون سے دستبردار نہیں ہوئے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ اس بات کی تشہیر کئے بغیر انہیں ایک جیل
سے دوسری جیل میں منتقل کرتی رہی۔ انتظامیہ انہیں توہین رسالت کے جرم میں سزائے موت دینے میں
بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھی لیکن وہاں رہنے والے متعصب مسیحی اس بات سے خوف زدہ تھے کہ اگر یہ لوگ
زیادہ دیر اس سرزمین میں رہے اور یونہی یاوہ گوئی کرتے رہے تو یہاں ان کی اپنی پوزیشن بری طرح متاثر
ہو سکتی تھی۔ آخر ان مبلغین کو مراکش منتقل کر کے چھوڑ دیا گیا لیکن وہاں بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں
آئے۔ وہ جمعہ کے دن سیدھا مسجد میں گئے اور وہاں موجود نمازیوں کے سامنے رسول خدا کی شان میں
گستاخانہ اور نازیبا کلمات ادا کئے۔ وہاں کی انتظامیہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ انہیں
ان کے جرم کی قرار واقعی سزا دی جائے۔ جب فرانسس نے ان کی موت کی خبر سنی تو وہ خوشی سے چلایا کہ
آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے(۴۱)۔ معروف مغربی مورخ جے۔ اے۔ کڈن اپنی کتاب ''
استنبول'' میں سینٹ فرانسس کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ تزکیہ نفس کے لیے جانوروں کا گوبر کھایا کرتے
تھے(۴۲)۔ یہ شائد اسی گوبر کا فیض تھا کہ اُسے توہینِ رسالت میں مزا آتا تھا۔

اس کے بعد کے دور میں فرانس کے پیروکاروں کے جتنے ٹولے اسلامی دنیا میں تبلیغ کے مقصد سے
گئے یہ رویہ ان سے مخصوص رہا۔ 1227ء میں مراکش میں ہی ایک اور ایسے ہی ٹولے کو کیفر کردار تک
پہنچایا گیا۔ انہوں نے اپنے گھروں کو اپنے مقصد کو بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ کافروں

(مسلمانوں) کے ہاتھوں شہادت کا درجہ حاصل کریں اور مسیحیت کے دشمنوں کی توہین کریں۔

تاہم تب مسیحیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اس رویے کے شدید مخالف تھے۔ مثلاً آرک کے بشپ جیمز آف وٹری (James of Vitry) نے مسیحی مبلغین کے ان رویوں کی مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> عرب ہمارے مبلغین کو واجب الاحترام تصور کرتے اور توجہ سے ان کی باتیں سنتے ہیں جب تک کہ وہ اپنے عقیدے اور انجیل کے بیان کت خود کو محدود رکھتے ہیں لیکن جب وہ رسول اللہ کی ذات مبارک پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر وہ ان کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ نہ ہی پھر کوئی انہیں موت سے بچا سکتا ہے۔ یا کم از کم وہ اسے وہاں نہیں رہنے دیتے اور ملک سے باہر نکال دتے ہیں۔ (۴۳)

قرطبہ کے شہدا کے ذریعے اسلام کا جو جارحانہ اور بربریت پسندانہ تصور عام ہوا تھا، صلیبی جنگوں کے زمانے میں بھی اسی کا چرچا رہا، بلکہ لوگوں کے ذہنوں میں زیادہ راسخ ہوا۔ 1191ء میں تیسری صلیبی فوجوں کے ساتھ ارض مقدس کی طرف جاتے ہوئے رچرڈ شیر دل کی سسلی میں میسینا (Messina, Sicily) کے مقام پر معروف اطالوی صوفی جوشم (Joachim of Fiori) سے ملاقات ہوئی۔ اس نے رچرڈ کو پیشین گوئی کی کہ وہ ہر صورت میں اس جنگ میں سرخرو ہوگا اور صلاح الدین ایوبیؒ کو شکست فاش دے گا۔ ظاہر ہے اس کی پیشن گوئی غلط ثابت ہوئی لیکن اس کے دوسرے بیانات زیادہ دلچسپی کے حامل ہیں جو اس نے اس موقع پر دیئے۔ اسے یقین تھا کہ دنیا کا اختتام نزدیک ہے اور یہ کہ یسوع مسیح علیہ السلام کے دشمن دجال کے پاس اسلام کی صورت میں ایک نہایت مہلک ہتھیار موجود ہے۔ جب کہ یہ دشمن پہلے سے روم میں موجود ہے اور وہی اب پوپ بنا بیٹھا ہے (۴۴)۔

مشہور پروٹسٹنٹ بائبل اسکالر جان ویکلف کا مطالعہ اسلام

چودھویں صدی کے انگریز مصلح جان ویکلف (John Wycliff) نے اپنی تحریروں میں اسلام سے جو خرابیاں وابستہ قرار دی ہیں وہ ان سے مختلف نہیں ہیں جو اس کے دور میں خود کلیسیا سے منسوب کی جاتی تھیں۔ جیسے تکبر، حرص، تشدد پسندی اور طاقت و جائیداد کی طمع۔

''ہم مغرب کے مسلمان ہیں'' وہ مغربی کلیسیا کو من حیث المجموع مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے، ''اگرچہ ہم مجموعی طور پر کلیسیا کے ایک قلیل حصے کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ذرا تصور کیجیے کہ اگر تمام دنیا

ہمارے زیر اثر آ جائے اور لوگ ہمارے فیصلوں کی زد میں ہوں۔'' اس کا مؤقف یہ تھا کہ جب تک کلیسیا انجیل کی اصل روح کو نہیں پاتا اور اپنی کج فہمی کا خاتمہ نہیں کرتا، اسلامی منفی اثرات مغرب اور مشرق کو اپنی لپیٹ میں لئے رہیں گے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ہماری قدیم عادت ہے کہ ہم ہر اس شے کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے منسوب کر دیتے ہیں جو ہم اصل میں ہوتے ہیں یا ہمیں خوف ہوتا ہے کہ ہم ہو جائیں گے۔

اپنی تحریروں میں ویکلف کا بیشتر انحصار غیر معتبر معلومات پر تھا لیکن اپنی تحقیقات کے دوران اس نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا اور یوں اسے متعدد ایسے نکات ہاتھ آئے جو اس کے خیال میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور روم کے کلیسیا میں مشترک تھے۔ وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ کیتھولک کلیسیا ہی کی طرح نبی کریم نے بھی (نعوذ باللہ) بائبل کو غیر ذمہ داری سے سمجھا اور اس میں سے وہ سب کچھ تو قبول کر لیا جو اسے موافق لگا لیکن وہ سب کچھ رہنے دیا جو اس کے اپنے نقطہ نظر کے خلاف تھا۔ یہی معاملہ مذہبی اوامر نواہی کا بھی ہے۔ اس کے خیال میں حضرت محمد ﷺ نے نئے سے نئے احکامات صادر فرمائے جنہوں نے اہل ایمان پر مذہبی ذمہ داری کا بوجھ بڑھا دیا۔ کلیسیا ہی کی طرح نبی کریم کا رویہ بھی حاکمانہ ہے اور وہ مذہبی فرائض و ذمہ داریوں سے متعلق آزادانہ مباحث کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔

ویکلف نے قرآن کی مختلف آیات میں از منہ وسطی سے متعلق کچھ تعصبات کا ذکر پڑھا تھا جن کے مطابق مذہبی مباحث کی حقیقت سے تو انکار نہیں ہوتا۔ نہ اس حوالے سے کوئی قدغن ہی لگائی گئی ہے۔ البتہ اس میں اتنی بات ضرور کہی گئی ہے کہ کچھ الہیاتی موضوعات ایسے ہیں جن پر ہونے والے مباحث نے ماضی میں فتنہ و فساد برپا کیا اور مذاہب کو چاہیے وہ خدائے واحد پر یقین رکھتے ہوں یا بہت سے دیوتاؤں پر ایک سے زیادہ مسالک میں تقسیم کیا۔ ان مسالک میں اتنی زیادہ مخالفت تھی جو مختلف اوقات میں خونریزی کا باعث بنی۔ خدائے واحد کے بارے میں کچھ اعتقادات کا انحصار صرف آپ کے ایمان اور قیاس پر ہوتا ہے مثلاً حیات بعد الموت کے اعتقاد کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس اعتقاد کے بارے میں حضرت محمد ﷺ کا خیال تھا کہ اسے بعد میں آنے والے مسیحیوں نے اپنے پیغمبر کی اصل تعلیمات میں شامل کیا تھا۔ یہ اصلاً اس کا حصہ نہیں تھا۔ ویکلف قرآن مجید کے پیغام اور فلسفے کو نہیں سمجھ پایا اور مذکورہ بالا پابندی کو انسانی سوچ پر پابندی کے مترادف قرار دیا۔ وہ اس پابندی کا کلیسیا کے مختلف متنازعہ فیہ مسائل جیسے عشائے ربانی سے متعلق رویے سے موازنہ کرتا ہے جس کے تحت مسیحیوں کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ کلیسیا کی سمجھ میں آنے والی ہر بات مان لیں۔ (۴۵)

یسوع مسیح علیہ السلام کے اصل دشمن کون ہیں؟

لوتھر اور پروٹسٹنٹ مسلک کے دیگر رہنماؤں نے اسلام دشمنی پر مبنی مطالعہ اسلام کی اس روایت کو جاری رکھا۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں سلطنت عثمانیہ کی یورپ میں پیش قدمیوں سے خوف زدہ ہو کر اس نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ایسا ہونا ممکن ہے کہ کبھی اسلام مسیحی سلطنت کو ہر طرف سے گھیر لے اور اسے اپنے زیر تسلط لے آئے۔

۱۵۴۲ء میں اس نے ریکولڈو دامونٹے کروس کی کتاب "Disputatio" کا ترجمہ چھاپا۔ اس کے دیباچے میں اس نے لکھا کہ میں نے اس کتاب کو برسوں پہلے پڑھا تھا لیکن تب میں نے سوچا کہ یہ تو نرا جھوٹ کا پلندہ ہے جس کے بارے میں یہ کہنا مشکل تھا۔ لیکن اسے لاطینی زبان میں اس کا کوئی ترجمہ نہیں مل سکا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اسلام کے بارے میں سنجیدہ تحقیق اور مطالعہ کا کس قدر فقدان تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ حال ہی میں اسے اس کا ایک ترجمہ ہاتھ لگا اور اسے پڑھنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ ریکولڈو کی باتیں کتنی سچی تھیں۔ وہ اس سوال پر غور کرتا ہے کہ آیا اسلام یا پیغمبر اسلام یسوع مسیح علیہ السلام کے دشمن ہیں یا نہیں۔ اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے کہ اسلام ایک پرامن مذہب ہے سو اس میں اتنی درشتی نہیں ہے جو اس کام کے لئے ضروری ہے۔ یسوع مسیح علیہ السلام کے اصل دشمن پوپ اور کیتھولک کلیسیا ہیں۔ جب تک یورپ پر ان اندرونی دشمنوں اور آستینوں کے سانپوں کا سایہ ہے یہ کبھی اتنا مضبوط نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کی یلغار کے سامنے اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکے۔ زونگلی اور دوسرے مصلحین نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا اور روم میں موجود پاپائیت کو یسوع مسیح علیہ السلام کا دشمن اور اسلام کو اس دشمن کا ساتھی قرار دیا۔

پروٹسٹنٹ خیالات کے فروغ سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان مصلحین نے اسلام کو یورپ میں خوب بدنام کیا اور اسے شیطانی قوت کے طور پر متعارف کروایا۔ نارمن ڈینئیل اپنی تحقیقی کتاب ''عرب اور ازمنہ وسطی کا یورپ'' میں لکھتا ہے کہ اہل یورپ کے لئے اسلام کوئی باہر سے آنے والا دشمن نہیں تھا بلکہ کسی اندرونی دشمن ہی کی طرح تھا۔ سو یہ ان کے لئے کوئی ایسی شے نہیں تھا جس کا معروضی طور پر تجزیہ کیا جا سکے۔ ان مصلحین نے اسلام کو یورپ کے داخلی انتشار اور خوف سے تشبیہ دی۔ اور یہ تصور عام کیا کہ یہ داخلی کیفیت اعلیٰ مذہبی تصورات کے دشمنوں سے مل کر ان کے ہاتھ مضبوط کر سکتی ہے۔ یوں انہوں نے اہل یورپ کے ذہنوں میں اسلام سے متعلق موجود منفی تصورات کو تسلیم کیا۔ (۴۶)

مسلمان کیتھولک ہیں یا پروٹسٹنٹ؟

سترھویں صدی عیسوی کا کیتھولک مبلغ ایم لیفیب رے (M. Lefebvre) مسلمانوں کو اسلامی پروٹسٹنٹ پکارتا ہے۔ اس کے خیال میں مسلمانوں کا عقیدہ بھی کسی جواز پر قائم ہے۔ ''انہیں یہ اُمید ہے کہ اگر وہ اسلام سے وابستہ رہیں اور اپنا ایمان مضبوط رکھیں تو یوم آخرت ان کی نجات ممکن ہے۔'' اس کے برعکس اٹھارھویں صدی عیسوی کے پروٹسٹنٹ سفر نامہ نگار ایل راؤ وولف کے خیال میں مسلمان اسلامی کیتھولک ہیں جو خدا کو خوش کرنے کے لئے اس سے اپنی محبت کا اظہار نیک اعمال، خیرات، عبادات، روزے اور قیدیوں کو آزاد کرنے کی صورت میں کرتے ہیں۔ (۴۷)

بعد ازاں مسیحی دنیا میں عقائد کی سطح پر ظاہر ہونے والی داخلی تقسیم کے نتیجے میں اہل مغرب کا اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں مسیحیت ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہونے کا تصور اور بھی راسخ ہوا۔ ان کا نقطہ نظر انتہائی ذاتی نوعیت کا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ انہیں تاریخی حقائق کی کھوج کرنے اور ان پر غور و فکر کرنے میں چنداں دلچسپی نہیں تھی۔ نہ انہوں نے کبھی اس حوالے سے سوچنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کی مذہبی طور پر الگ سے کوئی حیثیت یا شناخت ہو سکتی ہے اور یہ کہ انہیں مسیحیت کے حوالے کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

ایک قابلِ قدر کوشش

تاہم نشاۃ ثانیہ کے دور میں بہت سے مغربی علماء نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کو معروضی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کی۔ 1453ء میں ترکوں نے بازنطین کی مسیحی بادشاہت کو فتح کیا اور اسلامی مملکت کی حدود کو پھیلا کر یورپ کے ساحلوں تک لے آئے تو جان آف سیگوویا نے لکھا کہ اسلام کے خطرے سے نمٹنے کا ہمیں ایک اور راستہ ہاتھ آیا ہے۔ اس نے سلامانکا کے ایک مسلمان قاضی کی معاونت سے قرآن مجید کے ترجمے کا ڈول ڈالا۔ اس نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کی بھی تجویز پیش کی جس میں دنیا بھر سے مسلمان اور مسیحی علماء دین کو مدعو کیا جائے تاکہ وہ دوستانہ ماحول میں آپس میں باہم تبادلہ خیال کر سکیں۔ 1458ء میں جان کی وفات ہوئی۔ تب تک اس کا شروع کیا ہوا کوئی منصوبہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا۔ تاہم اس کا دوست کیوسا کا نکولس اس کے نظریات سے از حد متاثر تھا۔ اس نے اس روایت کا ساتھ نہیں چھوڑا جس کی بناء اس کے دوست نے ڈالی تھی۔ 1460ء میں اس نے ایک کتاب چھپوائی جس کا نام Cribraio Alchoran تھا۔ اس میں اس نے قرآنی موضوعات پر مناظراتی انداز میں بحث

نہیں کی، بلکہ ان آیات پر ادبی، تاریخی اور فلسفہ کے حوالے سے بات کی ہے جسے جان نے خاص طور پر قابلِ ذکر قرار دیا تھا۔(۴۸)

نشاۃ ثانیہ کے دوران مسیحی علما نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق کئی ایک تحقیقی کام کیے۔ اس مثبت اور صحت مندانہ طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے بارے میں ان کے نظریات کی تلخی کچھ کم ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی صدیوں پرانی نفرت کے رویے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔

۱۶۹۷ء میں یہ رویہ نمایاں انداز میں ابھر کر سامنے آیا۔ اسی برس دو بہت اہم کام منظرِ عام پر آئے۔ ان میں سے پہلی کتاب بارتھلمی ڈی ہربلوٹ کی، Bibliothique Orientale تھی۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے آغاز تک انگلستان اور یورپ میں اسلامی اور مشرقی علوم کے حوالے سے سب سے اہم اور معتبر کتاب تصور کی جاتی تھی۔ اسے اسلام کا اولین انسائیکلوپیڈیا بھی کہا جاتا تھا۔ اپنی تحقیق میں ڈی ہربلوٹ نے عربی، ترکی اور فارسی کتابوں کو حوالہ بنایا اور یوں اسلام کے بارے میں عیسائی دنیا میں صدیوں سے موجود نفرت کی فضا کو ختم کرنے کی نہایت موثر کوشش کی۔ مثال کے طور پر اس نے تخلیق کائنات وحیات کے حوالے سے مشرق میں موجود دیگر اسطوریات اور روایات کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھا۔ یہ تحقیقی رویہ ظاہر ہے مثبت نتائج کا باعث بنا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب میں 'محمد' کی سرخی کے تحت مصنف نے جو کچھ لکھا وہ یوں تھا:

> آپ وہی معروف محمد (ﷺ) ہیں جو مذہب کے نام پر کی جانے والی ایک بدعت جسے ''محمدیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے، کا مصنف اور بانی ہے۔((نعوذ باللہ)

ڈی ہربلوٹ کو 'اسلام' کے نام سے واقفیت تھی لیکن اس نے اسے لکھنے سے مسلسل اجتناب کیا کیونکہ دراصل اس مذہب کے بارے میں مسیحی دنیا کا یہی رویہ تھا کہ وہ اسے اپنے ہی مذہب کی ایک بگڑی ہوئی صورت تصور کرتے تھے۔(۴۹)

اسی سال مشرقی علوم کے انگریز ماہر ہمفری پرائیڈیاکس (Humphry Prideaux) کی اہم کتاب ''محمد: جعل سازی کا اصل روپ'' منظرِ عام پر آئی۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ازمنہ وسطیٰ کے تعصبات کی روشنی میں ہی لکھا گیا تھا۔ مصنف نے ریکولڈ وڈی مونٹے کروس کی کتاب کو اپنا بنیادی حوالہ بنایا ہے۔ اس باوجود یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتا کہ اس نے ازمنہ وسطیٰ کے تعصبات سے متاثر ہوئے بغیر یہ تحقیقی کام کیا ہے۔ یہ کتاب آجکل امریکی صہیونی مسیحیوں میں کافی مقبول ہے۔ اپنی کتاب میں پرائیڈیاکس نے اپنے نقطہ نظر کی بنیاد غیر عقلی تعصبات پر رکھی۔ وہ پیغمبر اسلام کے

بارے میں لکھتا ہے:

> ''اپنی زندگی کے پہلے حصے میں وہ (نعوذ باللہ) غیر اخلاقی افعال میں مصروف رہے اور انہیں خون خرابے، دھوکہ دہی اور لوٹ مار جیسی سرگرمیوں میں خوشی ہوتی تھی۔ وہی نہیں تمام عرب ایسی زندگیاں گزارتے تھے۔ ان کے قبائل تقریباً مستقل طور پر مسلح رہتے اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی۔ اور ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے تاکہ جو کچھ کسی سے چھین سکیں، چھین لیں۔
>
> ان کی زندگی میں دو ہی خواہشات تھیں: طاقت کا حصول اور عورت۔ جس شدت سے انہوں نے اپنی سلطنت کی بنیادیں قائم کیں وہ ان کی اولین خواہش کو ظاہر کرتی ہیں۔ عورتوں کی کثیر تعداد جوان کے حرم میں موجود تھیں، ان کی خواہشات کی عکاس ہیں اور دراصل انہی دو خواہشات کی بنیاد پر ہی ان کے مذہب کی عمارت کھڑی ہے۔ ان کی کتاب القران میں شاید ہی کوئی ایسی سورت ہو جس میں جنگ یا خون ریزی سی متعلق کوئی اصول نہ بیان کیا گیا ہو جو ان دونوں میں سے کسی ایک کو جائز ثابت کرے، یا عورت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آزادی کا اظہار نہ کیا گیا ہو، یا کوئی ایسا وعدہ نہ کیا گیا ہو کہ اس مذہب کے پیروکاروں کو موت کے بعد جنت میں حوروں کو استعمال کرنے کی مکمل آزادی ہوگی۔(۵۰)

اٹھارویں صدی عیسوی میں اہلِ مغرب میں اسلام کے بارے میں ایک زیادہ درست تفہیم حاصل کرنے کا رجحان فروغ پایا۔ 1708ء میں سائمن اوکلے کی کتاب، عربوں کی تاریخ، کی پہلی جلد شائع ہوئی جس نے قارئین کی ایک بڑی تعداد کو غیر یقینی اور بے چینی کا شکار کیا کیونکہ اس میں ان کے من پسند تعصبات کا ذکر نہیں تھا اور نہ ہی اسلام کو تلوار سے پھیلنے والا مذہب قرار دیا گیا تھا، بلکہ اس کے برعکس ساتویں صدی عیسوی کے جہاد کو اسلامی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

1751ء میں فرانکوئس والٹیئر کی کتاب، Moeurs et l'esprit des nations Les'، چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں مصنف نے حضرت محمد ﷺ کو ایک اہلِ بصیرت سیاسی مفکر اور ایک عقلی مذہب کے بانی کی حیثیت سے متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کی حکمت عملی ہمیشہ عیسائیوں کی نسبت زیادہ پرامن اور بردباری پر مبنی رہی ہے۔

مشرقی علوم کا ولندیزی ماہر جوہن جیکوب ریسکی عربی زبان کا ایک غیر معمولی عالم تھا۔ اس نے

حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس میں اعلیٰ صفات کی نشاندہی کی اور اسلام کو ایک الہامی مذہب تسلیم کیا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوران حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ایک نیا تصور اہل مغرب میں عام ہوا اور وہ ایک دانا، اور دوربین قانون ساز کا تصور تھا۔

کومٹے ڈی بولین ویلیئر زہنری کی کتاب Mahomed"Vie de ۱۷۳۰ء میں پیرس سے اور پھر ۱۷۳۱ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس میں حضرت محمد ﷺ کو عقل اور دانائی کے دور کا پیش رو قرار دیا گیا ہے۔ وہ اس تعصب کو درست تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی ترویج کی تا کہ وہ پوری دنیا کی حکمرانی حاصل کر سکیں۔ لیکن وہ یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ انہوں نے دنیا کے فکری چلن کو بھی تبدیل کیا اور اسے زیادہ عقلی بنایا۔ مسیحیت کے برعکس اسلام ایک فطرت پسند روایت کا حامل مذہب ہے اور یہ بات اسے تمام مذاہب میں سب سے نمایاں کرتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ، جولیس سیزر اور سکندر اعظم کی طرح ایک عظیم جنگی رہنما اور سپہ سالار تھے۔ اصل میں یہ بھی پیغمبر اسلام کی شخصیت کو بیان کرنے کا ایک غلط انداز تھا۔ لیکن اتنا تو تھا کہ اہل مغرب کو ان کی شخصیت کو سمجھنے میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی اور وہ انہیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام پر ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب "سلطنت روما کا عروج وزوال" کے پانچویں باب میں اسلام کے وحدانیت کے تصور پر تفصیل سے بات کی ہے اور اس حقیقت کو مانا کہ مسلمانوں نے دنیا کے تہذیبی ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔

قدیم تعصب نے مغربی ذہن میں اپنی جڑیں اس حد تک گہری کر لی تھیں کہ یہ محققین اپنی تمام تر معروضیت کے باوجود اپنی تحریروں میں پیغمبر خدا ﷺ کے بارے میں کبھی غیر جانبداری کا مظاہرہ نہیں کر پائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر روشن خیالی عام تھی، لیکن صدیوں سے پھیلی جہالت کی تاریکی کو چھٹنے میں ابھی کچھ وقت مزید درکار تھا۔ اسی لیے سائمن اوکلے نے حضرت محمد ﷺ کا جو خاکہ اپنی کتاب میں پیش کیا اس کے مطابق "وہ ظاہری طور پر بہت نیک خو اور پرامن انسان تھے، لیکن ان کے اصولوں اور تعلیمات کی بنیاد قوت اور عورت کے حصول کی خواہشات پر قائم تھی۔" (۵۱)

جارج سیل اپنے ترجمے کا دیباچہ لکھتے ہوئے یہ بات بہت واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ "اس بات میں اب کوئی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ (نعوذ باللہ) اسلام الہامی نہیں بلکہ اختراعی مذہب ہے، اور یہ کہ اس کی تمام ترقی اور پھیلاؤ کا انحصار جنگ وجدل پر ہے۔" (۵۲)

اپنے مضمون 'Les Moeurs' کی آخری سطروں میں والٹیر اسلام کے بارے میں اپنے مثبت خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "حضرت محمد ﷺ کی عظمت کی گواہی تو وہ لوگ بھی دیتے تھے

جو انہیں بابانگ دہل (نعوذ باللہ) جعل ساز کہنے میں عار محسوس نہ کرتے تھے۔" (۵۳)

1741ء میں اپنے ڈرامے 'Mahomet or Fnaticism' میں والٹیر مغرب میں پیغمبر اسلام کے بارے میں موجود منفی تصورات اور تعصبات کی بنیاد پر ان کا ایک منفی خاکہ پیش کرتا ہے اور انہیں (نعوذ باللہ) ایسے جعل سازوں کی اعلیٰ ترین مثال کے طور پر پیش کرتا ہے جنہوں نے مذہب کی طاقت بروئے کار لا کر لوگوں کو اپنی غلامی میں لیا۔ اس مقصد کے لئے اسے پرانی روایات اور تعصبات ناکافی محسوس ہوئے اور اس نے ڈرامے میں اس حوالے سے کئی نئی روایات بھی اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کیں۔ حتی کہ گبن نے بھی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بھی ان پر یہ الزام دھرتا ہے کہ انہوں نے لوگوں کو جنس اور دولت کا لالچ دے کر اپنی پیروی کرنے پر اکسایا۔ قرآن مجید میں بیان کردہ اسلامی اعتقادات کے بارے میں گبن بہت واضح الفاظ میں یہ اعلان کرتا ہے کہ ایک مہذب انسان کے لیے انہیں قبول کرنا ناممکن ہے۔ (۵۴)

توہین اسلام کا نیا مغربی انداز

اہل مغرب نے اب اسلام سے خوف زدہ رہنے کی بجائے اسکی تکذیب کا رویہ اپنا لیا ہے۔ وہ اب کا سلام کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں جو قرآن مجید سمجھ میں نہیں آتا تو اس کی وجہ ان کی کم فہمی نہیں تھی، بلکہ اصل میں اس میں سمجھنے کے لائق کوئی بات تھی ہی نہیں۔

۱۸۴۱ء میں ٹامس کارلائل نے حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارک کے بارے میں ایک مضمون ایک ہیرو بطور پیغمبر لکھا۔ یہ اس موضوع پر لکھا ہوا اپنی نوعیت کا جدا مضمون تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اہل یورپ کے تعصبات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب یورپ کے کسی فرد نے اہل یورپ کو اسلام کے بارے میں ایک زیادہ ہمدردانہ انداز میں سوچنے کی ترغیب دی تھی۔ اس مضمون میں نبی کریم کو ایک سچی مذہبی شخصیت کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن قرآن مجید کے بارے میں اس میں اچھے خیالات موجود نہیں ہیں۔ اسے دنیا کی اکتاہٹ بھری کتاب قرار دیا گیا تھا۔ (۵۵)

اٹھارہویں صدی کے اختتامی برسوں میں ایک واقعہ ہوا جس نے پوری دنیا پر ظاہر کیا کہ اہل یورپ کا جھکاؤ کس سمت میں تھا۔ 1798ء میں نپولین بحری راستے سے مصر میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ علوم مشرق کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اس کا ارادہ یہ تھا وہ ان ماہرین اور علماء کی مدد سے اسلامی دنیا میں اپنی دھاک بٹھائے گا اور یوں ہندوستان میں برطانوی برتری کا توڑ تلاش کرے گا۔ جونہی وہ مصر

کے ساحلوں پر پہنچے اس نے علماء کو کہا کہ وہ آگے جائیں اور حالات کا جائزہ لیں۔ ان کے ہمراہ اس نے اپنے فوجی افسران کو بھی روانہ کیا جن کو اس بارے میں سخت ہدایت کی کہ وہ محترم علما کی ہدایات پر عمل کریں گے۔ اس مشن پر جانے سے پہلے ان تمام افراد نے مکمل تیاری کی تھی۔ نپولین نے اسکندریہ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ اسنے الازہر یونیورسٹی کے ساتھ علما سے بات چیت کی۔ اس نے ہمدردانہ انداز میں اسلام اور حضرت محمد ﷺ کا ذکر کیا اور پھر ان سے والٹیئر کی تحریر 'Mahomet' پر بھی بات کی۔ وہاں موجود علما اور عام لوگوں نے اس کے باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا۔ صرف اتنا ہوا کہ ان کے دلوں میں اس کے خلاف ابتدائی طور پر جو نفرت پیدا ہوئی تھی، وہ کچھ کم ہوگئی۔

انسویں صدی کالونیوں کی تشکیل کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس صدی میں اہل یورپ نے دنیا بھر میں اپنی کالونیاں قائم کیں۔ اس۔ سے ان میں یہ تصور پیدا ہوا کہ وہ دنیا کی دیگر اقوام سے بالاتر ہیں۔ سو انہوں نے اپنے ذمے یہ کام لیا کہ انہیں ایشیا اور افریقہ جیسی سرزمینوں میں جا کر انسانوں کو مہذب بنانا ہے۔ اس نے لامحالہ اسلام کے بارے میں اہل یورپ کے تصور پر بھی اثرات ڈالے۔ فرانسیسی اور برطانوی زوال پذیر سلطنت عثمانیہ پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔

اپنے معروف سفرنامہ، پیرس سے یروشلم اور یروشلم سے پیرس کا سفر، (11-1810) میں شیٹو برائن اپنے خیالات کو فلسطین کی صورت حال پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے لکھا کہ عرب ایسے سپاہی ہیں جن کا کوئی سپہ سالار نہیں ہے۔ ایسے شہری ہیں جنہیں شہروں میں رہنا نہیں آتا۔ وہ ایک ایسے خاندان کی صورت میں ہیں جس کا کوئی سربراہ نہ ہو۔ وہ ایک ایسے مہذب انسان کی مانند ہیں جو ایک وحشی معاشرے میں بسنا شروع کردے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ مغرب کی طرف امید کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں کہ کوئی یورپی قوم آئے اور ان پر اپنا تسلط قائم کرے۔ کیونکہ خود اپنے معاملات کو احسن طور پر سرانجام دینا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ وہ قرآن کے بارے میں کہتا تھا کہ اس میں مہذب زندگی گزارنے کے اصول نہیں بتائے گئے۔ جبکہ مسیحیت کے برخلاف اسلام میں وحشت و بربریت کی تعلیم دی جاتی اور انسانی آزادی کو مسخ کیا جاتا ہے۔ (۵۶)

فرانسیسی ماہر لسانیات ارنسٹ رینان نے ان نئے نسل پرستانہ اور سہنشاہیت پسندانہ خیالات کی سائنسی توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ عبرانی اور عربی زبانیں دنیا کی پست اور ذیل ترین زبانوں میں شامل ہیں۔ اصل میں یہ آریائی زبانوں سے نکلی ہیں۔ ان میں اتنے عیوب ہیں کہ انہیں مہذب زبانوں کی فہرست میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ ان کا مطالعہ البتہ یہ سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے کہ زبانیں کیسے ارتقا کی منازل طے کرسکتی ہیں اور کیوں کچھ زبانیں قدیم ہونے کے باوجود تہذیب

یافتہ اور پختہ نہیں ہو پاتیں۔ اسے سے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسامی باعث یہودی اور عرب دونوں قومیں بھی کم مرتبے کی حامل ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ سامی قوم اتنی سادہ اور ارتقا کے ابتدائی مراحل میں ہے کہ اسے دنیا کی پختہ قوموں میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔ یورپی اقوام کے آگے اس کی حیثیت وہی ہے جو پینٹنگ کے سامنے کسی پنسل سے کھنچے ہوئے خاکے کی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں گہرائی اور عظمت موجود نہیں ہوتی۔ ان کی مثال ایک ایسے انسان کی سی ہے جس نے اپنا بچپن بڑے اعلی انداز میں گزارہ ہو، لیکن پختہ عمر ہونے کے ساتھ اس میں وہ تمام صلاحتیں ختم ہو جائیں اور وہ ایک کند ذہن اور بودا انسان بن جائے۔ (۵۷)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل یورپ نے عربوں اور یہودیوں کے خلاف نفرت کو پھر سے ہوا دی۔ اس کے بہت سنگین نتائج آنے والے زمانوں میں یوپیوں کو بھگتنے پڑے۔ اسی نفرت کو لے کر ہٹلر نے یہودیوں کے خلاف تاریخ کی سنگین ترین کاروائیاں کیں۔ وہ یورپی اور آریائی اقوام کی سرزمین پر کسی غیرفقوم کی موجودگی کو برداشت نہیں کرسکا۔

یورپ میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ کوئی مسلمان وہاں نہیں بچا تھا۔ تاہم انیسویں صدی میں برطانوی اور فرانسیسی فوجوں نے مسلامن علاقوں میں یورشیں شروع کیں۔ 1830ء میں فرانسیسیوں ن نے الجزائر کو اپنی کالونی بنایا۔ 1839ء میں برطانیہ نے ایڈن کو اپنی کالونی بنایا۔ اس دوران میں ان اقوام نے 1881ء میں تنزانیہ، 1882ء میں مصر، 1898ء میں سوڈان اور 1912ء میں لیبیا اور مراکش کو اپنی کالونیوں کے حلقے میں شامل کیا۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے عرب ملکوں سے معاہدے کئے کہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد وہ ان کی خودمختاری کو برقرار رکھیں گے، انہوں نے 1920ء میں مشرق وسطی کے علاقے کو آپس میں بانٹ لیا۔

صلاح الدینؒ! دیکھو ہم لوٹ آئے ہیں

آج مسلمان ملک مغربی استعماریت اور مسیحی تبلیغی تحریکوں کو صلیبی جنگوں اور مہموں سے جوڑتے ہیں۔ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو اس میں کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں ہے۔ جب جنرل ایلن بی نے 1917ء میں یروشلم میں یہ اعلان کیا تھا کہ صلیبی جنگیں اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہیں تو فرانسیسی فوجیں دمشق میں گئیں اور وہاں صلاح الدین ایوبیؒ کے مزار پر جا کر ان کے سپہ سالار نے پکار کر کہا تھا ''صلاح الدین!

دیکھو ہم لوٹ آئے ہیں۔'' (۵۸)

مسیحی تبلیغی جماعتیں اور یورپ کا نوآبادیاتی نظام

مسیحی تبلیغی جماعتوں نے یورپ کے نوآبادیاتی نظام کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے مفتوحہ علاقوں میں اسلامی کلچر کو مسخ کرنے کی کوشش کی جس کی تفصیل آپ باب اول میں پڑھ آئے ہیں۔ انہوں نے ارادۃً مقامی مسیحی گروہوں کو ان ملکوں کے اقتدار میں نمایاں حصہ دیا اور ان کیلیے بے جا طور پر آگے بڑھنے کے مواقع پیدا کیے۔ لبنان میں اس کی مثال میرونائٹ برادری کی صورت میں موجود ہے۔ کالونیاں بنانے والی اقوام اس جبر واستبداد کا جواز یہ فراہم کرتی تھیں کہ وہ ان پسماندہ علاقوں میں ترقی اور شعور پیدا کر رہی ہیں، لیکن تاریخ نے دیکھا کہ یہ سب کچھ انہوں نے تشدد اور نفرت کے رویے کو فروغ دے کر کیا۔ الجزائر میں فرانسیسیوں کے خلاف مزاحمتی تحریک بہت شدید تھی۔ وہاں حالات پر امن ہوتے ہوتے برسوں لگ گئے۔ فرانسیسیوں نے سر اٹھانے والی ہر باوت کے کچلنے کے لئے ممکنہ حد تک بربریت کا مظاہرہ کیا۔ اس حوالے سے خاص فوجی مہمات روانہ کی گئیں جن کا خاکہ فرانسیسی مورخ ایم بادریکورٹ یوں پیش کرتا ہے:۔

> جب ایسی کوئی فوجی مہم واپس آتی تو ہمارے فوجی خود شرمندہ ہوتے۔ کوئی اٹھارہ ہزار کے قریب درخت ان مہمات کے دوران جلا کر خاکستر کر دیے گئے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھے مردوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔ وہ عورتوں کے کانوں میں چاندی کے جھمکے، انگلیوں میں انگوٹھیاں اور کلائی میں چوڑیاں دیکھتے تو اندھے ہو کر لوٹ مار کرتے۔ ان میں سے بکثرت زیورات ایسے ہوتے ہیں جنہیں آسانی سے اتارا نہیں جا سکتا۔ یہ عورت کی جوانی کا اظہار ہوتے ہیں۔ ہمارے سپاہی انہیں اتارنے کے لیے عورتوں کے اعضا کاٹ دیتے تھے۔ پھر انہیں ویسے ہی بریدہ حالت میں تڑپتا چھوڑ دیتے۔ (۵۹)

''اسلام میں خود اپنی اصلاح کرنے کی اہلیت نہیں ہے''

نوآبادیاتی نظام قائم کرنے والی مغربی اقوام کے دلوں میں ان مفتوحہ ملکوں کے لئے نفرت بھی اتنی ہی شدید تھی۔ مصر میں لارڈ کرومر (Lord Cromer) نے مسلم دانشور محمد عبدہٗ کو اس بات پر سزا دینے کا اعلان کیا کہ اس نے روایت اسلامی تصورات کی نئے انداز سے توجیہی پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

لارڈ کرومر نے کہا اسلام میں خود اپنی اصلاح کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ نہ ہی عرب اس لائق ہیں کہ وہ اپنے طور پر ایک مہذب معاشرے کی بنیادیں استوار کر سکیں۔ اس نے دو نہایت ضخیم جلدوں والی کتاب 'جدید مصر' کے عنوان سے لکھی۔ اس میں اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مشرقی اقوام ہمارے مقابلے میں نہایت سادہ اور بچگانہ ہیں۔ وہ لکھتا ہے'' سر الفرڈ لائل (Sir Alfred Lyall) نے ایک بار مجھ سے کہا 'درست سوچ ایک مشرقی ذہن کے لیے بالکل اجنبی شے ہے۔ ہر اینگلو انڈین کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔' ایسی درست سوچ، جو بے یقینی کو پیدا ہونے سے روکے، کا ایک مشرقی ذہن سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' وہ مزید لکھتا ہے:

> ایک یورپی ہمیشہ منطقی انداز میں سوچے گا۔ حقیقت کے بارے میں اس کے رائے کسی طرح کے ابہام سے پاک ہوگی۔ چاہے اس نے منطق کا مطالعہ نہ کیا ہو، وہ فطری طور پر ایک منطق دان ہے۔ اس میں فطری طور پر تشکیک کا مادہ موجود ہے۔ وہ کسی بات کی سچائی جاننے کے لئے پہلے کئی ثبوت کی تلاش کرے گا۔ اس کا ذہن اس حوالے سے خود کار انداز میں کام کرتا ہے جیسے کوئی مشین ہو۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ایک مشرقی ذہن اپنے مخصوص جغرافیے کے مطابق کسی طرح کے توازن سے عاری ہوتا ہے۔ قدیم عربوں نے البتہ جدلیات میں کمال حاصل کر لیا تھا، لیکن اس کے بعد عربوں کی جو نسلیں آئی ہیں، وہ نہایت بودی ہیں۔ ان میں تو اتنی اہلیت نہیں ہے کہ نہایت سادہ سی باتوں سے کوئی سادہ سی حقیقت ہی سمجھ جائیں۔ (۶۰)

اس کے باوجود کہ ایسے مغربی علما کی کبھی کمی نہیں رہی جو عربوں اور اسلامی دنیا کا معروضی انداز میں تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن نوآبادیاتی سوچ نے اکثریت کو متاثر کیا اور وہ یہ سمجھنے پر مائل ہو گئے کہ یہ قوم اس لائق نہیں ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

اس نفرت پسند رویے کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ ہوا کہ مسلمان تنہائی کا شکار ہو گئے۔ آج مسلمانوں میں مغرب سے نفرت نہایت شدید اور عام ہے، لیکن یہ سوچ بہت بعد میں پیدا ہوئی۔ اس کے باوجود کہ مغربی علما کی اکثریت حضرت محمد ﷺ کے حوالے سے منفی انداز میں لکھتی رہی لیکن اس کے خلاف مسلمانوں میں ردعمل بہت بعد میں پیدا ہوا۔ دو سو سال پہلے تک مسلمان یورپی اقوام سے بہت کم باخبر تھے۔ یورپ کی تاریخ میں صلیبی جنگوں کی نہایت اہمیت ہے کیونکہ ان جنگوں سے ان کی شناخت کے حوالے جڑے ہوئے ہیں، لیکن ان جنگوں نے صرف مشرق قریب کے مسلمانوں کی زندگیوں پر ہی اپنے اثرات مرتب

کئے۔ جبکہ باقی اسلامی دنیا میں اس کے اثرات نہیں پہنچ سکے یا اس شدت سے نہیں پہنچے۔ وہاں یہ سب کچھ کہیں دور ہونے والے واقعے سے زیادہ اہم کچھ نہیں تھا۔ ایران اور عراق میں ان جنگوں نے کوئی خاص ہلچل پیدا نہیں کی۔ وہ مغرب کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اس کے خلاف اس قدر شدید نفرت موجود ہے۔ نہ ہی وہ بطور دشمن انہیں کچھ زیادہ اہمیت دینے پر تیار تھے۔ اصل میں جب مسلمان مسیحی دنیا کے بارے میں کوئی تصور بناتے تو ان کے ذہنوں میں یورپ نہیں بلکہ بازنطینی سلطنت آتی۔ اس موقع پر مغربی یورپ وحشی قبائل پر مشتمل تھا جن کا باقی مہذب دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یورپ میں مسلمانوں کے خلاف تیاریاں ہوتی رہیں اور مسلمان سمجھ نہیں پائے کہ تاریخ میں ان کے خلاف کیا ہونے جا رہا ہے۔ مصر میں نپولین کی جنگی مہم مشرق قریب کے مسلمانوں کے لئے ایک ششدر کر دینے والی شے تھی۔ ان کی حیرت کی وجہ فرانسیسی افواج کا انقلابی افواج میں تبدیل ہونے کا عمل تھا۔ مسلمان نے ہمیشہ دوسری اقوام کو خوش آمدید کہا اور ان کے خیالات سے سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مغرب کے جدید اور انقلابی خیالات کی قدر کی اور انہیں سمجھنے کی بطور خاص کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہر اہم مسلمان عالم مغربی تصورات سے واقف تھا اور ان کی اکثریت آزاد سوچ کی حامل تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان علما کے ذہنوں میں مغربی استعماریت کے خلاف نفرت موجود ہو، لیکن وہ ہمیشہ یہ سوچ رکھتے تھے کہ یہ پالیسیاں خالصتاً سیاسی نوعیت کی ہیں اور یورپ کے آزاد سوچ رکھنے والے لوگ یقیناً ان پالیسیوں کے مخالف ہوں گے۔ وہ لارڈ کرومر جیسے لوگوں کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ وہ اس بات کے معترف تھے کہ مغربی طرز زندگی کئی حوالوں سے قابل مثال ہے۔ ان کا خیال تھا کہ بہت سے اسلامی ضوابط اور تصورات اہل مغرب نے اپنا لیے تھے اور اسی لیے وہ ایک مثالی زندگی گزار رہے تھے، لیکن گزشتہ پچاس برسوں میں مسلمانوں کے ذہنوں میں ہمارا یہ امیج چکنا چور ہو کر رہ گیا۔ دوسری طرف اسلامی دنیا بتدریج علیحدگی پسندی کا رویہ اپناتی گئی۔ اس کی وجہ اہل مغرب پر یہ جائز شک بنا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ وہ اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی ذات مبارک کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ جبکہ یہ نفرت مغربی اذہان میں اتنی گہرائی تک اپنی جڑیں پیوست کر چکی ہے کہ مسلمانوں کے حوالے سے ان کی تمام پالیسیاں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ شامی ادیب رعنا کبانی، عیسائیت کے نام ایک خط میں رقم طراز ہے:

> کیا یہ درست نہیں کہ مغربی ضمیر جانبدار ہے؟ مغرب افغان مجاہدین کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے کیونکہ مارکیٹ میڈیا اور حکومت نے ان جذبات کی آب یاری اہل مغرب

> کے ذہنوں میں کی ہے، لیکن ان مسلمان مجاہدین کے لئے اس کے دل میں کوئی ہمدردی نہیں ہے جو مختلف ملکوں میں آزادی کی تحریکوں کو اپنے خون سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل مغرب دنیا میں بڑی طاقتوں کے درمیان جاری سرد جنگ کا حصہ نہیں بنتے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مقبوضہ علاقوں میں فلسطینی مجاہدین روزانہ مارے جا رہے ہیں۔ اب تک کے اعداد و شمار کے مطابق 600 شہید ہو چکے ہیں۔ جبکہ تیس ہزار کے قریب زخمی ہو چکے ہیں۔ اور بیس ہزار کے قریب ایسے بھی ہیں جو کسی مقدمے سے گزرے بغیر جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ ان ظالمانہ کاروائیوں کے باوجود اسرائیل مغرب کی نظر میں ایک جمہوری حکومت ہے۔ اسے وہ مغربی تہذیب کا نمائندہ قرار دیتا ہے۔ ایسے دوہرے معیارات پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ (۶۱)

اسلامی دنیا میں جو انقلابی اور جارحانہ سوچ ارتقاء پذیر ہو رہی ہے، اس کی ذمہ داری مغربی ممالک کی پالیسیوں پر عائد ہوتی ہے۔ س وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مغرب کے بارے میں ایک برا تاثر رکھتی اور اسے ایک لا دین، غیر منصفانہ اور غیر مہذب معاشرہ قرار دیتی ہے۔ کچھ مغربی علما ایسے ہیں جو اسلامی دنیا میں پیدا ہونے والے اس نئے رویے کو ناقدانہ انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان علما میں میکسیم روڈنس (Maxime Rodinson)، نکی آرکیڈی (Nikki R. Keddie) اور گیلز کیپل (Gills Kepel) شامل ہیں، لیکن حسب دستور ایسے لوگوں کی تعداد مغرب میں بہت کم ہے جو اسلامی دنیا میں برپا ہونے والے انقلابات کو سمجھنے کی خواہش محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ غالب رجحان یہ ہے کہ اہل مغرب اپنی صدیوں پرانی نفرت کو زندہ رکھنے کے خواہاں ہیں۔

سلمان رشدی اور ''شیطانی آیات''

کیرن آرمسٹرانگ کہتی ہیں کہ اہل مغرب کے لئے یہ سمجھنا کافی دشوار ہے کہ مسلمانوں نے سلمان رشدی کے ناول ''شیطانی آیات'' میں حضرت محمد ﷺ کی منفی سراپا کشی پر اتنا شدید ردعمل کیوں پیش کیا؟ یہ بات سوچنے میں عجیب لگتی ہے کہ ایک ناول ایسی شدید نفرت کا باعث بن سکتا ہے۔ ایسی نفرت جو مغرب کے دانشور اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اسلام ناقابل اصلاح عدم رواداری پر مبنی مذہب ہے۔ برطانیہ کے شہریوں کے لئے یہ بات پریشان کن ہے کہ خود ان کے شہروں میں مسلمان برادریاں اپنی اجنبی روایات اور عقائد کے ساتھ زندگیوں بسر کرتی ہیں اور ان کیدفاع کے لئے جان کی

قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتیں، لیکن اس معاملے میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو برطانویوں کو اپنا ماضی یاد دلاتی ہیں۔ بریڈفورڈ میں مسلمانوں کے ہاتھوں اس ناول کے نسخے جلائے جانے کے واقعے سے کیا برطانوی شہریوں کو مسیحی یورپ میں مذہبی کتابیں جلائے جانے کے واقعات یاد نہیں آتے۔

مثال کے طور پر ۱۲۴۲ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے، جو رومن کیتھولک کلیسیا کا ایک سند یافتہ ولی تھا، یہودیوں کی تلمود پر الزام لگایا کہ اس میں یسوع مسیح ؑ کے بارے میں گستاخانہ کلمات موجود ہیں۔ اس کتاب کی فروخت پر پابندی عائد کی گئی اور اس کے نسخوں کو بادشاہ کی موجودگی میں سر عام جلایا گیا۔ بادشاہ لوئی کو اس بات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنے اختلاف کے بارے میں یہودیوں سے دوستانہ ماحول میں عقلی بنیادوں پر مذکرات کرے۔ اس نے ایک بار بیان دیا تھا کہ ''کسی یہودی سے مذاکرات کا بس ایک ہی مناسب طریقہ ہے کہ تلوار کو پوری قوت سے اس کے پیٹ میں اتنا اندر تک گھونپ دیا جائے جتنی اندر وہ جا سکے''۔ یہ بادشاہ لوئیس ہی تھا جس نے مذہبی تحقیقاتی ادارے، Inquisition کو حکم دیا کہ وہ مسیحی بدعت پسندوں کو گرفتار کرے۔ اس ادارے کی کارروائیوں کے ن تیجے میں کتابیں ہی نہیں جلائی گئیں بلکہ ہزاروں مردوں اور عورتوں کو بھی زندہ جلایا گیا۔ اسے مسلمانوں سے بھی سخت نفرت تھی۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف دو صلیبی لڑیں۔ لوئی کے دور میں یہ رویہ عیسائیت نے اپنایا ہوا تھا کہ وہ کسی دوسرے مذہب کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ (٦٢)

۱۱ستمبر کے بعد مغربی وصہیونی مسیحی مبلغین کا اسلام مخالف پروپیگنڈا

پھر ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کا اندوہناک واقعہ ہوا جس میں مسلمان اور انتہا پسندوں نے نیویارک میں عالمی تجارتی مرکز اور پینٹاگون کے ایک حصے پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں پانچ ہزار سے زائد افراد مارے گئے۔ یہ ہولناک کارروائی بظاہر ان تمام منفی تصورات کو سچ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے جو اہل مغرب کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں موجود ہیں۔ کیرن آرمسٹرانگ لکھتی ہیں:

> اس الم ناک حادثے کے بعد دنیا بھر میں ہونے والے مباحث کے دوران اسلام کے مخالفین نے چن چن کر قرآن مجید کی ان آیات کے حوالے پیش کیے جن میں جارحیت پسندانہ رویہ جھلکتا ہے۔ اس آیات کی بنیاد پر وہ یہ دلیل دیتے تھے کہ ان کے زیر اثر متشدد انہ رجحانات ہی پنپ سکتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر یہ ناقدین اکثر اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہودیت اوار عیسائیت سے متعلق الہامی صحائف میں بھی اس نوع کے بیانات ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ (٠٠)

امریکی ٹی وی چینل CBS کی معروف صحافی باربرا وکٹر (Barbara Victor) ۱۱ستمبر کے بعد امریکہ کی مذہبی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> ۱۱ستمبر کے بعد پورے امریکہ کی Evengelical کلیسیائیں اور سیمنریاں نہ صرف اسلام کے خلاف لیکچرز دینے اور کتابیں لکھنے میں مصروف ہیں، بلکہ اُن ہتھکنڈوں کو بھی پرموٹ کر رہی ہیں کہ جس سے مسلمانوں کو مسیحی مذہب میں داخل کیا جا سکے۔ (١)

معروف امریکی صدر جمی کارٹر 9/11 کے بعد مسلمانوں کے حوالے سے امریکی طرز عمل پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 9/11 کے حملوں کے بعد امریکی حکومت نے غیر ضروری ردعمل ظاہر کرتے ہوئے پورے امریکہ میں 1200 سے زیادہ بے گناہ افراد کو گرفتار کروالیا، ان میں سے کوئی ایک بھی پہلے کبھی کسی دہشت گردی سے مربوط جرم میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ ان کی شناخت راز میں رکھی گئی، اور انہیں اپنے خلاف عائد کئے گئے الزامات سننے کا یا قانونی مشاورت حاصل کرنے کا موقعہ بالکل نہیں دیا گیا، گرفتار ہونے والے تقریباً سارے افراد عرب یا مسلمان تھے اور بیشتر کو امریکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ (١١٥)

صہیونی بائبل کے سب سے مقدس اور محترم حصے 'توریت' میں بنی اسرائیل کو بار بار یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ کنعانیوں کو موعودہ سرزمین سے نکال باہر کریں۔ ان کی عبادت گاہوں کو تباہ کر دیں اور ان کے ساتھ امن کا کوئی معاہدہ نہ کریں۔ یہودی بنیاد پرستوں کی ایک مختصر تعداد نے انہی آیات کی بنیاد پر فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی جارحیت کا جواز پیش کرنے اور مشرق وسطی میں امن کوششوں کو بے بنیاد قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ تاہم کم ہی لوگ ہوں گے جو یہودیت کے بارے میں یہ بات جان سکیں کہ توریت میں موجود یہ آیات اس مذہب کی درست نمائندہ نہیں ہیں اور یہ کہ انہیں ان معنوں میں استعمال کرنا سراسر غلط ہے۔ اسی طرح یسوع مسیح کا سراپا ایک صلح جو اور امن پسند انسان کا ہے، لیکن انجیلوں میں مختلف موقعوں پر ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ جارحانہ رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک موقع پر تو وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کے زمین پر نزول کا مقصد امن کا قیام نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔ کیرن لکھتی ہیں:

> ان ناقدین میں سے کوئی تب نہیں بولا جب مسیحی سربوں نے سربیر نیکا میں آٹھ ہزار

مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ تب کسی نے عیسائیت کے بارے میں تو یہ فتویٰ نہیں دیا کہ یہ مذہب امن عالم کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مذہب سے واقفیت رکھنے والے بہت سے لوگ ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اس پر جارحیت پسندی کو فروغ دین کا لازام دھرنا درست نہیں ہے، لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اہل مغرب کی بڑی تعداد اسلام کے بارے میں ناکافی معلومات رکھتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کے بارے میں کوئی درست رائے رکھنے کے اہل نہیں ہیں۔ (۶۳)

ڈنمارک کے اخبار میں گستاخانہ خاکے

یولاند پوسٹ ڈنمارک کا مشہور اخبار ہے۔ اس اخبار کا ایڈیٹر پڑھے لکھے طبقے میں بہت مشہور ہے۔ ڈنمارک کے بے شمار لکھاری مصنف اور صحافی اس کے ذاتی حلقے میں شامل ہیں۔ ایڈیٹر کے لکھاری دوست نے پچھلے سال ستمبر میں نبی کریم ﷺ کی حیات پر ایک گستاخانہ کتاب لکھی تھی۔ وہ اس کتاب میں (نعوذ باللہ) نبی کریم ﷺ کے خاکے شامل کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے خاکے بنوانے کے لیے مختلف آرٹسٹوں سے رابطے کیے تو تمام آرٹسٹوں نے خاکے بنانے سے انکار کر دیا۔ ان آرٹسٹوں کا کہنا تھا: مسلمان اسے توہین رسالت سمجھتے ہیں اور اگر انہوں نے کوئی ایسی حرکت کی تو ان کی زندگی خطرے کا شکار ہو جائے گی۔ وہ لوگ ہالینڈ کی مثال دیتے تھے جہاں ایک گستاخ فلم ساز نے ایک برہنہ عورت کے جسم پر آیت لکھ دی تھی جسے ایک مسلمان نوجوان نے قتل کر دیا تھا۔ قتل کے بعد جب مقدمہ چلا تو اس نوجوان نے عدالت سے درخواست کی: ''مہربانی کر کے مجھے پھانسی کی سزا دی جائے کیونکہ اگر میں زندہ رہا اور کسی دوسرے شخص نے میرے سامنے گستاخی کی تو میں اسے بھی قتل کر دوں گا''۔ ان آرٹسٹوں کا کہنا تھا: اس قاتل نوجوان کا یہ بیان مسلمانوں کی ذہنیت اور طرز فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مذہب، نبی کریم ﷺ کی مقدس و مطہر شخصیت اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ذات پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے چنانچہ ہم لوگ اپنی جان کا رسک (خطرہ) لینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جب یہ مصنف ہر طرف سے ناکام ہو گیا تو وہ یولاند پوسٹن کے ایڈیٹر کے پاس آ گیا اور اس نے اس سے شکایت کی: ''ہمارے ملک کے تمام آرٹسٹ بزدل ہیں، یہ لوگ مسلمانوں کے پیغمبر کا خاکہ تیار کرنے پر تیار نہیں ہیں''۔ ایڈیٹر نے مصنف سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے ''بزدلی'' کی ساری وجوہ بتا دیں۔ ایڈیٹر نے اس کے جواب میں کہا: ''آرٹسٹ بلاوجہ پریشان ہیں، ڈنمارک ایک لبرل اور سیکولر ملک ہے اور اس میں آباد تمام مسلمان بھی ڈنمارک کے لوگوں کی طرح ہیں۔ یہ لوگ ڈنمارک کے لوگوں

کے کلچر میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری زبان بولتے ہیں، ہمارے جیسے کپڑے پہنتے ہیں، ہمارے جیسے کھانے کھاتے ہیں اور ان میں بھی وہ تمام بری عادتیں موجود ہیں جو ہمارے لوگوں میں ہیں لہٰذا ڈنمارک کے مسلمان اس پر کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ مصنف نے اس کے جواب میں کہا: ''مسلمان ذرا مختلف قسم کی قوم ہیں۔ یورپ اور امریکہ کا عیسائی آپس میں تقسیم ہے۔ وہ ناروے کا عیسائی، ڈنمارک کا عیسائی اور برطانیہ کا عیسائی ہے چنانچہ ہم سب کے مسائل مقامی اور اپنے ہی ملک تک محدود ہیں۔ مسلمان آپس میں تقسیم ہیں لیکن بعض ایسی باتیں، بعض ایسے مسائل ہیں جن پر ان لوگوں کی سوچ ایک ہوتی ہے، جن پر ان کا ردِعمل یکساں ہوتا ہے۔ یہ لوگ ان باتوں پر نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک ایک ہی قسم کا ردعمل ظاہر کرتے ہیں''۔ مصنف کے جواب میں ایڈیٹر کو بڑی حیرت ہوئی لہٰذا اس نے ٹیسٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اخبار کے کارٹونسٹ کو بلایا، اسے آئیڈیا دیا اور اس کارٹونسٹ نے گستاخی کا عمل شروع کر دیا۔ اس بدبخت نے نبی اکرم ﷺ کے (نعوذ باللہ) بارہ خاکے بنائے اور یہ خاکے ایڈیٹر کے حوالے کر دیے۔ ایڈیٹر نے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء کو اخبار میں یہ خاکے شائع کر دیے۔

یہ خاکے چھپنے کی دیر تھی کہ ڈنمارک کے مسلمانوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ تمام نوجوان جن کے بارے میں ایڈیٹر کا خیال تھا کہ یہ لوگ مغربی ثقافت میں پوری طرح رچ بس گئے ہیں، ان کے اندر کا مسلمان فوت ہو گیا ہے اور یہ لوگ اب کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ وہ نوجوان شعلہ جوالہ بن گئے اور ان نوجوانوں نے کوپن ہیگن کے تمام اسٹالوں سے اخبارات اٹھا لیے اور ان تمام اخبارات کو چوک میں رکھ کر آگ لگا دی۔ اس کے بعد وہ اخبار کی عمارت کی طرف بڑھے، اخبار کی انتظامیہ نے فوراً پولیس طلب کر لی، پولیس آئی اور اس نے عمارت کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ نوجوان وہاں پہنچے تو پولیس کے کمانڈوز نے انہیں روک لیا۔ یہ لوگ غیر مسلح تھے لیکن اس کے باوجود محسوس ہوتا تھا ان کے اندر آگ لگی ہے اور یہ کسی بھی وقت شعلے بن سکتے ہیں۔ حالات کو یوں خراب ہوتے دیکھ کر اخبار کا ایڈیٹر فرار ہو گیا جبکہ پولیس نے اس اخبار سے وابستہ تمام کارٹونسٹوں کے گھروں پر پہرے بٹھا دیے اور شہر کے تمام آرٹسٹوں کی نقل و حمل محدود کر دی۔ پولیس کا خیال ہے مسلمان نوجوان تمام آرٹسٹوں کو ہدف بنا سکتے ہیں۔

یہ آگ اگلے دن سویڈن اور ناروے پہنچ گئی اور وہاں کی مسلمان کمیونٹی نے بھی احتجاج شروع کر دیا۔

۱۰ جنوری کو ناروے کے ایک جریدے ''میگزنیت'' نے بھی یہ سارے خاکے شائع کر دیے جبکہ وہاں کے ایک بڑے اخبار ''راگ بلادت'' نے انہیں انٹرنیٹ پر جاری کر دیا جس کے ردعمل میں وہاں بھی ڈنمارک اور ناروے کی صورت حال پیش آ گئی اور پولیس کو اس میگزین اور اس اخبار کی عمارت کے سامنے بھی مورچے لگانا پڑ گئے۔ ڈنمارک اور ناروے کی صورت حال کو عالمی نشریاتی اداروں نے اٹھایا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس

صورت حال کی مدد سے عالم اسلام کو مزید بدنام کرسکیں گے لیکن جوں ہی بی بی سی، سی این این، اے بی سی، واشنگٹن پوسٹ اور نیویارک ٹائم میں یہ خبر شائع ہوئی یہ ایشو پورے عالم اسلام تک پہنچ گیا اور تمام اسلامی ممالک میں یورپ اور امریکہ کے خلاف احتجاج شروع ہوگئے۔ اس دوران گیارہ اسلامی ممالک کے سفیروں نے ڈنمارک کے وزیر اعظم سے ملاقات کی کوشش کی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کردیا کہ یہ پریس کی آزادی کا معاملہ ہے اور وہ اس میں مداخلت نہیں کرسکتے۔ آگ کو تیز کرنے اور جلتی پر تیل ڈال کر اُسے مزید بھڑکانے کے لیے جنوری ۲۰۰۶ء میں ۲۲ ممالک کے ۷۵ اخبارات و رسائل میں انھیں شائع کیا گیا۔ ۲۰۰ ریڈیو اور ٹی وی چینلوں پر اُنھیں دوبارہ بلکہ سہ بارہ نشر کیا گیا۔ اور یہ سب آزادیِ اظہار، آزادیِ صحافت اور سیکولر جمہوریت کے نام پر کیا گیا۔ ہالینڈ کے اخبارات نے لکھا کہ ہم یہ کارٹون ہر ہفتے شائع کیا کریں گے تاکہ مسلمان ان کے عادی ہوجائیں۔ اٹلی کے ایک وزیر نے ان کی ٹی شرٹ خود استعمال کی اور اسے ایک فیشن کے طور پر فروغ دینے کے پروگرام کا اعلان کیا۔

اس کے بعد مسلمانوں کا ردعمل اور احتجاج پانچ براعظموں تک پھیل گیا۔ دمشق اور بیرت میں ڈنمارک اور ناروے کے سفارت خانے جلا دیے گئے۔ فلسطین میں یورپی یونین کے ہیڈکوارٹر پر پتھراؤ کیا گیا۔ سعودی عرب، شام اور ایران نے ڈنمارک سے اپنے سفیروں کو واپس بلالیا۔ ایران نے گستاخانہ خاکے شائع کرنے والے ممالک کے ساتھ تمام معاہدے منسوخ کردیے۔ افغانستان، انڈونیشیا، اردن، کویت میں بہت بڑے مظاہرے ہوئے۔ پاکستان میں حکومت نے دس ممالک کے سفراء کو بلا کر احتجاج ریکارڈ کرایا۔ ان یورپی اخبارات میں پیغمبر اسلام کے بارے میں توہین آمیز اور گستاخانہ خاکوں کی اشاعت نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچائی ہے۔

آزادی اظہار رائے کا مغربی معیار

اگر الجزیرہ عرب ٹی وی چینل پر امریکی فوجیوں کی لاشیں دکھائی جائیں تو یہ اقدام قابل گرفت جرم بنتا ہے اور اگر بی بی سی ورلڈ ٹی وی چینل پر یہی خاکے دنیا بھر میں بار بار نشر کیے جائیں تو یہ ''آزادی اظہار رائے'' کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح اگر ''ہولوکاسٹ'' سے متعلق کوئی کارٹون یا مواد یہودیوں کے خلاف یورپ میں چھاپا جائے تو فوراً اس کے خلاف کارروائی کی جاتی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں یہودیوں اور ان کے مذہب کے خلاف کچھ لکھنا بھی آزادی اظہار رائے کے زمرے میں نہیں آتا۔ انہیں مکمل قانونی تحفظ دیا گیا ہے۔ اسی طرح ملکہ برطانیہ کے خلاف بھی کچھ کہنے چھاپنے پر سخت قوانین ہیں۔ امریکہ میں یسوع مسیح علیہ السلام کی شان میں گستاخی والی فلم بھی چلنے نہیں دی گئی اور اسی طرح ماضی میں یسوع مسیح علیہ السلام کے کارٹونوں کی اشاعت سے متعدد اخبارات نے انکار کردیا تھا تو پھر اسلام اور حضرت محمد

صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اس طوفان بدتمیزی کے برپا کرنے کا کیا جواز تھا؟

پاکستان میں احتجاج

صدر پاکستان جناب جنرل پرویز مشرف نے امریکی وایشیائی صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> توہین آمیز کارٹونوں کے خلاف تمام مسلمان متحدہ ہیں اور ہم سب اس کی مذمت کرتے ہیں۔ توہین آمیز خاکوں نے انتہاپسند اور اعتدال پسند مسلمانوں کو اکٹھا کردیا ہے۔ (۶۴)

وزیر اعظم پاکستان جناب شوکت عزیز نے وزیر اعظم ہاؤس میں بنگلہ دیش کی وزیر اعظم بیگم خالدہ ضیاء کے اعزاز میں دی گئی ضیافت سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> اسلام امن، برداشت اور ہم آہنگی کا درس دیتا ہے، ہم توہین آمیز خاکوں کی اشاعت اور دوبارہ اشاعت کی بزور مذمت کرتے ہیں۔ اظہار کی آزادی دوسرے لوگوں کے جذبات مجروح کرنے یا ان کے عقائد اور اقدار کی دانستہ طور پر تحقیر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے۔ (۶۵)

ایک اور موقع پر وزیر اعظم شوکت عزیز نے اطالوی نائب وزیر خارجہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> توہین آمیز خاکے بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے خطرہ ہیں۔ آزادی صحافت کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کی تہذیب و ثقافت کو نشانہ بنایا جائے۔ ایک دوسرے کے عقائد کے احترام سے ہی دنیا کو پرامن بنایا جاسکتا ہے۔ (۶۶)

۳ فروری بروز جمعۃ المبارک پاکستان کی سینیٹ اور قومی اسمبلی میں متفقہ مذمتی قراردادیں منظور کی گئیں۔ سینیٹ کی قرارداد میں کہا گیا کہ یورپی ذرائع ابلاغ اسلام کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں، جبکہ قومی اسمبلی کی قرارداد میں کہا گیا کہ ''اسلام نے تمام مذاہب کے احترام کی تلقین کی ہے اسی لیے مسلمان دیگر مذاہب اور تہذیبوں سے بھی اسی طرز عمل کی توقع رکھتے ہیں۔ سینیٹ کے اجلاس میں کہا گیا کہ یورپی ممالک کے ذرائع ابلاغ بالخصوص ڈنمارک کے اخبار میں توہین رسالت پر مبنی خاکوں کی اشاعت کی پرزور مذمت کی جاتی ہے۔ یہ قائد ایوان وسیم سجاد نے اپوزیشن کے سینیٹروں سے مشاورت کے بعد ایوان میں پڑھ کر سنائی۔ جس کی متفقہ طور پر منظوری دی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ان خاکوں کی اشاعت نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود یورپی

اخبارات مسلمانوں اور اسلام کو بغض اور حسد کی وجہ سے تنقید کا مسلسل نشانہ بنا رہے ہیں۔ اس اشتعال انگیز مہم کو آزادی اظہار یا آزادی رائے کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ آزادی ذمہ داری کی متقاضی ہوتی ہے۔ اور آزادی کا مطلب دوسروں کے ایمان، عقیدے اور جذبات کا مجروح کرنا یا گالی دینا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ (۶۷)

گستاخانہ خاکے: کیا یہ مسیحیت کا اسلام پر حملہ ہے؟

اس گستاخانہ حرکت نے بین المذاہب ہم آہنگی کے میدان میں مخلصی سے کام کرنے والے اہل علم کے لیے بھی شدید دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ مسلمانوں کے احتجاج اور جواباً بعض یورپی ممالک کے سربراہان کا منفی رویہ اس سوچ کو بھی پروان چڑھا رہا ہے کہ یہ حرکت یورپ میں بسنے والے شرپسندوں نے نہیں کی بلکہ یہ مسیحیت کا اسلام پر حملہ ہے اور اس کا ہر مسیحی ذمہ دار ہے۔ اور بین الاقوامی سطح پر مسیحیوں نے اسلام کے خلاف میڈیا کا ہتھیار استعمال کر کے صلیبی جنگ شروع کر دی ہے۔ چنانچہ محترم جناب ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب اپنے کالم بعنوان ''صیہونیت زدہ صلیبی مغرب اور مسلمان'' میں لکھتے ہیں:

> یہ موقع ہے کہ مسیحی دنیا صیہونیت کے چنگل سے آزاد ہونے کے علاوہ صلیبی کمپلیکس سے بھی چھٹکارا حاصل کرلے، اس کے بعد عالم اسلام اور مسیحی دنیا اشتراک عمل سے دنیا میں قیام امن کو ممکن بنا سکتے ہیں۔ جس دن مسیحیت اپنے احساس صلیب اور صیہونی چنگل سے نکل آئے گی اس دن عالم انسانیت کو خطرات سے نجات مل جائے گی اور یہی اسلام کا مقصود ہے!!! (۶۸)

جس طرح محترم جناب ڈاکٹر ظہور احمد صاحب نے ایک مخصوص شرپسند اور اقلیتی طبقے کی حرکات کا ذمہ دار پورے عالم مسیحیت کو ٹھہرایا ہے اس سوچ اور فکر پر تو صرف انا للہ وانا الیہ راجعون ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ تو بالکل اسی طرح ہے کہ کوئی اسلام کے نام پر دہشت گردی پھیلانے والوں کا ذمہ دار سارے عالم اسلام کو ٹھہرا دے۔ ڈاکٹر صاحب کی منطق ہمارے ان روایتی رویوں کی نشان دہی کرتی ہے جس کے تحت ہم محمود کی ٹوپی ایاز کے سر پر رکھنے کے عادی ہوچکے ہیں۔

ایک اور سینئر صحافی جناب ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم کا عنوان ''اشتعال انگیز کارٹون - اسلام سے عیسائی مغرب کا بغض'' رکھا ہے۔ (۶۹) پھر اپنے ایک اور کالم بعنوان ''مغربی تہذیب اسلام دشمنی کے عمیق اسباب'' کے تحت فرماتے ہیں۔

> کوئی سمجھے یا نہ سمجھے، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے ڈنمارک میں شائع ہونے والے اہانت آمیز خاکے اس عیسائی اور مغربی ذہنیت کا اظہار ہیں جو اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں صدیوں سے مشہور ہیں۔ (۷۰)

محترمہ طیبہ ضیاء ''مکتوب امریکہ'' کے تحت اکثر نوائے وقت میں لکھتی ہیں۔ آپ نے اپنی دینی غیرت کا اظہار فرماتے ہوئے پورے مغرب اور عالم یورپ کو ''سود خور قوم'' کے اعزاز سے نوازا ہے اور یہی آپ کے کالم کا عنوان بھی ہے۔ آپ فرماتی ہیں:

> یہ سود خور قوم Sin and Sikness کا شکار ہے۔۔۔ حلال اور طیب غذا کا استعمال کرنے والے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس فطرتِ سور کی حامل بیمار قوم سے صحت مند اور نارمل باتوں کی توقع نہ رکھیں۔ (۷۱)

البتہ ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ محترمہ خود ''سود خور قوم'' میں رہنا کیوں پسند فرماتی ہیں اور حلال اور طیب غذا کھانے والی قوم میں واپس تشریف کیوں نہیں لے آتیں؟

ہمارے نزدیک تو اس گستاخانہ جسارت کی نسبت مسیحیت کی طرف کرنا تو محض مسیحی مذہب کی تعلیمات سے ناواقفیت اور جذباتی ردعمل ہے۔ جہالت کا جواب جہالت سے دینے پر ماحول میں کس طرح بہتری پیدا ہوسکتی ہے؟

آپ بائبل مقدس کی پہلی کتاب ''پیدائش'' سے لے کر آخری کتاب ''مکاشفہ'' تک پڑھ لیں آپ کو کہیں بھی یہ تعلیم نہیں ملے گی کہ آزادی رائے کی آڑ میں توہین الٰہی، توہین رسالت و مذہب کی اجازت ہے۔ اس کے برعکس بائبل مقدس میں جابجا یہ تعلیم ملتی ہے کہ دوسرے مذاہب کے عقائد و نظریات اور مذہبی جذبات کا احترام کرنا ایک سچے مسیحی کے اولین فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ پولس رسول لکھتے ہیں:

> ﴿ مگر بیوقوفی کی حجتوں اور نسب ناموں اور جھگڑوں اور ان لڑائیوں سے جو شریعت کی بابت ہوں، پرہیز کر۔ اس لیے کہ یہ لاحاصل اور بے فائدہ ہیں ﴾ ططس ۹:۳

پیار محبت اور ادب و احترام بائبل مقدس کی تعلیمات کی بنیاد ہے مگر اس کے باوجود کوئی فتنہ پروری سے باز نہ آئے اور معاشرے کے امن و سکون کو برباد کرنے کے درپے ہو تو بائبل مقدس اس پر بہت سخت رویہ اختیار کرتی ہے۔ بائبل مقدس کے کسی بھی مقام سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آزادی رائے کی آڑ میں دوسرے مذاہب کی توہین و تحقیر کی جائے۔ بلکہ اس کے برعکس ہمیں مذہبی معاملات میں ادب و احترام

کے دامن کو سختی سے تھامے رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ آزادی رائے محض ایک جدید مغربی ہتھیار ہے جس کا مسیحی مذہب کی تعلیمات سے ہرگز ہرگز کوئی تعلق نہیں (اس موضوع پر تفصیلی گفتگو میری دوسری کتاب ''قانون توہین رسالتؐ: مسیحی اور اسلامی تعلیمات و تاریخ کی روشنی میں'' ملاحظہ فرمائیں)۔ لہٰذا یورپی اخبارات کی اس گستاخانہ حرکت کا ذمہ دار مسیحی مذہب اور مسیحی پیروکاروں کو ٹھہرانا کسی طرح بھی درست نہیں۔

فتنہ پروری اور غلیظ ذہنیت بھی ایک عالمگیر مذہب ہے

جس طرح مسلمان ممالک میں بعض فتنہ پرور اور غلیظ ذہنیت کے افراد پائے جاتے ہیں اسی طرح مغربی ممالک میں ایسے افراد کی کمی نہیں۔ جیسے اسلامی معاشروں میں مذہبی لبادہ اوڑھے شرپسند عناصر کی کمی نہیں ویسے ہی مغرب میں بھی گندی فطرت اور سوچ رکھنے والے مذہبی نمائندے پائے جاتے ہیں۔ جس طرح ایسے لوگ اسلام اور اسلامی معاشروں کا نمائندہ تصور نہیں ہوتے بالکل اسی طرح مغربی معاشروں میں پائے جانے والے یہ افراد نہ تو مغرب کے نمائندہ ہیں اور نہ ہی مسیحیت کے۔ جس طرح اسلامی معاشروں میں خبیث الفطرت لوگوں کی کمی نہیں اسی طرح مغربی معاشروں میں بھی خبیث الفطرت افراد کی کمی نہیں ہے خواہ وہ کسی اخبار کا ایڈیٹر ہو، یا کسی طاقت ور ریاست کا سربراہ۔

اسلام اور مسیحیت کا خدا نہ تو مشرقی ہے اور نہ ہی مغربی

یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ جس طرح اسلام کی حقیقی تعلیمات اور بعض مسلمانوں کی ذاتی بدکرداری میں فرق قائم رکھنا بہت ضروری ہے اسی طرح یسوع مسیح کی تعلیمات اور بعض مسیحی افراد کی ذاتی بدکرداری میں بھی فرق قائم رکھنا امن وامان اور باہمی بھائی چارے کی فضا قائم رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ جس طرح مشرق اسلام کا نمائندہ نہیں اسی لیے مغرب بھی مسیحیت کا نمائندہ نہیں۔ جس طرح اسلام کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے مشرقی رسم ورواج پر نہیں بلکہ اسی طرح مسیحیت کی بنیاد بائبل مقدس پر ہے مغربی رسم ورواج پر نہیں۔ اسلام اور مسیحیت کا خدا نہ تو مشرقی ہے اور نہ ہی مغربی۔ وہ رب العالمین ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾

اور مشرق ومغرب (سب) اللہ ہی کا ہے، پس تم جدھر بھی رُخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)، بے شک اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے

والا ہے۔ سورۃ البقرہ ۲: ۱۱۵

ہمیں چاہیے کہ بعض یورپی اخبارات کی جہالت کا جواب جہالت سے دینے کے بجائے اپنی سوچ اور تنقید کی سمت کو درست رکھیں۔

بعض صحافیوں کی صحافتی عقل وفکر

پاکستان کے صحافتی حلقے نے اس گستاخانہ جسارت پر بہت کچھ لکھا مگر اکثر کے احتجاجی کالموں نے ان کے ''اہل علم'' ہونے کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً شانِ رسالت اور توہین رسالت جیسے حساس موضوع پر مغرب کے سامنے اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے محترمہ عائشہ مسعود ملک صاحبہ اپنے احتجاجی کالم ''مذہبی رواداری'' میں دیکھیے کس قدر علمی وفکری دلیل پیش کرتی ہیں:

> اب ان انگریزوں کو کیا خبر کہ ہمارے تو ٹرکوں اور بسوں، ویگنوں کے پیچھے بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ نہ چھیڑ ملنگاں نوں۔ (۷۲)

محترمہ نسیم زہرا صاحبہ نے تو اپنی صحافتی عقل وفکر کے استعمال کی حد کر دی۔ آپ اپنے احتجاجی کالم ''یورپ کے غیر مہذب ہتھکنڈے'' میں فرماتی ہیں:

> جن لوگوں نے بھی جان بوجھ کر پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں توہین آمیز حرکت کی ہے ان کے ساتھ کوئی جنگ لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے اس غیر مہذب فعل پر اٹھنے والا طوفان میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ (۷۳)

محترمہ نسیم زہرا کے اس بیان پر تو صرف انا للہ و انا الیہ راجعون ہی پڑھا جاسکتا ہے۔

اعلیٰ معیاری صحافتی احتجاج

بہت کم ایسے صحافی تھے جنہوں نے سنجیدہ علمی تنقید کا راستہ اپنا کر صحافتی اور اسلامی اقدار کا پاس رکھا۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی اپنے اداریہ ''مغربی ممالک اسلام کے بارے میں معاندانہ رویوں کو روکیں'' میں لکھتا ہے:

> تہذیبیں آپس میں برسرپیکار اور معرکہ آزما نہیں ہوتیں بلکہ ایک دوسرے کے اچھے اوصاف کو اپنے اندر جذب کر کے اپنا حصہ بنالیتی ہیں اور اس طرح تاریخ کے تہذیبی ارتقاء کو آگے

بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور اسی طرح آگے بڑھتا رہے گا لیکن ۹/۱۱ کے سانحے میں چند انتہاپسند مسلمانوں کے ملوث ہونے کے شواہد سامنے آنے کے بعد امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں اسلام اور دہشت گردی کو آپس میں ایک دوسرے کا مترادف بنانے اور دنیا کے کسی کونے کھدرے میں ہونے والی دہشت گردی کے ہر واقعے کے ڈانڈے بغیر کسی تحقیق کے مسلمانوں کے ساتھ ملانے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس سے امریکہ اور یورپی ممالک کے متعصب حلقوں کو بہت تقویت ملی ہے اور انہوں نے اس کی آڑ میں سرے سے کسی جواز کی موجودگی کے بغیر خواہ مخواہ مسلمانوں کے ذہنوں کو اذیت پہنچانے کا وتیرہ اختیار کرلیا ہے اور اگر صرف ٹون ٹاورز پر حملے کے بعد کے چار سالوں میں مغربی ذرائع ابلاغ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چھپنے والے مواد کو اکٹھا کیا جائے تو ایک طومار بن سکتا ہے۔(۷۴)

روز نامہ نوائے وقت اپنے اداریے ''تہذیبوں کی کشمکش تو جاری ہے'' میں لکھتا ہے:

ڈنمارک کے ایک اخبار میں توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت کے بعد اگر اخبار کا ایڈیٹر متعلقہ کارٹونسٹ اور ڈینش حکومت مسلمانوں سے معذرت کر لیتی تو عالم اسلام اسے فرد واحد کی غلطی یا احمقانہ غیر اخلاقی حرکت قرار دے کر نظر انداز کر دیتا اور کسی کو علم نہ ہوتا کہ یہ کارٹون متعلقہ اخبار نے محض غلطی سے شائع نہیں کیے بلکہ کئی ماہ قبل کارٹونسٹوں کو باضابطہ دعوت دی گئی اور مقابلے میں یہ بےہودہ، گھٹیا اور دلآزار کارٹون منتخب کر کے اخبار میں شائع کیے گئے۔ ڈنمارک کے اخبار میں کارٹونوں کی اشاعت پر مقامی مسلمان احتجاج کر ہی رہے تھے کہ ناروے کے اخبار نے انہیں شائع کر کے اپنے پچاس ہزار سے زائد مسلمان شہریوں کو اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے احتجاج کے بعد یہ سلسلہ رک جاتا مگر ایک طرف تو فرانس، اٹلی، ہالینڈ، آئرلینڈ، سپین اور دیگر کئی ممالک کے اخبارات نے ان کارٹونوں کی اشاعت کے ساتھ اسے آزادی اظہار کا مسئلہ بنا کر پیش کیا تو دوسری طرف مختلف صحافتی تنظیموں نے کارٹونسٹ اور اخبار کے دفاع میں بیان بازی شروع کر دی جو یہ ثابت کرنے کی کوشش تھی کہ یورپی ذرائع ابلاغ، دانشور اور اخبار نویس اسلام دشمنی کے مسئلہ پر متحد ہیں اور انہیں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی کوئی پرواہ نہیں۔ مسلمانوں کے عقائد اور رسول اللہ ﷺ سے والہانہ عقیدت ومحبت کا ہر پڑھے لکھے

یہودی اور عیسائی دانشور اور صحافی کو علم ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ناموس رسالت ﷺ پر مال ہی نہیں اولاد اور جان قربان کرنا ہر مسلمان سعادت سمجھتا ہے۔ اس بنا پر کارٹونوں کی اشاعت ہو یا آزادی اظہار کے نام پر اس کا دفاع، یہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی نظر آتی ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے ردعمل کے ذریعے ان کے جذبہ ایمان کو پرکھنا اور صدر بش کے جاری کردہ کروسیڈ کی کامیابی کا اندازہ لگانا آتا ہے۔ ہر مسلمان اس حقیقت سے واقف ہے کہ دنیا میں جہاں بھی رسول اللہ ﷺ کی توہین اور مسلمانوں کی دلآزاری کا کوئی واقعہ ہوا امریکہ و یورپ کے حکمران، سیاست دان، ذرائع ابلاغ اور دانشوران واقعات کے مرتکب افراد کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین اس لیے امریکہ و یورپ کی آنکھ کا تارہ ہیں اور اس بنا پر ایک گھٹیا قسم کی کتاب کے مصنف سلمان رشدی کو وائٹ ہاؤس میں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔(۷۵)

روز نامہ خبریں اپنے اداریے ''خاکوں کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے اور وزیراعظم کا بیان'' میں لکھتا ہے:

ڈنمارک اور بعض دوسرے یورپی ممالک کے اخبارات میں شائع ہونے والے توہین آمیز خاکوں نے دنیا بھر میں بسنے والے مسلمانوں میں غم وغصہ پیدا کر دیا ہے۔ مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یورپی ممالک نے ان اخبارات کے خلاف کارروائی کے بجائے اسے آزادئ اظہار کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کے خاکوں کی اشاعت ان اخبارات کا حق ہے بلکہ بعض رہنماؤں نے یہ تجویز بھی دی ہے کہ مسلمانوں میں تحمل اور رواداری کو فروغ دینے کے لیے اس طرح کے خاکے تسلسل سے شائع کرنے چاہییں۔ ڈنمارک کے ایک اخبار میں شائع ہونے والے ان خاکوں کی اشاعت کے بعد جس منظم انداز میں یورپ کے دوسرے ممالک میں خاکے شائع ہوئے، وہ اس بات کو ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک منظم سازش کے تحت ہو رہا ہے اور اس کا مقصد مسلمانوں اور یورپی ممالک، جن کی اکثریت عیسائی ہے، کے درمیان اختلافات کو ابھارنا ہے۔ ایسا کام نئے نازی کر رہے ہیں یا اس کے پس پردہ یہودی لابی سرگرم عمل ہے لیکن یہ افسوس ناک امر ہے کہ یورپی ممالک اس اشتعال اور غصے کو کم کرنے کی کوئی تدبیر کے بجائے ایسے بیانات دے رہے ہیں جس سے یہ تاثر مضبوط ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔(۷۶)

محترم قاضی حسین احمد، امیر جماعت اسلامی پاکستان نے ۱۷ فروری ۲۰۰۶ء کو منصورہ میں نمازِ جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> مغربی اور یورپی ممالک میں اظہارِ آزادی کا معیار دوہرا ہے اور اس سے صرف مسلمانوں کو گالی دینے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ یورپ اور مغربی ممالک نے مسلمانوں کے مرکز محبت ناموسِ رسالت ﷺ پر حملہ کرکے ان کی دینی غیرت کا امتحان لیا ہے۔ یورپی ممالک نے نبی آخرالزماںؐ کے توہین آمیز خاکوں اور کارٹون شائع کرکے ایک قبیح حرکت کی ہے۔ دنیا کو انسانیت اور تہذیب کا درس دینے والے یورپی ممالک اس مکروہ فعل کی حمایت میں ایک آواز ہوگئے ہیں۔ (۷۷)

معروف عالم دین اور تحریک منہاج القرآن کے بانی وسرپرست پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی طرف سے عالمی رہنماؤں کے نام خصوصی مراسلہ بعنوان ''دنیا کو تہذیبی تصادم سے بچایا جائے'' میں لکھتے ہیں:

> حقوق اپنی نوعیت کے اعتبار سے باہم معکوس ہوتے ہیں اور ان کی تنفیذ کا دارومدار باہمی طور پر دیگر بنیادی حقوق پر ہوتا ہے۔ اس بات پر اصرار کرنا غلطی ہوگا کہ کوئی حق مطلق ہوتا ہے اس لئے کہ اس حق کی زد دوسروں کے بنیادی حقوق پر پڑسکتی ہے۔ مہذب اور جمہوری دنیا کا حصہ ہونے کے دعویدار ہر ملک نے اظہار کی آزادی پر اپنے معاشرے کے مفاد میں کچھ حدود اور پابندیاں عائد کررکھی ہیں تاکہ ایک خاص سطح کے انسانی طرزِ عمل کو برقرار رکھا جاسکے ایسی پابندیاں بعض اوقات مقامی رسوم ورواج اور معاشرتی روایات پر مبنی ہوتی ہیں تو بعض اوقات ثقافتی اقدار اور مذہبی تعلیمات ان کی بنیاد بنتی ہیں۔ اس کی روح یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاقی، تہذیبی، سماجی اور معاشرتی اقدار اور وقار کے تحفظ کے داعی بنیں۔
>
> لہٰذا اس شور وغوغا کا بلند کرنا کہ مسلمانوں کے احتجاج اور مظاہروں سے آزادیٔ تقریر وتحریر پامال ہورہی ہے حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ مثال کے طور بچوں میں جنسی ہیجان پیدا کرنے والی آزادانہ فحش نگاری یا مذہبی ونسل پرستانہ نفرت کی میڈیا میں تشہیر کرنے پر بجا طور پر بہت سے ممالک میں پابندی لگی ہوئی ہے۔ بہت سے یورپی ملکوں میں عالمی جنگ کی تباہی سے انکار ایک جرم تصور کیا جاتا ہے۔ آسٹریا، بیلجیئم، چیک ریپبلک، فرانس، جرمنی، اسرائیل، ایتھوپیا، پولینڈ، رومانیہ، سلواکیہ اور سویٹزرلینڈ میں یہ ایک

فوجداری جرم ہے جس کی سزا جرمانوں اور قید کی صورت میں دی جاتی ہے۔ ایک برطانوی اخبار (27 جنوری 2003) نے اسرائیلی وزیراعظم ایرول شیرون کا کارٹون شائع کیا جس میں دکھایا گیا کہ وہ ایک فلسطینی بچے کا سر کھا رہا ہے اور کہہ رہا ہے ''اس میں کیا برائی ہے! تم نے اس سے پہلے کسی سیاستدان کو نومولود بچوں کو کبھی چومتے ہوئے نہیں دیکھا''۔ اس کارٹون نے اسرائیل سمیت دنیا بھر کی یہودی آبادیوں میں ایک طوفان برپا کردیا۔ خاکہ حقیقت کے چاہے کتنا ہی قریب ہو یہ ردعمل اس قوم کا اپنے لیڈر کے لئے ایک فطری بات تھی۔

دنیا کے کم وبیش تمام ممالک میں ہرجانہ کے دیوانی قانون کے تحت ہتک عزت کا قانون نافذ ہے جس کے تحت کسی فرد کو کسی کی حق تلفی یا شہرت کے نقصان پر ہرجانہ ادا کرنے کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اس طرح آزادانہ اظہار کے مطلق حق کی تعزیر کسی فرد کے حقوق کو توازن عطا کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔ بعینہٖ اگر کسی کا کوئی عمل ایک خاص قوم یا ملت کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا باعث بنتا ہے تو آزادیٔ تقریر کی آڑ میں اسے کبھی جائز نہیں گردانا جاسکتا۔ مزید برآں بہت سے ملکوں میں مخصوص قومی اداروں کے دستور کی تضحیک وتوہین قانونی طور پر قابل گرفت ہے اور اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ ان قومی اداروں میں فوج، قانونی عدالتیں یا پارلیمنٹ شامل ہیں۔ اس طرح دنیا بھر میں توہین عدالت کا قانون موجود ہے جو آزادی تقریر پر سخت پابندیاں عائد کرتا ہے اس کی خلاف ورزی کرنے پر قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اگر مطلق آزادی اظہار کا قانون موجود ہے تو ان قوانین پر اعتراضات کیوں نہیں اٹھائے جاتے؟ کسی فرد کی عزت وآبرو کا تحفظ ایک بنیادی انسانی حق ہے جس میں نازیبا کلمے اور گستاخانہ الفاظ کہنے اور لکھنے کی ممانعت، ہتک عزت پر پابندی اور مذہبی آزادی کا تحفظ شامل ہے۔ اقوام متحدہ کا منشور اور بہت سے ممالک کے دساتیر اور قوانین میں ان حقوق کے تحفظ کی شق موجود ہے۔

مذکورہ بالا قوانین سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آزادی تقریر ایک بنیادی حق تو ہے مگر یہ ایک مطلق حق نہیں۔ ماضی میں سینکڑوں کی تعداد میں ایسی کتابیں اور اخباری مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں اسلام کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کے بنیادی عقائد کی تضحیک کی کوشش کی گئی ہے مگر مسلمانانِ عالم نے کبھی اس عالمانہ بحث مباحثے پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ یہ بات بخوبی ان کے

علم میں ہے کہ یہ اسلام پر جاری بحث مباحثے کا حصہ ہے اور یہ آزادی اظہار کے ضابطوں کے زمرے میں آتا ہے۔ لاتعداد اخباری مقالوں اور مضامین میں اسلام کو بالکل غلط رنگ میں پیش کیا جاتا ہے یہاں تک کہ صریحاً جھوٹ اور مبالغہ آمیز کہانیوں پر مبنی مواد اسلام کے حوالے سے پریس میں چھاپا جاتا ہے لیکن مسلمانوں نے کبھی تحمل اور برداشت کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اسلام کے علماء اور محققین نے ہمیشہ ایسے اعتراضات کا علمی اور تحقیقی جواب دینے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ وہ یہ بات بخوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے معاشروں میں رہ رہے ہیں جو آزاد اور حریت پسند جمہوریتوں کا حصہ ہونے کے داعی ہیں۔ تاہم جب کبھی آزادی ظہار کے حق کا غلط اور بیجا استعمال کیا جاتا ہے اور اسلام کی مقدس ترین ہستیوں کی دیدہ دانستہ توہین کی جاتی ہے تو پھر اس معاملہ پر بے چینی، اضطراب اور غم وغصے کا پیدا ہونا ایک فطری اور قابل فہم امر ہے۔ پیغمبر اسلام نبی اکرم ﷺ کو چاقو لہراتے ہوئے دکھانا اور دستار میں بم چھپائے ہوئے ظاہر کرنا ایک بیّن گستاخی اور توہین آمیز اقدام ہے اور اس تنازعہ کو غلط رخ دے کر اس تاثر کو ہوا دینا ہے کہ وہ اور ان کے پیروکار (معاذ اللہ) پُرتشدد، دہشت گرد اور امن عالم کے دشمن ہیں۔ یہ عمل عدل وانصاف کے تمام مسلمہ ضابطوں کی دھجیاں بکھیرنے کے مترادف ہے۔ ایک دوسرے خاکے میں یوں عکاسی کی گئی ہے کہ وہ مردانہ خودکش بمباروں کی حمایت میں یہ کہہ رہے ہیں ''ٹھہریئے ٹھہریئے ہمارے پاس حوریں کم پڑ گئی ہیں''۔ ایسے خاکوں کی تشہیر کو کیسے اور کیونکر آزادی صحافت اور آزادی تقریر کی آڑ میں جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟ مزید برآں ان خاکوں کی اشاعت رواروی میں نہیں ہوئی بلکہ وہ مسلمانوں کے خلاف تعصب اور جانبداری کے خاص ماحول میں شائع کئے گئے ہیں اور نہ صرف ڈنمارک میں پائی جانے والی فضا بلکہ یورپ بھر کی آبادیوں میں مسلمانوں کے خلاف تناؤ اور مخاصمت پورے عروج پر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کا مقصد مسلمانوں کی دل آزاری، ان کے جذبات کو مجروح کرنا اور ان کے مذہب اور ثقافت کو تضحیک کا نشانہ بنانا ہے۔(۷۸)

محترم ارشاد احمد حقانی اپنے کالم ''اشتعال انگیز کارٹون - اسلام سے عیسائی مغرب کا بغض'' میں لکھتے ہیں:

''ڈنمارک کا اخبار "Jyllands Postan" میں گزشتہ ستمبر کو نبی ﷺ کے جو ۱۲ بے ہودہ، اشتعال انگیز اور احمقانہ کارٹون شائع ہوئے تھے ان کے خلاف عالم اسلام میں جو احتجاج جاری ہے اس کی شدت اور وسعت نے بعض مغربی مبصرین کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ ان

کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کا ردعمل دنیا کے تمام کونوں میں اس قدر شدید کیوں ہے لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنے پیغمبر ﷺ کی محض شبیہ شائع کرنے کے بھی مخالف ہیں چہ جائیکہ کوئی اخبار ان کے بارہ میں ایسے کارٹون شائع کردے جو کارٹون سے زیادہ Caricatures ہیں اور جن میں نعوذ باللہ آپ ﷺ کو ایک دہشت گرد کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان خاکوں کی اشاعت کا اس سے زیادہ کمزور دفاع اور نہیں ہوسکتا کہ یہ آزادی اظہار کا ایک مظہر ہیں اور مغربی حکومتیں اپنے اپنے قوانین کے تحت پریس کی آزادی پر کوئی قدغن عائد نہیں کرسکتیں۔ مغربی مبصرین اس حقیقت پر چاہے جس قدر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کارٹونوں کی اشاعت اور پورے یورپ کے متعدد اخبارات میں ان کی دوبارہ اشاعت اس کینے اور نفرت کی آئینہ دار ہے جو عیسائی یورپ مسلمانوں، اسلام، عالم اسلام اور ہادی برحق ﷺ کے بارے میں رکھتا ہے۔ ڈنمارک کے مذکورہ اخبار نے اگر ایک حماقت کر ہی دی تھی تو متعدد یورپی اخبارات کو ان کارٹونوں کی دوبارہ اشاعت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس عمل کی کوئی توجیہہ اس کے علاوہ ممکن نہیں کہ عیسائی مغرب کے نام نہاد علمی اور سیاسی حلقوں میں اسلام کے خلاف جو نفرت پائی جاتی ہے وہ اس قدر شدید ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی اہانت کرنے والے خاکوں کو بڑے شوق سے شائع کیا اور دلیل یہ دی کہ وہ آزادی صحافت کے اصول کی حمایت کررہے ہیں اور مذکورہ اخبار سے اپنی یکجہتی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

بعض امریکی اور برطانوی مبصرین نے ڈنمارک کے اخبار میں شائع ہونے والے خاکوں کی مذمت بھی کی ہے لیکن صدر بش اور وزیراعظم ٹونی بلیئر نے ڈنمارک کے وزیراعظم کے ساتھ اظہار یکجہتی کرکے اپنے خبث باطن کا ثبوت دے دیا ہے۔(۷۹)

محترم جناب جمیل الدین عالی اپنے کالم ''آزادئ اظہار کا غلط استعمال'' میں لکھتے ہیں:

''جو ناقابل معافی گستاخی ڈنمارک میں ہوئی ہے تو یقیناً اس قابل ہے کہ صرف عالم اسلام ہی نہیں پوری پڑھی لکھی دنیا اور تمام دنیا کی حکومتیں اس کی سخت مذمت کریں کیونکہ یہ صرف آزادی اظہار کا معاملہ نہیں ہے یہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد (تقریباً ایک ارب

نفوس) کی شدید ترین دل آزاری کا معاملہ ہے جو انسانی حقوق کے ذیل میں آتا ہے اور مغرب میں قائم انسانی حقوق کا بڑا ادارہ اور پورے مغرب میں اس مقصد بلکہ اسی نام سے بہت سے چھوٹے بڑے بے شمار ادارے کچھ نہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ ان سب کا فرض تھا اور ہے کہ ڈنمارک کے متعلقہ اخبار خصوصاً اس کے ایڈیٹر اور پورے یورپ میں جہاں جہاں یہ قابل مذمت خاکے چھپے ہیں ان کے مدیروں اور حکومتوں سے کھلی معافی کا مطالبہ کریں اور جب تک مقصد پورا نہ ہو، کیے جائیں۔(۸۰)

محترم جناب حامد میر اپنے کالم ''مغربی انتہا پسندوں سے نمٹنے کا طریقہ'' میں لکھتے ہیں:

پیغمبر اسلامؐ سے محبت کے اظہار کے لیے حکومت کو بڑا اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایک دفعہ جب لاہور میں ایک نوجوان غازی علم دین نے گستاخ رسولؐ راجپال کو قتل کیا تو قائداعظم نے عدالتوں میں ان کا دفاع کیا تھا اور علامہ اقبال نے پھانسی کے بعد غازی علم دین کے جسد خاکی کو اپنے ہاتھ سے لحد میں اتارا۔ قائداعظم اور علامہ اقبال کی نام لیوا قوم کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کم از کم یہ ضرور کیا جائے کہ پاکستان کی طرف سے اسلامی ممالک کی تنظیم کا اجلاس بلا کر ایک قرارداد پیش کی جائے اور اس قرارداد کے ذریعہ او پیک اور عرب لیگ میں شامل ممالک سے کہا جائے کہ وہ ڈنمارک کے ساتھ نہ صرف تجارت بند کریں بلکہ ڈنمارک کو تیل کی فروخت بھی بند کر دیں۔ امریکہ اور اقوام متحدہ بھی انسداد انتہا پسندی کے نام پر یہ راستہ اختیار کرتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو مغربی انتہا پسندوں کے خلاف یہی راستہ اپنانا چاہیے۔(۸۱)

محترم جناب جاوید قریشی اپنے کالم ''تضحیکی خاکے'' میں لکھتے ہیں:

آزادی اظہار کی آڑ لے کر ڈنمارک کے ایک معمولی سے اخبار نے مسلمانوں کو اشتعال دلانے اور ان کے جذبات مجروح کرنے کی جو ناپاک کوشش کی اس سے دنیا بھر میں بسنے والے ڈیڑھ ارب مسلمان سخت رنجیدہ، آزردہ خاطر اور مشتعل ہیں۔ دنیا کو اچھی طرح علم ہے کہ مسلمان رسول اکرم ﷺ سے کس درجہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور ان کے ناموس کے تحفظ کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود وہ تضحیکی خاکے چھاپے گئے۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کو دیگر ممالک میں ان خاکوں کو بارے دگر

چھاپا گیا۔ جس پر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بھی کہنے پر مجبور ہوئے کہ یہ حرکت ناقابل فہم، تکلیف دہ اور جذبات کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ ڈنمارک کے اس اخبار کی حرکت پر ہی دنیا بھر کے مسلمان سراپا احتجاج بن چکے تھے۔ چہ جائیکہ اس تضحیکی حرکت کو دہرا کر یورپی ممالک نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اسے اظہار آزادی کا نام دے کر اپنے اقدام کے دفاع میں صف آراء ہو گئے۔ تعجب ہے کہ وہ خود تو اظہار کا لامحدود اختیار رکھیں، دوسروں کو حقائق بیان کر دینے کی آزادی بھی میسر نہ ہو۔ اس سے زیادہ تضاد قول و فعل میں اور کیا ہوگا؟(۸۲)

محترم جناب جاوید چودھری اپنے کالم ''عشق کا امتحان'' میں لکھتے ہیں:

یورپی اخبارات اور حکومتوں کا ردعمل بہت دلچسپ ہے، ان کا کہنا ہے یہ محض آزادی رائے یا آزادی صحافت کا مسئلہ ہے اور ان کے اخبارات میں ہر قسم کا مواد شائع ہوتا رہتا ہے۔ یہ موقف مکمل طور پر غلط اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ ڈنمارک کے اسی اخبار یولاند پوسٹن نے ایک کارٹونسٹ کرسٹوفر زیلر نے اپریل ۲۰۰۳ء میں (نعوذ باللہ) حضرت عیسیٰ کے بارے میں چند خاکے بنائے تھے۔ جب اس نے یہ خاکے اخبار کو بھجوائے تھے تو سنڈے میگزین کے ایڈیٹر نے یہ خاکے شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا، ایڈیٹر کا کہنا تھا ''ان خاکوں سے قارئین کے ایک حلقے کی دل آزاری ہوگی، وہ اس پر مشتعل بھی ہو سکتے ہیں''۔ یہ انکار اور یہ جواب ثابت کرتا ہے کہ یولاند پوسٹن کی انتظامیہ اتنی سادہ اور بے وقوف نہیں۔ وہ عوامی ردعمل سے اچھی طرح واقف ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی آزادی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پہنچ کر اس کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ محض آزادی صحافت کا مسئلہ ہوتا تو یولاند پوسٹن حضرت عیسیٰ کے خاکے بھی شائع کر دیتا۔ دوسرا اگر یورپ کے اخبارات اتنے ہی آزاد ہیں تو انہوں نے آج تک یہودیوں کے خلاف کوئی خبر، کوئی مضمون اور کوئی خاکہ کیوں شائع نہیں کیا، یورپ کے اخبارات یہودیوں سے اتنے ڈرتے ہیں کہ وہاں جب بھی کسی داڑھی والے کا کارٹون یا خاکہ بنایا جاتا ہے تو اس پر مسلم لکھ دیا جاتا ہے تاکہ کوئی قاری اسے غلطی سے یہودی نہ سمجھ بیٹھے۔ پچھلے پچاس برسوں سے یورپ کے کسی اخبار میں یہودیوں کے قتل عام کے خلاف ایک سطر شائع نہیں ہوئی۔ لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں پر پہنچ کر یورپ کی آزادئ صحافت دم کیوں توڑ دیتی ہے۔ آج تک کسی نے ان

سے یہ نہیں پوچھا اور نہ ہی ان لوگوں نے آج تک اس سوال کا کوئی جواب دیا۔ میرا خیال ہے یورپ کی آزادی صحافت مسلمانوں سے شروع ہوتی ہے اور مسلمانوں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ (۸۳)

محترم جناب اوریا مقبول جان اپنے کالم ''آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است'' میں لکھتے ہیں:

ہولوکاسٹ کے مرنے والے یہودیوں کو اس قدر مقدس درجہ حاصل ہو گیا ہے کہ ان کے خلاف بات کرنے والا، ان کی چالاکیوں، نمک حرامیوں اور اپنے ہی ملک سے غداری کے بارے میں گفتگو کرنے والے کو نفرت پھیلانے والا قرار دے کر قابل تعزیر بنا دیا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں ان یہودیوں کی عیاری کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی، ان کا جو حشر ہو وہ ایک لمبی داستان ہے۔ میں یہاں صرف ان لوگوں میں سے چند ایک کا ذکر کروں گا جنہوں نے صرف اتنا زبان سے یا قلم سے نکالا کہ یہودیوں نے جو ساٹھ لاکھ تعداد بتائی ہے وہ غلط ہے بلکہ مرنے والوں کی تعداد تو چند لاکھ سے بھی زیادہ نہیں ہے۔ بعض نے تو صرف اس طرف اشارہ ہی کیا تھا، ان سب کو نفرت پھیلانے کے جرم میں سزائیں بھگتنا پڑیں۔

کینیڈا میں میلکم روس، ڈوگ کولینز، ارنسٹ زنڈل کو پریس میں سب سے پہلے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور پھر ان کو عدالتوں میں گھسیٹا گیا۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور انہیں معاشرے میں نفرت پھیلانے کے جرم میں در بدر ہونا پڑا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے سوال اٹھایا تھا کہ ثابت کیا جائے کہاں کہاں ساٹھ لاکھ یہودی مرے تھے۔

ان میں سے دو ارنسٹ زینڈل اور گریمر روڈلف امریکہ چلے گئے لیکن کچھ عرصے بعد ان دونوں کو امریکہ نے اپنے ملک سے نکال کر جرمنی کے حوالے کر دیا جہاں وہ آج کل نفرت پھیلانے کے جرم میں مقدمے کا سامنا کر رہے ہیں۔ آسٹریا وہ ملک ہے جہاں اسی ہولوکاسٹ کے خلاف بات کرنا جرم ہے وہاں ان کے ایک مشہور صحافی ڈیوڈ ارونگ کو گزشتہ دنوں گرفتار کر لیا گیا کیونکہ وہ اپنی تحریر سے یہودیوں کے اس پراپیگنڈے کو غلط ثابت کر رہا تھا۔ بلجیم کا ایک اور لکھنے والا سیک فرائڈر بیک ایسی ہی تحریریں لکھتا تھا کہ اسے ہالینڈ کی حکومت نے گرفتار کیا اور آج کل وہ جرمن کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے ہالینڈ بدری کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ جرمن شہری بھی نہیں لیکن اس کے عالمی وارنٹ جرمن عدالت نے

جاری کیے ہیں۔ صرف قانونی کارروائی کی بات نہیں ۱۹ ستمبر ۲۰۰۵ء کو بلجیم کے ایسے ہی ایک لکھنے والے ڈیسنٹ ریورنارڈ کے گھر پر پولیس گھس گئی۔ پورے گھر کو توڑ پھوڑ دیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور کہا گیا کہ اسے تب رہا کیا جائے گا کہ اگر وہ پاگلوں کے ڈاکٹر سے معائنہ کروائے اور یہودیوں کے ہولوکاسٹ کے خلاف لکھنا اور بولنا بند کر دے۔

یہ سب تو ان ممالک میں ہوا جو آج کل سرورِ عالم ﷺ کے توہین آمیز کارٹون چھاپنے پر پریس کی آزادی کا بہانہ بناتے ہوئے کارروائی سے انکار کر رہے ہیں۔ لیکن اس دنیا کے چہرے پر ایک اور طمانچے کا ذکر کروں گا ۱۹ جون ۲۰۰۴ء کو اسرائیل کی کیبنٹ یعنی پارلیمنٹ نے حکومت کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی کسی جگہ بھی کوئی شخص اگر ساٹھ لاکھ کی تعداد کو کم بتانے کی کوشش کرے تو اس پر مقدمہ چلا سکتی ہے اور اس ملک سے اسے نفرت کے جرم (Hate Criminal) کے طور پر مانگ سکتی ہے۔ گرفتار کر سکتی ہے، سزا دے سکتی ہے؛ یعنی اس وقت جو لکھنے والے جرمنی اور آسٹریا کی عدالتوں میں مقدموں کا سامنا کر رہے ہیں وہ کل اسرائیل کی درخواست پر اس کی جیل میں ہوں گے۔ نفرت پھیلانے والے سزا صرف ان لکھنے والوں کو دی جاتی ہے جو یہودیوں کے خلاف لکھتے ہیں۔

یہ تفصیل اس قدر طویل اور کئی سالوں پر پھیلی ہوئی ہے لیکن صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ صرف جنگ میں اپنے ہی ملک سے غداری کے جرم میں اور اپنی عیاریوں کی وجہ سے سزا پانے والے یہودی اتنے مقدس ہیں کہ ان کی تعداد کم کرنے پر نفرت پھیلتی ہے تو وہ قوم جس کے لوگوں کی زندگیوں کا سرمایہ عشق رسول ﷺ ہے جو اپنی جان، مال، عزت، آبرو، اولاد اور ماں باپ سے زیادہ ان سے محبت کرتی ہے اس کی توہین نفرت پھیلانے کے جرم میں نہیں آتی۔ کاش کوئی حکمران، کوئی لیڈر، کوئی صاحب اقتدار دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے بتائے کہ جس نے کارٹون چھاپے اسے اسی قانون کے تحت سزا دو ورنہ تم ہم سے اجنبی، بیگانے کاش کوئی پارلیمنٹ سڑک پر نکلنے سے پہلے اسرائیل کی طرح یہ بل منظور کرے کہ توہین رسالت کا مجرم خود امریکہ میں ہو یا ڈنمارک میں اسے ہمارے حوالے کر دو۔ اس بل کو پاس کرنے کے لیے صرف ایک ووٹ چاہیے لیکن اس ووٹ کو ڈالنے کے لیے غیرت، ہمت، جرأت ہی نہیں عشق رسول ﷺ کی دولت بھی ضروری ہے اور اسی میں ہماری آبرو کا راز پوشیدہ ہے۔ (۸۴)

محترم جناب پروفیسر خورشید صاحب کا ''شیطانی کارٹون۔ تہذیبی کروسیڈ کا زہریلا ہتھیار'' کے عنوان سے

ماہنامہ ترجمان القرآن، مارچ میں ایک فکر انگیز مضمون شائع ہوا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

یہ ۱۲ شیطانی کارٹون اتفاقی طور پر شائع نہیں ہو گئے۔ ان کا خاص پس منظر ہے۔ یولانو پوسٹن کے ثقافتی امور کے ایڈیٹر فلیمنگ روز (Flemming Rose) نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اس فکری اور تہذیبی جنگ کا آغاز کیا۔ اس اقدام سے ایک سال پہلے وہ امریکا گیا اور وہاں اسلام دشمنی کی مہم چلانے والوں کے سرخیل ڈینیل پائپس سے خصوصی صلاح و مشورہ ہوا۔ ڈینیل پائپس پچھلے ۴۰ سال سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قلمی جنگ کر رہا ہے۔ دسیوں کتابوں اور سیکڑوں مضامین کا مصنف ہے۔ صہیونی تحریک میں اونچا مقام رکھتا ہے اور فلسطینیوں کے بارے میں کھلے عام کہتا ہے کہ ان کو فوجی قوت سے نیست و نابود کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ صدر بش نے اسے ایک ایسے تھنک ٹینک کا مشیر بنایا تھا جس کے مصارف سرکاری خزانے سے برداشت کیے جاتے ہیں۔ اس مشاورت کے نتیجے میں فلیمنگ روز نے کارٹون بنانے والے ۴۰ افراد کو دعوت دی اور کہا کہ تم سب موضوعات پر کارٹون بناتے ہو اور شخصیات کا تمسخر بھی اُڑاتے ہو لیکن اسلام کو تم نے کبھی تختۂ مشق نہیں بنایا۔ تو اب اسلام کا چہرہ دکھانے کے لیے اپنے برش حرکت میں لاؤ۔ ان ۴۰ میں سے ۱۲ افراد کے کارٹون ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں The Painting of a Portrait of Islam's Prophet (پیغمبر اسلام کی تصویر کا خاکہ) کے عنوان سے شائع کیے گئے اور اس دعوے سے کیے گئے کہ اس طرح مسلمانوں کی 'تنگ نظری' کا علاج ہو سکے گا۔ ان کارٹونوں کو ہر کسی نے ناخوش گوار' اشتعال انگیز اور توہین آمیز قرار دیا۔ واشنگٹن پوسٹ نے انھیں a calculated insult (ایک نپی تلی توہین) قرار دیا مگر عالمِ اسلام کے تمام احتجاج کے باوجود ایڈیٹر' کارٹونسٹ' مغربی میڈیا کی اکثریت اور وہاں کی سیاسی قیادت نے آزادیِ صحافت' آزادیِ اظہار رائے اور سیکولر جمہوریت کا سہارا لے کر ان کا دفاع کیا اور اب تک ان کی اشاعت کو غلطی تسلیم کر کے معذرت کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ مصلحت کے تحت جو بات کہی جا رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے تو جو کیا' وہ درست کیا تھا۔ افسوس صرف اس پر ہے کہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصد ہی اسلام' اسلام کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو دہشت گرد دکھانا اور انھیں بے ہودہ جنسی مذاق کا نشانہ بنانا تھا۔ اب تک فلیمنگ روز کا دعویٰ ہے کہ I do not regret having commissioned these

cartoons. (مجھے یہ کارٹون بنوانے پر کوئی افسوس نہیں ہے)۔

اسی طرح اصل کارٹونسٹ کرٹ ویسٹرگارڈ (Kurt Westergaard) کا بیان لندن کے اخبارات میں ۱۸ فروری کو شائع ہوا ہے۔ ہیرالڈ نامی رسالے کے استفسار پر اس نے صاف کہا کہ کارٹونوں کا اصل محرک یہ دکھانا ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام [صلی اللہ علیہ وسلم] نعوذ باللہ دہشت گردی کی علامت ہیں۔

جب پوچھا گیا کہ کیا اسے ان کارٹونوں کی اشاعت پر افسوس ہے؟ اس نے صاف جواب دیا: نہیں۔ اس نے کہا کہ ان خاکوں کے پیچھے ایک جذبہ کارفرما تھا: دہشت گردی جسے اسلام سے روحانی اسلحہ فراہم ہوتا ہے۔ (اے ایف پی رپورٹ' ڈان، ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء)

ڈنمارک کے وزیراعظم نے پہلے ۱۱ مسلمان سفراء سے ملنے سے انکار کیا۔ جب ۲۷ مسلمان تنظیموں کے نمائندے ۱۷ ہزار مسلمانوں کے دستخطوں سے ان کے خلاف احتجاج اس کو دینے گئے تو لینے سے انکار کر دیا گیا اور اب سارے عالمی احتجاج کے باوجود ان کا موقف یہ ہے کہ یہ سب ایک جمہوری ملک میں آزادیِ اظہار کا مسئلہ ہے اور اصرار کے باوجود انھوں نے کھلے طور اسے غلطی ماننے اور صاف الفاظ میں مسلمانوں سے معافی مانگنے سے احتراز کیا ہے۔ الاہرام کے ایڈیٹر نے طرح طرح سے سوالات کیے مگر ڈنمارک کے وزیراعظم ٹس سے مس نہ ہوئے اور یہی کہتے رہے کہ: جو کچھ بھی شائع ہوا ہے' اس کے لیے ڈنمارک کے عوام اور حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ (ہفت روزہ الاہرام، ۱۲ فروری ۲۰۰۶ء)

نہ صرف ڈنمارک کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ کا رویہ تکبر اور تعصب سے بھرا ہوا ہے بلکہ مسلمانوں کو طیش دلانے اور ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے ناروے' جرمنی' فرانس' اٹلی' اسپین اور خود امریکا کے چند اخبارات نے ان کارٹونوں کو شائع کیا۔ یورپین یونین کے صدر نے مسلمانوں سے ہمدردی کے اظہار کے ساتھ آزادیِ صحافت کے نام پر ان شیطانی کارٹونوں کی اشاعت کی مذمت سے انکار کیا بلکہ خود صدر بش اور ٹونی بلیر نے اپنے خبث باطن کے اظہار کے لیے ڈنمارک کے وزیراعظم کو ٹیلی فون کر کے اپنے تعاون کا یقین دلایا جس نے ڈنمارک کے وزیراعظم کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ Islamic World must realise we are not isolated (اسلامی دنیا کو محسوس کرنا چاہیے کہ ہم تنہا نہیں ہیں۔ انٹرویو' ڈیلی ٹائمز' ۱۴ فروری ۲۰۰۶ء)۔

سارے حالات اور حقائق سے ظاہر ہے کہ یہ محض ڈنمارک کے ایک اخبار کی شرارت نہیں بلکہ ایک عالمی مہم ہے جس میں ڈنمارک کو ذریعہ بنایا گیا ہے اور سب کا ہدف اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنانا اور اسلام کی سب سے مقدس شخصیت اور اللہ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور ان کو نعوذ باللہ دہشت گرد کے روپ میں دکھا کر مسلمانوں کو دہشت گردی کا منبع قرار دینا ہے۔ اسی طرح جہاد کو' جو انصاف کے قیام کی ضمانت' آزادی کا محافظ اور ظلم اور بیرونی قبضے کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ ہے' دہشت گردی کا نام دے کر مسلمانوں کو تہذیبی ہی نہیں سیاسی اور معاشی غلامی کے جال میں پھنسانا ہے۔ الحمدللہ! مسلمان اس شیطانی کھیل کو سمجھتے ہیں اور مسلمان حکمران خواہ کتنے بھی غافل ہوں بلکہ ان میں سے کچھ سامراجی قوتوں کے آلہ کار ہی کیوں نہ ہوں' لیکن مسلمان عوام اپنے دین' اپنے ایمان' اپنے نبیؐ کی عصمت اور عزت اور اپنے نظریۂ حیات کی بنیادی اقدار کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار ہیں اور کوئی رکاوٹ اس جہاد میں ان کا راستہ نہیں روک سکتی۔ دنیا کے ہر خطے سے احتجاج اُمت مسلمہ کی زندگی کی علامت ہے اور باطل کی قوتوں کے لیے اس میں واضح پیغام ہے کہ مسلمانوں کو نرم نوالا نہ سمجھا جائے۔

آگے چل کر اس صورت حال پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

خود ڈنمارک کا قانون اس باب میں خاموش نہیں ہے۔ اس ملک میں مذہبی عقائد' شعائر اور شخصیات کی عزت کے تحفظ کے لیے ناموسِ مذہب کا قانون (Blasphemy law) صدیوں سے موجود ہے۔ اسی طرح ہر فرد کی عزت کے تحفظ کے لیے Law of Libel and Slander موجود ہے۔ پھر ملک کے قانون فوج داری میں صاف صاف ایسی تمام حرکتوں کو قابل دست اندازی جرم قرار دیا گیا ہے جو دوسرے کی تذلیل اور ان کے جذبات کو مجروح کرنے والے اور مختلف گروہوں اور برادریوں کے خلاف امتیازی سلوک کے مرتکب ہوں۔ ڈنمارک کے ضابطۂ فوج داری کی دفعہ ۱۴۰ اس طرح ہے:

جو لوگ کسی مذہبی برادری کی عبادات اور مسلّمہ عقائد کا کھلا مذاق اڑائیں یا ان کی توہین کریں' ان کو جرمانے یا چار ماہ کی قید کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح دفعہ بی ۲۶۶ میں مرقوم ہے کہ کوئی بھی فرد جو کھلے عام یا وسیع تر حلقے میں پھیلانے کی نیت سے کوئی بیان دے یا کوئی اور معلومات پہنچائے جس کے ذریعے وہ لوگوں کے کسی گروہ کو ان کی نسل' رنگ یا قومی

ونسلی عصبیت' عقیدے یا جنس کی بنیاد پر دھمکی دے' توہین کرے' یا تذلیل کرے وہ جرمانے' سادہ حراست یا دو سال سے کم قید کی سزا کا مستحق ہوگا۔

یہ خود اس ملک کا قانون ہے جس میں مسلمانوں کے ایمان کے ساتھ یہ گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور جس کا دفاع آزادیِ اظہار کے نام پر کرنے کی جرات مغربی اقوام کے دانش ور اور سیاسی قائد کر رہے ہیں۔

بات صرف قانون اور نظری حیثیت کی نہیں' اگر ان ممالک کے تعامل پر نگاہ ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ معاملہ مذہبی امتیاز (religious discrimination) کا ہے۔ اسی اخبار کے ایڈیٹر نے ۲۰۰۳ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہتک آمیز کارٹون چھاپنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ میں نہیں سمجھتا کہ قارئین ان خاکوں کو اچھا سمجھیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا خیال ہے کہ اس سے ہنگامہ برپا ہوجائے گا۔ اس لیے میں انھیں استعمال نہیں کروں گا۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہ شرمناک اور ہتک آمیز کارٹون شائع کرنے کے بعد جب احتجاج ہوا اور ایران نے جرمنی کے ہولوکاسٹ کے بارے میں کارٹون بنانے کی دعوت دی تو اس اخبار کے کلچرل ایڈیٹر فلیمنگ روز نے سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا عندیہ دیا کہ وہ ہولوکاسٹ پر بھی کارٹون شائع کرے گا۔ لیکن اس اعلان کے فوراً بعد اخبار کے ایڈیٹر نے اس کی تردید کی اور ساتھ ہی فلیمنگ روز کو طویل رخصت پر بھیج دیا۔ آج یورپ کے کم از کم سات ممالک میں قانونی طور پر ہولوکاسٹ کو چیلنج کرنا جرم ہے اور آسٹریا میں تاریخ کا ایک پروفیسر ڈیوڈ ارونگ (David Irving) جیل میں اس لیے بند رہا کہ اس نے سات سال پہلے ہولوکاسٹ کے بارے میں دیے جانے والے اعداد و شمار کو چیلنج کیا تھا اور اب اسے تین سال کی سزا ہوگئی ہے حالاں کہ اس نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی اور میں نے اپنے خیالات سے رجوع کرلیا ہے ـــــ وہ آسٹریا کا باشندہ بھی نہیں مگر اس کو آسٹریا میں سزا دی گئی ہے۔ اسرائیل میں باقاعدہ قانون ہے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی شخص ہولوکاسٹ کو چیلنج کرے تو اسرائیل کو حق ہے' اسے اغوا کر کے لے آئے اور اس کو سزا دے۔ انگلستان کے اخبار انڈی پنڈنٹ نے کسی نبی یا یہودی مذہبی لیڈر ایریل شیرون کے بارے میں ایک کارٹون شائع کیا تھا جس میں اسے فلسطینی بچوں کا خون چوستے دکھایا گیا تھا جس پر ساری دنیا میں ہنگامہ ہوگیا تھا۔ برطانوی یہودیوں نے

> آسمان سر پر اٹھالیا تھا اور جرمنی کے اخبار نے اس کارٹون کو چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ فرانس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایک فلم میں رکیک جنسی حوالوں کی وجہ سے ہنگامے ہوئے، ایک سینما کو آگ لگا دی گئی اور ایک شخص جل کر مر گیا۔ آج یورپی ممالک میں گھر میں بلند آواز سے میوزک سننا منع ہے کہ اس سے پڑوسیوں کی سمع خراشی ہوتی ہے۔ سڑک پر ہارن بجانا خلاف قانون ہے اور گاڑی میں زور سے گانا نہیں سنا جا سکتا مگر دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کے جذبات پر نشتر چلانے کی آزادی ہے اور اس کا دفاع بھی جمہوریت کے نام پر کیا جاتا ہے ـــــ کیا آزادی کے ایسے تباہ کن تصور کو جو دراصل فسطائیت کی ایک 'مہذب' (sophisticated) شکل ہے، ٹھنڈے پیٹوں قبول کیا جا سکتا ہے؟
>
> مسلمانوں کو تحمل اور برداشت کا درس دینے والوں کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ظلم کی سرپرستی اور ترویج کا اس سے بھی بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ ظلم کا استیصال تو اسے چیلنج کر کے اور مزاحمت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ (۸۵)

مسلمانوں کی سب سے قدیم ترین یونیورسٹی جامع الازہر کے مفتی اعظم امام محمد سید طنطاوی نے مصر میں لوتھرن چرچ ڈنمارک کے بشپ سے ملاقات کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈنمارک کے وزیر اعظم کو ان دل آزار کارٹونوں کی اشاعت پر معافی مانگنی چاہیے۔ انہوں نے دنیا کے تمام مذہبی راہنماؤں سے (بشمول پوپ بنی ڈکٹ) اپیل کی کہ سب مل جل کر بین الاقوامی سطح پر قانون سازی کریں تاکہ آئندہ اس طرح کی حرکات نہ ہوں۔ البتہ لوتھرن چرچ کے بشپ نے کہا کہ میں نے متعلقہ اخبار کا معافی نامہ مفتی اعظم کی خدمت میں پیش کیا ہے مگر ہمارے وزیر اعظم نے چونکہ یہ کارٹون نہیں بنائے لہٰذا وہ ہرگز ہرگز یہ معافی مانگنے کو تیار نہیں۔ وہ اس کام کے لیے معافی نہیں مانگیں گے جس میں وہ شریک نہیں۔

ڈنمارک کی حکومت اور ڈنمارک کی لوتھرن چرچ کے بشپ کی اس ٹیڑھی اور بدنیتی پر مبنی منطق کا صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے امریکی ٹی وی چینل (CBS) کو انٹرویو دیتے ہوئے بہت اچھا جواب دیا، کہ چلیے ہم مانتے ہیں کہ تھیوری کے مطابق تو ڈنمارک کے وزیر اعظم کا جواب درست ہے مگر امن عالم کے لیے معافی مانگ بھی لی جائے تو کیا حرج ہے۔ ڈنمارک کے فوجداری قانون میں اظہارِ آزادی کے نام پر نفرت پھیلانے اور توہین کے مرتکب کو سزا کا قانون موجود ہونے پر ڈنمارک کی حکومت کا متعلقہ اخبار کے خلاف کارروائی سے انکار کرنا، مسلمان ممالک کے سفیروں سے ملاقات کا انکار کرنا، ڈنمارک کے وزیر اعظم کے جاہل، متعصب اور اسلام دشمن ہونے پر واضح دلیل ہے، بالخصوص جب کچھ

عرصہ ہی قبل ڈنمارک کی ملکہ کے یہ متنازعہ جملے اخبار میں چھپے ہوں ''ہمیں اسلام کی مخالفت کرتے ہوئے اس امر کی کوئی پرواہ نہیں، اگر ہمارے خلاف ناپسندیدہ لیبل بھی چسپاں کر دیے جائیں کیونکہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے لیے ہمیں تحمل اور برداشت سے کام نہیں لینا''۔ ان جملوں کی اشاعت اور ڈنمارک کے وزیر اعظم کا جاہلانہ تکبر اور تعصب اور متعلقہ اخبار کے خلاف کارروائی سے انکار کرنا ہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کا شدید ردعمل دیکھنے میں آیا۔

پوپ بنی ڈکٹ (Pope Benedict XVI) نے مراکش کے نئے سفیر سے ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء کو ویٹی کن میں ملاقات کے دوران دلآزار کارٹونوں کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں امن اور باہمی بھائی چارہ کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذہبی جذبات، عقائد اور مقدس ہستیوں کا احترام کرنا سیکھیں۔

ورلڈ کونسل آف چرچز کے برازیل میں ہونے والے نویں اجلاس کے موقع پر جنرل سیکرٹری ڈاکٹر سیموئیل کوبیا نے ۱۵ فروری کو ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کے جواب میں دلآزار کارٹونوں کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آزادیٔ اظہار کا مطلب دوسرے لوگوں کی اقدار اور عزت پر حملہ کرنا نہیں۔

کیتھولک کلیسیا کے آرچ بشپ لارنس سلڈانہ (چیئرمین) جناب پیٹر جیکب ایگزیکٹو سیکرٹری NCJP نے ایک مشترکہ اعلامیہ میں کہا ہے کہ ''دنیا بھر کے میڈیا کو تمام مذاہب کے بارے میں سنجیدہ رویہ اپنانے کی سخت ضرورت ہے اس کے علاوہ اقوام عالم کے انسانوں کا حق ہے کہ وہ تعصبات سے بالاتر ہو کر مکمل آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اس بات کا انحصار اظہار رائے کی آزادی پر ہے۔ اس لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام متعلقہ اخبارات، مسلم بھائیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنی اس گستاخانہ جسارت کے لیے معافی کا اعلان کریں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی سخت افسوس ہے کہ کچھ شرپسند عناصر نے احتجاج کی آڑ میں اپنے ہی ہم وطنوں کی جان و مال کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور قومی اثاثوں کو بھی تباہ و برباد کیا۔ ان عناصر نے لوگوں کے مذہبی جذبات سے کھیلتے ہوئے معاشرے میں عدم برداشت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔

چرچ آف پاکستان لاہور ڈایوسس کے بشپ ڈاکٹر الیگزینڈر جان ملک نے اپنے بیان میں کہا کہ پاکستان کے مسیحی شائع ہونے والے دلآزار خاکوں کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ اس طرح کے کاموں سے کسی کا دل دکھایا جائے۔ ان ممالک کو مسلم دنیا سے اس ناپسندیدہ فعل پر کھلے الفاظ سے معافی مانگنی چاہیے اور یہ وعدہ کرنا چاہیے کہ آئندہ اس قسم کے واقعات کا اعادہ نہیں

ہوگا۔(۸۶)

روزنامہ جنگ راولپنڈی کے تحت ۷ فروری کو ہونے والے فورم میں راولپنڈی اسلام آباد کے چرچ اور سماجی تنظیموں کے نمائندوں نے متفقہ طور پر یہ بیان جاری کیا کہ ایسی حرکت کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ ان میں پادری عمانویل لورین وکر کرائسٹ چرچ (چرچ آف پاکستان)، فادر جیکب ڈوگرا وکر جنرل کیتھولک چرچ اور چیئر مین متحدہ مسیحی فورم، پادری آئزک برٹ پال سینٹ اینڈریو چرچ (چرچ آف پاکستان)، پادری جارج وسیم ایف جی اے چرچ، پروفیسر اشک ناز آصف پرنسپل صار پت بائبل انسٹی ٹیوٹ، پاسٹر پرویز سہیل اور مسٹر پیٹرک پٹیر پرفضل کلیسا پاکستان مسٹر منیر گل پرنسپل سینٹ جانز ہائی سکول، پروفیسر بروس گل پرنسپل سینٹ پیٹرک ہائی سکول، مسٹر عمانویل شہزاد ڈسٹرکٹ کونسلر، مسٹر محبوب صدا ڈائریکٹر کرسچن سٹڈی سنٹر نے توہین آمیز خاکوں کی اشاعت کی پرزور مذمت کرتے ہوئے اظہار افسوس کیا۔ انہوں نے کہا کہ پائیدار امن صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب احترام مذہب اور احترام انسانیت کے اصولوں پر عمل پیرا ہوا جائے۔ عصری تقاضوں کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ سب مذاہب متحد ہوکر باہمی احترام کے ساتھ سب کے جذبات واحساسات کا احترام کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہم توہین آمیز خاکوں سے مسلمانوں کو پہنچنے والے صدمہ میں ان کے ساتھ شریک غم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چندعشروں سے لادینی قوتیں تصادم کو ہوا دینا چاہتی ہیں لیکن ہم پاکستان کو مزید مضبوط کرنا چاہتے ہیں کیونکہ پاکستان ہمارا ملک ہے، جس میں ہم نے آنکھ کھولی اور دفن ہورہے ہیں۔(۸۷)

برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''آزادی تقریر کا تو ہم سب احترام کرتے ہیں لیکن بے عزتی اور اشتعال انگیزی کی کوئی چھوٹ نہیں دی گئی۔ میرے خیال میں ان خاکوں کی بار دگر اشاعت زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ یہ سب کچھ بے حسی، عدم احترام اور غلطی پر مبنی تھا۔ ہر مذہب میں قابل حرمت چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ تحریر وتقریر کی آزادی کے نام پر عیسائی رسوم ورواج اور مذہبی عبادات سے تعرض کرنے کا موسم آگیا ہے نہ ہی یہ یہودی مذہب، ہندو مذہب یا سکھ مذہب کے حقوق اور رسوم سے چھیڑ چھاڑ کرنے کا موسم ہے۔ ایسا اسلامی مذہب سے بھی روا نہیں رکھا جانا چاہیے۔ ہمیں اس صورت حال میں احتیاط اور مناسب ادب واحترام کا مظاہرہ کرنا چاہیے''۔(بی بی سی نیوز اور ویب سائٹ)(۸۸)

امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے جاری بیان میں کہا گیا: ''یہ کارٹون واقعی توہین آمیز اور مسلمانوں کے جذبات کوٹھیس پہنچانے کا موجب ہیں۔ محکمے کے ترجمان کرٹس کوریر کا بیان ہے: ''ہم سب آزادی اظہار اور پریس کی آزادی کا مکمل احترام کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ پریس کو ذمہ داری کا

مظاہرہ بھی کرنا ہوگا۔ مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت کو اس طرح ہوا دینا قابل قبول نہیں''۔

اسی طرح دیگر مغربی ممالک کی مختلف سیاسی و مذہبی تنظیمات کے رہنما وقائدین نے مسلمانوں سے اظہار یکجہتی کرتے ہوئے ان کارٹونوں کی اشاعت کو غیر اخلاقی اور شرمناک فعل قرار دیا جس کی تفصیل متعلقہ ویب سائٹس پر دیکھی جاسکتی ہے۔

پوپ بینی ڈکٹ کا اسلام کے متعلق متنازعہ بیان

۳۰ ستمبر ۲۰۰۶ کو گستاخانہ کارٹون ڈنمارک کے اخباروں میں چھپے اور اس فتنہ کے تقریباً ایک سال بعد ۱۰ ستمبر ۲۰۰۶ کو پوپ بینی ڈکٹ نے جرمنی کی روزنبرگ یونیورسٹی میں ''ایمان اور عقل'' کے موضوع پر ایک لیکچر دیتے ہوئے بازنطینی بادشاہ مانوئیل دوئم (Manuel II Paleologus) کے اقتباسات کے حوالے دیے۔

مانوئیل دوئم ۱۳۹۱ء تا ۱۴۲۵ء تک قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے سلطان بایزید دوئم کے بازنطیوں سے ابتداء ہی سے معرکے جاری تھے۔ فتوحات اور جنگی مہارت کے لحاظ سے بایزید کا دور عثمانی خاندان کا اہم ترین دور تھا۔ انہوں نے اپنی بے نظیر شجاعت اور بہادری کے باعث یلدرم (صاعقہ) کا لقب حاصل کیا۔ مانوئیل دوئم کا والد سلطان بایزید کے دربار میں ملازم تھا۔ والد کی وفات کے بعد یہ بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور سلطان کے خلاف فوجی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ اسے اسلام سے شدید نفرت تھی۔ عالمِ مسیحیت میں اسے ایک مذہبی ہیرو کا درجہ حاصل ہے۔

سلطان بایزید اوّل نے ۱۳۹۴ء تا ۱۴۰۶ء تک قسطنطینہ کا محاصرہ کیے رکھا۔ اس دوران مانوئیل کا کسی گمنام ایرانی مسلمان عالم دین کے ساتھ مکالمہ ہوا۔ بعد ازاں اُس نے ''ایک ایرانی کے ساتھ چھبیس (۲۶) مکالمات'' کے نام سے کتاب لکھی جس میں مسیحی مذہب کو اسلام کے مقابلے میں حق اور برتر ثابت کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے ساتویں مکالمہ میں مانوئیل ایرانی مسلمان عالمِ دین کو مخاطب کرکے لکھتا ہے:

> مجھے دکھاؤ کہ محمد (ﷺ) کون سی نئی چیز لے کرآئے ہیں؟ اُن کے مذہب میں تمہیں صرف برائی اور غیر فطری چیزیں ہی ملیں گی، مثلاً اُن کا حکم دینا کہ تلوار کے زور پر اسلام کو پھیلاؤ۔

آگے چل کر عمانوئیل لکھتا ہے:

> خدا قتل وغارت سے خوش نہیں ہوتا۔ عقلی تقاضوں سے کام نہ لینا خدا کی فطرت کے

> خلاف ہے۔ ایمان کا تعلق روح سے ہوتا ہے جسم سے نہیں ۔ جو کوئی بھی کسی کو ایمان کی جانب راغب کرتا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ بغیر کسی دھمکی اور خون خرابے کے عمدہ اور عقلی دلائل کے ساتھ مخاطب ہو۔ ایک عقلمند روح کو متاثر کرنے کے لئے طاقتور بازو یا کسی بھی قسم کے ہتھیار یا ڈرانے دھمکانے کے ذریعہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔(۸۹)

یہ دونوں حوالے پوپ کی تقریر کے متن میں شامل ہیں۔ پوپ بنی ڈکٹ مانوئیل دوئم کے اقتباسات درج کر کے اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> بادشاہ (مانوئیل) نے قرآن مجید کی سورۃ بقرہ کی آیت ۲۵۶ ﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ ضرور پڑھی ہوگی۔ یہ ان سورتوں میں سے ہے جو ابتدائی عرصہ میں نازل ہوئیں۔ جب محمد (ﷺ) ابھی تک بے بس (Powerless) اور حالت خطرہ (Under Threat) میں تھے۔ مگر بادشاہ کو جہاد کے متعلق اُن احکامات کا بھی علم تھا جو بعد ازاں ڈویلپ ہوئے اور جن کو قرآن مجید میں بھی درج کیا گیا ہے۔(۹۰)

پوپ کے ان ریمارکس پر مزید گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کیتھولک کلیسیا میں پوپ کی خدمات و مقام کے حوالہ سے مختصر معلومات قاری کے لئے پیش کریں۔

کارڈینل جوزف رٹزنگر

کارڈینل جوزف جرمنی میں ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو سبّت (ہفتہ) کے دن میں پیدا ہوئے اور اُسی دن آپ کا بپتسمہ ہوا۔ آپ ایک روایتی کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محکمہ پولیس میں بطور پولیس مین ملازم تھے اور کسانوں کے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ کا تعلق آسٹریا سے تھا۔ شادی سے قبل وہ کئی ہوٹلوں میں بطور کک کام کرتی رہی ہیں۔

کارڈینل جوزف چودہ سال کی عمر میں ہٹلر کی تنظیم ''ہٹلر یوتھ'' میں بھرتی ہوئے جیسا کہ اس وقت جرمنی کے ہر نوجوان پر لازم تھا مگر آپ کے حامیوں کے بقول آپ کبھی بھی اس تنظیم کے سرگرم رُکن نہیں رہے۔

وہ جرمنی کے شہر ٹراسٹین کے ایک مذہبی سکول میں زیر تعلیم تھے جب دوسری جنگ عظیم سے قبل انہیں میونخ کے قریب ایک ''اینٹی ایئر کرافٹ'' یونٹ میں بھرتی کر لیا گیا۔ تاہم جنگ کے آخری دنوں میں انہوں نے جرمنی فوج کو چھوڑ دیا اور 1945 میں کچھ دنوں تک وہ اتحادی افواج کی قید میں رہے۔ ان

کے حامیوں اور مداحوں کا خیال ہے کہ جرمن فوج میں نوکری کے دوران وہ اس بات کے معترف ہو گئے کہ چرچ یا کلیسیا ہی کو مسیح اور آزادی کے لئے کھڑا ہونا پڑے گا۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک آپ نے جرمنی کی معروف میونخ یونیورسٹی میں مسیحی الٰہیات اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے اپنے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے مقالہ کا عنوان ''سینٹ آگسٹین کے اصولِ کلیساء میں عوام اور بیت اللہ کا تصور'' تھا۔ آپ بے شمار تصانیف کے مصنف ہیں۔ آپ کی تصانیف میں قابل ذکر کتاب ''تعارفِ مسیحیت'' ہے۔ یہ کتاب اُن لیکچرز پر مشتمل ہے جو آپ نے یونیورسٹی میں تدریس کی ملازمت کے دوران طلبہ کو دیے۔ آپ کے پاس جرمنی اور ویٹی کن سٹی دونوں کی شہریت ہے۔

آپ کی ابتدائی مہم ''لبریشن تھیولوجی'' کو لاطینی امریکہ میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس فلسفہ کے تحت کیتھولک کلیسیا کو سماجی مسائل اور انسانی حقوق کے امور میں ملوث ہونے کی آزادی دی گئی تھی۔

آپ آنجہانی پوپ جان پال دوئم کی وفات کے بعد ۱۹ اپریل ۲۰۰۵ کو روم میں نئے پوپ منتخب ہوئے۔ انہوں نے پوپ بننے کے بعد اپنا نام بنی ڈکٹ XVI منتخب کیا۔

آپ نے اپنے ذاتی انٹرویوز کے مجموعہ پر مشتمل کتاب ''زمین کا نمک'' ۱۹۹۶ میں چھاپی۔ اور بعد ازاں اپنی آپ بیتی ''سنگِ میل: یاداشتیں ۱۹۲۷-۱۹۷۷'' چھاپی۔ جو صاحب آپ کی کیتھولک کلیسیا میں حیات و خدمات سے آگاہی چاہیں وہ ان کتب کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ آپ کی زندگی پر مزید تفصیلات انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔

مسیحی مسلم مکالمہ میں ایک فیصلہ کن شخصیت

مرحوم پوپ جان پال دوئم اور پوپ بنی ڈکٹ کے اسلام کے متعلق خیالات میں فرق بیان کرتے ہوئے بی بی سی لکھتا ہے:

> جوزف رٹزنگر جب ۲۰۰۵ء میں جان پال دوم کی جگہ منتخب ہوئے تو تصور کیا جا رہا تھا کہ وہ اپنے پیش رو کی پالیسیوں کو ہی آگے بڑھائیں گے۔ چرچ کے بہت سارے معاملات پر دونوں میں مکمل ہم آہنگی تھی اسی لیے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پولش پوپ کی طرح پوپ بنی ڈکٹ XVI یا ششدہم چرچ کی روایتی تعلیمات ہی کی پاسداری کریں گے۔ لیکن جہاں تک اہم پالیسیوں کا تعلق ہے ویٹی کن پر قریبی نظر رکھنے والوں نے بنی ڈکٹ ششدہم اور ان کے پیش رو کے خیالات میں فرق محسوس کیا ہے جیسے کہ اسلام کے بارے میں۔(۹۱)

جان پال دوم نے ۲۰۰۱ء میں دوسرے مذاہب سے قریب ہونے کا سلسلہ شروع کیا اور اسی سال جب شام کے دورے کے دوران وہ ایک مسجد میں گئے تو وہ پہلے پوپ تھے جس نے کسی مسجد میں قدم رکھا تھا۔ ان کا یہ عمل دونوں مذاہب کے دوران صدیوں سے موجود کشمکش اور شکوک کو دور کرنے کی ایک کوشش تھا۔ اسی طرزِ عمل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بی بی سی پوپ بنی ڈکٹ کے حوالے سے لکھتا ہے:

> بلاشبہ بنی ڈکٹ ششدہم اسلام اور عیسائیت میں بہتر تعلقات کے خواہاں ہیں لیکن اس کی بھی ایک اہم غرض ہے۔ مختصراً اسے ''ایک دوطرفہ عمل' کہا جاسکتا ہے۔ یعنی اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ مغرب میں مذہبی آزادی سے لطف اندوز ہوسکیں تو مسیحیوں کو بھی اسلامی ممالک میں کسی خوف وخطرے کے بغیر مساوی حقوق حاصل ہونے چاہییں۔ (۹۲)

اسلام کے حوالے سے ویٹی کن کے رویے میں سختی کا پہلا اظہار اس اقدام سے ہوا کہ آرچ بشپ مائیکل فش جیرالڈ کو ان کے عہدے سے ہٹادیا گیا۔ برطانیہ میں پیدا ہونے والے فش جیرالڈ ویٹی کن میں شعبہ مکالمہ بین المذاہب کے نگران تھے۔ وہ نہ صرف عربوں کے معاملات کے ایک ممتاز مفکر ہیں بلکہ انہیں عالم اسلام کے امور کا بھی ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ راقم الحروف ان سے بلمشافہ ملاقات اور مسیحی مسلم مکالمہ پر تبادلہ خیال بھی کر چکا ہے۔ ان کی برطرفی پر بی بی سی اپنے تبصرہ میں لکھتا ہے:

> پوپ بنی ڈکٹ کی جانب سے انہیں (آرچ بشپ مائیکل فش جیرالڈ) ویٹی کن کے منصب سے ہٹانے اور مصر میں مستقل سفارتی مندوب مقرر کرنے کے فیصلے کو عام طور پر جیرالڈ کی تنزلی سے تعبیر کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے تو اس فیصلے میں مضمر دانش مندی پر حیرت کا اظہار کیا۔ ویٹی کن کے طریقہ کار پر حکم تصور کیے جانے والے اور سوسائٹی برائے عیسیٰ کے رکن فادر تھامس ریسی نے گزشتہ اپریل میں بی بی سی ویب سائٹ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا ''آرچ بشپ فش جیرالڈ کی جلاوطنی پوپ کا اب تک کا ایک بدترین فیصلہ ہے'۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اگر ویٹی کن مسلمانوں کے بارے میں کوئی احمقانہ بات کرے گا تو قطع نظر اس کے کہ مشرقِ وسطیٰ میں کیا ہوگا، افریقہ میں لوگ جان سے جائیں گے اور انڈونیشیا میں بھی چرچ جلائے جائیں گے''۔ فادر تھامس ریسی نے کہا کہ ''مناسب یہی ہے کہ پوپ فش جیرالڈ کو اپنے قریب رکھیں''۔ فادر تھامس ریسی کا انتباہ اب الہامی سا محسوس ہوتا ہے۔ (۹۳)

> پوپ بنی ڈکٹ نے مذہبی بنیادوں کے حوالے سے ترکی کو یورپی یونین میں شامل کرنے کی بھی مخالفت کی تھی۔ جرمنی میں مذہبی امور پر تبصرہ نگار ولف گینگ کو پرنے خبردار کیا تھا کہ کارڈینل پاپائیت کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن شخصیت ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے ان کے پوپ کے عہدے پر فائز کئے جانے سے قبل یہ کہا تھا کہ کارڈینل رٹزنگر کے پوپ بنائے جانے سے چرچ کی قیادت اور عقائد میں واضح خلیج حائل ہو جائے گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ کارڈینل ایک سائنسدان ہیں جو دانشورانہ بحث کو پسند کرتے ہیں جب کہ کیتھولک فرقے کے لوگوں کو ایسے پادری اور بشپ چاہییں جو ان کی روح اور ان کے دلوں کو چھوسکیں۔ (۹۴)

اسلام کے بارے میں پوپ کے الفاظ پر پیدا ہونے والی بے چینی اور احتجاج نے ویٹی کن کے اندر اور باہر سب کو حیران اور کیتھولک مسیحیوں کو ایک ناقابل صورت حال کے روبرو کر دیا ہے۔ پوپ کے معاون اس بات پر مایوس ہیں کہ ایک ایسا حوالہ جو فلسفیانہ دلیل کی توجیح کے لیے تھا مسلمانوں میں اس قدر ناراضی کو بھڑکا سکتا ہے۔

لیکن کچھ اوروں کی نظر میں اس معاملے سے وہ تشویش بھی اجاگر ہوتی ہے جو اسلامی دنیا اور چرچ کے درمیان تعلقات کے بارے میں پوپ کے رویے سے منعکس ہوئی ہے۔ اگرچہ ویٹی کن میں پوپ کا پہلا سال کسی تنازع کے بغیر گزرا ہے لیکن اس دوران وہ انتہائی خاموشی سے ویٹی کن کے انتظامی ڈھانچے میں اہم تبدیلیوں کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔

ویٹی کن کی طرف سے وضاحت

کارڈنل تارسیسو برٹون (سیکرٹری آف سٹیٹ روم کی جانب سے) ۱۶ ستمبر ۲۰۰۶ء کو مندرجہ ذیل وضاحتی اعلامیہ جاری کیا گیا۔ جسے اردو میں ترجمہ کر کے پاپائی سفارت خانہ اسلام آباد کی طرف سے جاری کیا گیا:

> پوپ بنی ڈکٹ سولہویں کے ریگنس برگ یونیورسٹی جرمنی میں کیے گئے خطاب کے بعض اقتباسات کا جو ردِعمل بنی ڈکٹ حلقوں میں ہوا ہے اس کے بارے میں ویٹی کن کی پریس آفس کے ڈائریکٹر نے پہلے ہی کچھ وضاحتیں پیش کی تھیں۔ میں ان وضاحتوں میں مندرجہ ذیل اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔
>
> پوپ بنی ڈکٹ سولہویں کا مؤقف صریحاً وہی ہے جس کا اظہار ویٹی کن مجلس دوم میں واضح ہے کہ ''کلیسیا اسلام کو عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں جو حی وقیوم، رحمان، قادرِ مطلق، خالقِ ارض وسما ہے اور انسانوں سے ہمکلام ہوا۔ مسلمان

دیانت داری کے ساتھ اس کے وہ احکام عمل میں لاتے ہیں جو بشری فہم وادراک سے ماوراء ہیں۔ اس بات میں یہ حضرت ابراہیم کی سی اطاعت پیش کرتے ہیں جس سے اہل اسلام اپنے ایمان کے مطابق تعلق رکھتے ہیں۔ اہل اسلام اگرچہ خداوند یسوع کی الوہیت سے منکر ہیں تاہم اسے نبی کا مرتبہ دیتے ہیں۔ وہ یسوع کی کنواری ماں مریم کا احترام بھی کرتے ہیں اور اکثر عقیدت مندانہ طور پر اسے یاد کرتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ یوم قضاء کے بھی منتظر ہیں، جب خدا تمام بنی نوع انسان کو مُردوں سے زندہ کرکے ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔ آخرکار یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ وہ اخلاقی زندگی کی قدر کرتے ہیں اور خصوصاً نماز، زکوٰۃ اور روزوں سے خدا کی پرستش کرتے ہیں'' (دوسرے مذاہب کے ساتھ تعلقات نمبر۳)

اسی طرح پوپ صاحب مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان مکالمے کی واضح طور پر حامی ہیں۔ ۲۰ اگست ۲۰۰۵ء کو کولون (جرمنی) میں مسلمان برادریوں کے نمائندوں کے ساتھ ملاقات میں انہوں نے فرمایا کہ مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایسے مکالموں کو کوئی فالتو یا اختیاری چیز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ماضی سے سیکھے ہوئے سبق ہمیں پہلے جیسی غلطیوں سے بچنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہمیں مصالحت کی راہیں تلاش کرنی چاہییں اور ایک دوسرے کے تشخص کا احترام سیکھنا چاہیے اور اس احترام کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہیے۔

پوپ صاحب نے اپنے مذکورہ خطاب میں بازنطینی شہنشاہ عمانوئیل دوم پیلیولوگس کی رائے کا حوالہ دیا تھا۔ تو ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بازنطینی بادشاہ کی رائے کسی طرح بھی ان کی اپنی رائے تھی۔ اس حوالے کا مقصد تو کتابی سیاق وسباق میں تھا اور مذہب اور تشدد کے باہمی رشتے کے حوالے سے بعض تاثرات تھے۔ یہ بات متن کا پوری طرح بغور مطالعہ کرنے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس حوالے کا مقصد مذہب کی بنیاد پر تشدد کو مکمل طور پر رد کرنا تھا خواہ تشدد کا ارتکاب کوئی بھی کرے۔ اس مقام پر یہ بات یاد دلانا ضروری ہے کہ پوپ بینی ڈکٹ سولہویں نے بین المذاہب دعائیہ اجلاس برائے امن کی بیسویں سالگرہ مناتے ہوئے اس بات کی توثیق کی تھی۔ اس دعائیہ اجلاس کا آغاز ان کے پیشرو پاپائے اعظم جان پال دوم نے اکتوبر ۱۹۸۶ء میں کیا۔ انہوں نے کہا ''تشدد کو مذہب سے منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جن کی وجہ سے وقت کے ساتھ ساتھ اس تشدد کا فروغ ہوتا ہے۔ درحقیقت خدا کے ساتھ رشتے اور محبت کی اخلاقیات کے مابین قریبی رشتے کی توثیق تمام مذہبی روایات

میں پائی جاتی ہے''۔

پوپ بینی ڈکٹ سولہویں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کی تقریر کے چند جملوں سے جن کا اصل متن کے بالکل برعکس مطلب پیش کیا گیا دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کی دل آزاری ہوئی۔ بے شک اسی پاپائے اعظم نے اسلامی رُوحانی جذبے کی روشنی میں مغرب کے سیکولر کلچر کو تنبیہہ کی کہ وہ خدا کے خلاف نفرت اور آزادی کی آڑ میں ''بھید اور قدوسیت'' کا مذاق نہ اڑائیں۔ پاپائے اعظم نے دین اسلام کے تمام ماننے والوں کی عزت واحترام کا اظہار کیا ہے۔ پاپائے اعظم پرامید ہیں کہ ان کے اسلام کے لیے پروقار جذبات جلد ہی بہتر سمجھ وتفہیم کی فضا پیدا کریں گے تاکہ موجودہ بے چینی کے ماحول پر قابو پایا جاسکے۔ نیز زمین وآسمان کا خالق ومالک جو انسانوں کے ساتھ ہمکلام ہوا اس کی گواہی دینے میں مدد ملے گی تاکہ باہمی خوشگوار تعلقات کو فروغ دیا جاسکے۔ ''کلیسیائی تعلیم یوں سکھاتی ہے کہ ماضی کو بھول کر مخلصانہ طور پر ایک دوسرے کی بات سمجھنے کی کوشش کریں گے اور کل نبی آدم کے فائدے کے لیے معاشرتی انصاف، اخلاقی بھلائی، سلامتی اور آزادی کو محفوظ رکھیں اور ترقی دیں گے اور اس جدوجہد میں تیزی پیدا کریں گے''۔ (دوسرے مذاہب کے ساتھ تعلقات نمبر۳)

اس علامیے کے دوسرے دن پوپ کی طرف سے ایک اور وضاحت پیش کی گئی:

پیارے بھائیو اور بہنو! حال ہی میں، میں نے بیویریا (جرمنی) کا پاسبانی دورہ کیا تھا یہ ایک گہرا روحانی تجربہ تھا اور اس کے دوران میری ذاتی یادیں بھی تازہ ہوئیں جن کا تعلق ان مقامات سے تھا اور پاسبانی سرگرمیوں سے بھی جو آج موثر انجیلیل بشارت کا ذریعہ بنی ہیں۔ میں اس باطنی مسرت پر خدا کا شکر بجالاتا ہوں جو اس نے مجھے عطا کی۔ میں ان تمام لوگوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اس پاسبانی دورے کی کامیابی کے لیے محنت کی۔ رسم کے مطابق میں اگلے بدھ کو مومنین سے اپنے خطابِ عام کے دوران اس موضوع پر مزید اظہارِ خیال کروں گا۔ اس موقع پر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ریگنس برگ یونیورسٹی جرمنی میں میرے خطاب کے بعض حصوں پر ف جو ردِعمل کچھ ممالک میں ہوا ہے اور جنہیں مسلمانوں کے جذبات کے منافی سمجھا گیا ہے میں ان پر گہرے افسوس کا اظہار کرتا ہوں اور انتہائی معذرت خواہ ہوں۔ درداصل یہ قرونِ وسطیٰ کے متن کا حوالہ تھا جو کسی بھی طرح میرے ذاتی خیالات کو ظاہر نہیں کرتا۔ گزشتہ روز کارڈینل سیکرٹری آف اسٹیٹ نے اس

سلسلے میں ایک بیان جاری کیا ہے جس میں انہوں نے میرے الفاظ کے سچے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس سے دلوں کو سکون ملے گا اور میرے خطاب کے حقیقی معنی واضح ہوں گے کیونکہ میرے خطاب کا مقصد مجموعی طور پر بے حد باہمی احترام، صاف گوئی اور خلوص کے ساتھ مکالمہ کرنے کی دعوت دینا ہے۔ (Castel Gandolfo, 17th September 2006)

چند انتہائی اہم سوالات

بی بی سی کی ویب سائٹس نے اس حوالے سے ایک نہایت اہم سوال اُٹھایا ہے کہ:

کیا ویٹی کن میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو یہ دیکھ سکتا کہ پوپ کے الفاظ یا حوالے کو سیاق وسباق سے الگ کر کے بھی دیکھا جاسکتا ہے اور اس کا کیا ردعمل ہوسکتا ہے؟ (۹۵)

دوسرا اہم سوال ترکی کے ایک وزیر نے اُٹھایا ہے کہ:

بظاہر پاپائے روم نے مسلمانوں کی ناراضگی پر معذرت کی لیکن اپنے بیان پر نہیں۔ انہیں یا تو صحیح طرح معافی مانگنی چاہیے یا پھر نہیں۔ پوپ اپنے بیان پر معذرت خواہ ہیں یا اس پر ردعمل کی وجہ سے؟ (۹۶)

تیسرا سوال پوچھنے کی ہم جسارت کریں گے۔ ہم نہایت ادب واحترام سے پوپ کے ذاتی مشیروں اور ویٹی کن کے احباب علم ودانش کی خدمت میں یہ گزارش کریں گے کہ اگر ''ایمان اور عقل'' کے موضع پر گفتگو کرتے ہوئے جبراً قبولِ مذہب کی بات کرنی ہی تھی تو ۱۴ چودھویں صدی عیسوی میں جا کر مثالیں تلاش کرنے کی بجائے موجودہ حالات وواقعات پر ہی نظر ڈالی لی جاتی۔ خود مسیحیت ہی میں مسلمانوں کو جبراً مسیحی بنانے کی ہزاروں مثالیں مل جاتیں۔

عراق میں مسلمانوں کو جبری مسیحی بنانے کی کوششیں

مثلاً مشہور ومعروف امریکی مسیحی مبلغ بلی گرام (Billy Graham) کا بیٹا فرینکلن گراہم (Franklin Graham) اپنی ذاتی قائم کردہ NGO کے پلیٹ فارم سے امریکی و برطانوی

فوجیوں کے زیر سایہ عراقی مسلمانوں میں مفت بائبل مقدس تقسیم کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہاں تک کہ وہ عراقی علاقے جہاں کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی میسر نہیں، فرینکلن گراہم صرف اس شرط پر بھوکے اور پیاسے عراقی مسلمانوں کو کھانا فراہم کرتا ہے کہ وہ اس کے بدلے بپتسمہ لے کر مسیحی مذہب کو اختیار کرلیں۔ یہ تمام خبریں مغربی اخباروں چھپ چکی ہیں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔

امریکی ٹی وی چینل CBS کی معروف صحافی باربراوکٹر (Barbara Victor) ۱۱ ستمبر کے بعد امریکہ کی مذہبی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

۱۱ ستمبر کے بعد پورے امریکہ کی Evengelical کلیسیائیں اور سیمینریاں نہ صرف اسلام کے خلاف لیکچرز دینے اور کتابیں لکھنے میں مصروف ہیں، بلکہ اُن ہتھکنڈوں کو بھی پرموٹ کر رہی ہیں کہ جس سے مسلمانوں کو مسیحی مذہب میں داخل کیا جاسکے۔ (۹۷)

اس ضمن میں وہ فرینکلن گراہم کی عراق میں تبلیغ مسیحیت کا ایک واقعہ نقل کرتی ہیں:

ایک امریکی سپاہی نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کی شرط پر جبراً قبولِ مسیحیت کی کہانیوں کی تصدیق کی۔ وہ بذات خود ایک چشم دید واقعہ کا گواہ رہ چکا ہے کہ گراہم نے کس طرح پیاسے عراقیوں کے ایک گروپ کو صرف اس شرط پر پانی دینے پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر مسیحی مذہب کو قبول کرلیں۔ (۹۸)

بلی گراہم اور اُس کا بیٹا فرینکلن گراہم اُن صہیونی مسیحیوں (Zionist Christians) میں سے ہیں جو اسرائیل کی ریاست کو ہر طرح سے سپورٹ کرتے ہیں۔ یہ جارج ڈبلیو بش کے روحانی پیشوا بھی ہیں۔ عراق میں امریکی کاروائیوں کے لئے ''خدا کی برکت'' انہیں بلی گراہم اور فرینکلن گراہم ہی کے وسیلے سے ملتی ہے۔

یہ فرینکلن گراہم ہی ہے جس نے اپنی کتاب ''The Name'' میں اسلام کو بدی کا مرکز ومحور قرار دیا۔ ان تمام حالات وواقعات کے پس منظر میں مسلمان پوپ کے ''علمی لیکچر'' اور اُس کے جوابی ردعمل پر پوپ کی وضاحت کو کیسے شک کی نگاہوں سے نہ دیکھیں؟

پاپائے روم کے متنازعہ بیان پر تنقید اور شدید ردِ عمل

ویٹی کن کے اس وضاحتی بیان کے باوجود کہ پوپ بینی ڈکٹ کے بیان کا مقصد مسلمانوں کی دل آزاری نہیں تھا، مسلمان ممالک میں پاپائے روم کے خلاف احتجاج کا سلسلہ جاری رہا۔ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی کے سربراہ شیخ محمد سید نے کا ہے کہ ''جہاد کے بارے میں پاپائے روم کا بیان اسلام کے بارے

میں لاعلمی پر مبنی ہے اور بیان میں اسلام کو ایسی چیزوں سے منسوب کیا گیا ہے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ انہوں نے کہا کہ پوپ کے بیان سے دنیا کے مذاہب اور ثقافتوں میں خلاء بڑھے گا۔

پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف اور مصر کے وزیر خارجہ احمد ابوالغیث نے کیوبا کے دارالحکومت ہوانا میں غیر جانبدار ممالک کی سربراہ کانفرنس میں پاپائے روم کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے کہا کہ دہشت گردی کو اسلام سے جوڑنے کے مکروہ ہتھکنڈوں کو متحدہ ہو کر ناکام بنانے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ دہشت گردی اور اسلام کو جوڑنے سے مسلمانوں اور مغرب میں تفریق بڑھے گی۔

مصر کے وزیر خارجہ ابوالغیث نے کہا کہ پوپ کو مذہب اور تشدد سے متعلق اپنے بیانات کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان کے بیانات کو اسلام پر نکتہ چینی تصور کیا جا رہا ہے۔

پاکستان، ایران، ترکی، فلسطین اور دوسرے کئی اسلامی ممالک میں پاپائے روم کے اس بیان کے بعد کہ مذہب اسلام کے پیغمبر تشدد کے سوا کچھ نہیں لائے، کڑی تنقید کی گئی۔

ایران کے عظیم رہنما آیت اللہ خامنہ ای نے کہا کہ پوپ کا اسلام کے بارے میں حالیہ بیان ان کی مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس تنازعہ کے پیچھے ان طاقتوں کی خواہش ہے جو صرف بحران پیدا کر کے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی دوسری کڑیوں میں پیغمبر اسلام کے خاکے بنا کر ان پر طنز کرنا اور امریکی اور برطانوی اخبارات میں اسلام کے بارے میں ہتک آمیز بیانات جاری کرنا ہے۔

ایران کے رہنما کا کہنا تھا کہ 'ہم امریکی صدر سے کوئی توقع نہیں رکھتے جیسا کہ ان کا کام صرف دنیا کی ایسی کمپنیوں اور طاقتوں کے لیے کام کرنا ہے جو کہ لوٹ مار کا کام کر رہی ہیں'۔ انہوں نے کہا کہ 'یہ الفاظ جو کہ ایک بڑے عہدے پر فائز عیسائی کے ہیں ہمارے لیے افسوس اور حیرانگی کا سبب ہیں۔

ملائیشیا کے وزیر خارجہ نے کہا کہ پاپائے روم کو اپنی تقریر واپس لینی چاہیے۔ وزیر خارجہ سید حامد البر نے کہا کہ پاپائے روم کا بیان کافی نہیں۔ بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں پاپائے روم کے بیان کے خلاف ہڑتال کا اعلان کیا گیا ہے۔

جرمنی کی مسلم کونسل نے اپنے ردعمل میں کہا کہ پاپائے روم نے حالیہ چند دنوں سے جاری کشیدگی کو کم کرنے کی طرف اہم قدم لیا ہے۔ برطانیہ کی مسلم کونسل نے بھی اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بہت سے مسلمان پاپائے روم سے اسی طرح کی یقین دہانی چاہ رہے تھے۔

مصر کی سیاسی تنظیم اخوان المسلمین نے بیان کا خیر مقدم کیا تھا لیکن بعد میں اس نے کہا کہ یہ باقاعدہ

معذرت کے برابر نہیں ہے اور مسلمان اس سے مطمئن نہیں ہوں گے۔

پوپ کے بیان پر پاکستانی صحافت کا ردِعمل

روزنامہ نوائے وقت اپنے اداریے بعنوان "کروسیڈی پوپ بنی ڈکٹ کی اشتعال انگیز ہرزہ سرائی" میں لکھتا ہے:

> پاپائے روم پوپ بنی ڈکٹ شانزدہم نے اپنے دورۂ جرمنی کے دوران شدت پسندی اور اسلام کے نظریۂ جہاد پر تنقید اور جناب رسالت مآب ﷺ کی شان میں بھی ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان وحشیانہ پن کے اندھیرے سے باہر نکلیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کا تصورِ جہاد خدا کے مقاصد کے برعکس ہے اور اسلام تلوار کی نوک کے ذریعہ پھیلایا گیا۔ انہوں نے یہ شرانگیز تقریر کرتے ہوئے تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان بات چیت اور مکالمہ کی ضرورت و اہمیت کا مشورہ بھی دیا ہے۔

نوائے وقت مزید لکھتا ہے:

> پوپ نے ایک منصوبہ بندی اور طے شدہ مہم کے مطابق ایسے وقت میں اسلام کے نظریۂ جہاد اور بانی اسلام کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جبکہ کروسیڈی رومن کیتھولک بش کا امریکہ مسلمان ممالک اور اسلام کے خلاف کروسیڈ کا اعلان کر چکا ہے۔ مسلمان ممالک پر حملہ کر کے عراق اور افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کو جاں بحق کر کے عراق کے معدنی وسائل پر قبضہ کر چکا ہے اور دیگر عرب ممالک کے وسائل پر دسترس حاصل کرنے کے بعد 'ایران، شام اور پاکستان کے لیے ایک خوفناک خطرہ بنا ہوا ہے مگر یورپی ممالک اس مرحلہ پر امریکہ کو مسلمانوں کے خلاف شروع کی گئی جنگ روکنے اور عراق سے فوجیں واپس بلانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ برطانیہ میں حکمران پارٹی کو عراق و افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر مجبور کیا جا رہا ہے اور ٹونی بلیئر کی حکومت خطرہ میں پڑ گئی ہے اور اس نے ایک سال کے اندر اندر استعفیٰ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ دوسری طرف لبنان پر اسرائیل نے جارحانہ حملہ کے بعد دنیا بھر میں امریکہ کی سرپرستی میں اسرائیل کی طرف سے ہونے والے اس خون ریز حملہ کی شدید مذمت کی جا رہی ہے اور دنیا کے امن و سلامتی کو تباہ و برباد کرنے کے لیے امریکی صدر بش کی امریکہ میں شدید مزاحمت ہو رہی ہے۔ امریکہ میں بش کی

مقبولیت کا گراف بری طرح گر رہا ہے اور نظریاتی طور پر دنیا بھر کے عیسائیوں میں دین اسلام سے رغبت بڑھ رہی ہے اور یورپ اور امریکہ میں پڑھے لکھے دانشور طبقہ میں قرآن مجید اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقانیت مقبول ہو رہی ہے۔ ان حالات میں پوپ بینی ڈکٹ نے انتہائی گھٹیا اور بازاری انداز میں اسلام اور بانیٔ اسلام ؐ کے خلاف ہرزہ سرائی کر کے دنیا میں غلط فہمیوں پر مبنی اپنے تاثر کو مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔

نوائے وقت آگے چل کر پھر لکھتا ہے:

> پوپ بینی ڈکٹ نے جہاد کے خلاف اپنے خبث باطن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا کہ دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے یہ ظلم کرنے والے کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ کشمیر میں بھارتی فوج کشمیری مسلمانوں کا جو قتل عام کر رہی ہے، فلسطین اور لبنان میں ہونے والے اسرائیلی مظالم و خون ریزی کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اس ظلم کا مقابلہ کرنا انتہائی پسندی ہے؟ کیا جنگ آزادی کو دہشت گردی کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ (۹۹)

روزنامہ جنگ اپنے اداریہ بعنوان ''پوپ کے بیان پر محض احتجاج ہی مسئلے کا حل نہیں'' میں لکھتا ہے:

> پوپ بینی ڈکٹ کی جانب سے جہاد اور شانِ رسالت ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف بیان اور الزام تراشی پر دوسرے مسلمانوں کی طرح پوری پاکستانی قوم سراپا احتجاج بنی ہوئی ہے۔ قومی اسمبلی اور سینیٹ نے پوپ کے بیان کی شدید مذمت کرتے ہوئے الگ الگ متفقہ قراردادوں میں بیان واپس لینے کا مطالبہ کیا اور اسے اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ وزیر اطلاعات محمد علی درانی نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ پوپ بینی ڈکٹ اسلام سے متعلق مخالفانہ بیان واپس لے۔ وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی نے اس بیان کو جہالت کا آئینہ دار قرار دیا اور پوپ سے مطالبہ کیا کہ وہ عالم اسلام سے معافی مانگیں۔ چوہدری شجاعت حسین کا کہنا تھا کہ بیان حقائق کے منافی ہے جبکہ امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد نے کہا کہ قتل و غارت کا بازار گرم کرنے والے امریکہ کو امن کا درس دیں۔ ادھر دفتر خارجہ میں ویٹی کن کے سفیر کو طلب کر کے انہیں مسلمانوں کے شدید ردعمل سے آگاہ کیا گیا۔ پوپ بینی ڈکٹ کی جہاد، شان رسالت ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی اور ا

> لزام تراشی دراصل ایک باقاعدہ سازش اور امت مسلمہ کے خلاف عصبیت کا حصہ اور مظاہرہ ہے۔ اس پر پاکستان اور دوسرے مسلمان ممالک کا ردعمل بجا اور درست لیکن اس مسئلے سے نمٹنے کا یہ کوئی موثر حل نہیں۔ اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے خلاف صلیبی قوتوں کی سازشوں کا ادراک کرتے ہوئے اپنی صفوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کرے۔ مسلمان ممالک اپنے مالیاتی وسائل کو یکجا کریں عالمی مالیاتی اداروں کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کی فکر کریں، اپنی دفاعی صلاحیتوں میں اضافہ کریں اور اسلامی تعلیمات کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ (۱۰۰)

تلاشِ امن

اگر ہم خلوص نیت اور اسلام اور مسیحیت کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں تو دُنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ سیرۃ النبی ﷺ اور سیرِ مسیح سے ہمیں وہ تمام راہنمائی حاصل ہو سکتی ہے جو امن کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ کیرن آرمسٹرانگ نے بڑی خوبصورتی سے دُنیا میں امن کے متلاشیوں کو صحیح راہ دکھلائی ہے۔ آپ فرماتی ہیں:

> آج جبکہ ہم گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد کی بدلی ہوئی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم ہتھیاروں اور سرد جنگ کے زمانے کے نظریات کے ساتھ موجودہ حالات میں کوئی امن پیدا نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس صورت حال کو سنوارنے کے لئے نئے حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں حضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ ہمارے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ کی پالیسیوں کے مطالعے سے ہم سیکھ سکتے ہیں کہ کیسے اس دنیا میں امن قائم کیا جائے؟۔ آپ کی حیات طیبہ کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمیں اپنے دلوں سے دوسرے انسانوں کے لئے موجود نفرت، لالچ اور غصے کو باہر نکال دینا چاہیے۔ نیک اور پاک دل کے ساتھ ہمیں معاشرے میں مثبت تبدیلی کے لئے کام کرنا چاہیے۔ یہ صرف تبھی ممکن ہوگا کہ ہم ایک محفوظ اور مستحکم دنیا کی تشکیل کر سکیں اور آپس میں یگانگت کے ساتھ رہ سکیں۔

پھر اپنی بات ان لفظوں میں ختم کرتے ہوئے کہتی ہیں:

مغرب میں لوگ اسلام کو سمجھنے کو کوشش میں کبھی مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو پائے، نہ ہی وہ اسلام کو قبول کر پائے ہیں۔ اس مذہب کے بارے میں ہمارے تصورات منفی، جارحانہ اور قابل نفرت رہے ہیں۔ لیکن اب ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ آج کی دنیا میں اس بے خبری اور تعصب کے ساتھ زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔(۱۰۱)

فتنہ پروری اور غلیظ ذہنیت بھی ایک عالمگیر مذہب ہے اور اس کے پیروکار ہر مذہب اور معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر، بنیادی انسانی حقوق یا آزادی اظہارِ رائے کی آڑ میں مذہب اور بانیِ مذہب کے متعلق بیہودگی بکنے والے کو حضرت مولانا رومیؒ نے خوب جواب دیا ہے اور توہین مذہب و رسالت کے مرتکب افراد کی اوقات کی اصل حقیقت بھی یہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: (۱۰۲)

دیداحمد را ابوجهل وبگفت — ابوجہل نے احمد (ﷺ) کو دیکھا اور کہا
زشت نقشی کزبنی هاشم شگفت — تو بدصورت ہے جو بنی ہاشم میں پیدا ہوا ہے
گفت احمدؐ مرورا که راستی — احمد (ﷺ) نے فرمایا تو سچا ہے
راست گفتی گرچه کارافزاستی — تونے سچ کہا اگرچہ بیہودہ گو ہے
دید صدیقش بگفت اے آفتاب — حضرت صدیقؓ نے ان کو دیکھا تو کہا اے آفتاب!
اے زشرقی نے زغربی خوش بتاب — اے وہ کہ جو نہ مشرقی ہے نہ مغربی خوب روشن ہو
گفت احمدؐ راست گفتی اے عزیز — احمد (ﷺ) نے کہا، اے عزیز! تونے سچ کہا
اے رهیده توزدنیائے نچیز — اے وہ کہ جو ناچیز دنیا سے آزاد ہے
حاضراں گفتند کا ئے صدرُالورا — حاضرین نے کہا، اے سرورِ عالمؐ!
راست گو گفتی تو دو ضد گو راچرا — آپ نے دو متضاد باتیں کہنے والوں کو سچا کیوں کہا؟
گفت من آئینه ام مصقولِ دست — فرمایا، میں ہاتھ کا منجھا ہوا آئینہ ہوں
ترك و هندودرمن آن بیند که هست — ترک اور ہندوستانی مجھ میں وہی دیکھتا ہے جو وہ خود ہے
هر کرا آئینه باشد پیش رُو — جس کے منہ کے سامنے آئینہ ہو
زشت و خوبِ خویش رابیند درُو — اپنے اچھے اور بُرے کو اس میں دیکھے گا

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ انٹرنیٹ کے کسی بھی انجن میں ''Perfectus'' لفظ ٹائپ کریں تو آپ کو یہ تمام معلومات مذید تفصیلات کے ساتھ بے شمار مسیحی ویب سائٹس پر مل جائیں گی۔

۲۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، پریچنگ آف اسلام، ترجمہ دعوت اسلام، مترجم: ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ص ۹۸، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۴۔ ایضاً، ص ۱۴۷

۵۔ گوگل سرچ انجن میں قرطبہ کے شہداء ''Martyrs of Cordoba'' لفظ ٹائپ کریں تو آپ کو یہ تمام معلومات مذید تفصیلات کے ساتھ بے شمار مسیحی ویب سائٹس پر مل جائیں گی۔

۶۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۲۳، مطبوعہ فیونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۷۔ نارمن ڈینئیل، عرب اور وسطی یورپ، ص ۲۹، مطبوعہ لندن ۱۹۷۵

۸۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۲۴، مطبوعہ فیونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۹۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۱۱۔ کیرن آرمسٹرانگ، یروشلم: ایک شہر تین مذاہب، ص ۴۳۰-۴۳۱، اُردو ترجمہ مطبوعہ تخلیقات لاہور

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۳۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۳۱-۴۳۲

۱۴۔ ٹیری جونز، صلیبی جنگیں، ص ۵۳، اُردو ترجمہ ڈاکٹر امان اللہ قریشی، مطبوعہ تخلیقات لاہور

۱۵۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۳-۵۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۴

۲۱۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۲۶، مطبوعہ فیونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۲۲۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، پریچنگ آف اسلام، ص ۱۵۴، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۲-۱۶۳

۲۴۔ ایضاً ص ۱۶۲

۲۵۔ ایضاً ص ۱۳۹

۲۶۔ ایضاً ص ۱۳۹

۲۷۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، پریچنگ آف اسلام، ص ۱۴۱، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب ۱۹۷۱ء۔

۲۸۔ آر۔ ڈبلیو۔ ساوتھرن، قرونِ وسطیٰ میں اسلام کے متعلق تصورات، ص ۲۹

۲۹۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۲۷، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۳۰۔ ایضاً ص ۲۷

۳۱۔ ایضاً ص ۲۷-۲۸

۳۲۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، پریچنگ آف اسلام، ص ۱۶۲-۱۶۳، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲ء۔

۳۳۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی ص ۲۸، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۳۴۔ ایضاً ص ۲۸

۳۵۔ ایضاً ص ۲۹

۳۶۔ فرینکلن گراہم، The Name، ص ۷۵، مطبوعہ تھامس نیلسن بکس امریکہ

۳۷۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۳۰، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۳۸۔ بنجمن کیدار، صلیبی جنگیں اور مشن: مسلمانوں کی طرف مغربی اپروچ، ص ۹۹، مطبوعہ پرنسٹن ۱۹۸۴ء

۳۹۔ ایضاً ص ۱۰۱

۴۰۔ ریجینڈ پرناوڈ، صلیبی جنگیں، ص ۲۲۱، مطبوعہ لندن ۱۹۶۳

۴۱۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۳۱-۳۲، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۴۲۔ جے اے کڈن، استنبول: تاریخی اور رومانوی شہر، ص ۸۷، مترجم محمد احسن بٹ، مطبوعہ جمہوری پبلیکیشنز لاہور۔

۴۳۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۳۲، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۴۴۔ ایضاً ص ۳۳

۴۵۔ ایضاً ص ۳۳

۴۶۔ ایضاً ص ۳۴

۴۷۔ نارمن ڈینیئل، اسلام اور مغرب، ص ۵-۲۸۴، مطبوعہ لندن ۱۹۶۰

۴۸۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۳۵، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۴۹۔ ایضاً ص ۳۵

۵۰۔ ہمفری پرائیڈیاکس، محمد: جعل سازی کا اصل روپ، ص ۸۰، مطبوعہ لندن ۱۷۰۸

۵۱۔ نارمن ڈینیئل، اسلام اور مغرب، ص ۲۹۷، مطبوعہ لندن ۱۹۶۰

۵۲۔ ایضاً ص ۳۰۰

۵۳۔ ایضاً ص ۲۹۰

۵۴۔ گبن، سلطنتِ روما کا زوال، ص ۶۵۷

۵۵۔ ٹامس کارلائل، آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ ص ۶۳

۵۶۔ ایڈورڈ سعید، استشراقیت، ص ۱۷۲

۵۷۔ ایضاً ص ۱۴۹

۵۸۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۴۰، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۵۹۔ ایضاً ص ۴۰

۶۰۔ ایڈورڈ سعید، استشراقیت، ص ۳۸

۶۱۔ رعنا کبانی، عیسائیت کے نام ایک خط، ص ۵۴، مطبوعہ لندن ۱۹۸۹ء

۶۲۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، ص ۲۱، مطبوعہ فونکس پریس لندن ۱۹۹۱

۶۳۔ ایضاً، پیش لفظ، ص ۱۲

۶۴۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۴ فروری ۲۰۰۶ء

۶۵۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۴ فروری ۲۰۰۶ء

۶۶۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۷ فروری ۲۰۰۶ء

۶۷۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۴ فروری ۲۰۰۶ء

۶۸۔ روزنامہ نوائے وقت، ۲۱ فروری ۲۰۰۶ء

۶۹۔ روزنامہ جنگ، ۱۴ فروری ۲۰۰۶ء

۷۰۔ روزنامہ جنگ، ۲۲ فروری ۲۰۰۶ء

۷۱۔ روزنامہ نوائے وقت، ۱۱ فروری ۲۰۰۶ء

۷۲۔ روزنامہ نوائے وقت، ۱۱ فروری ۲۰۰۶ء

۷۳۔ روزنامہ خبریں، ۷ فروری ۲۰۰۶ء

۷۴۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۵ فروری ۲۰۰۶ء

۷۵۔ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی، ۸ فروری ۲۰۰۶ء

۷۶۔ روزنامہ خبریں، ۸ فروری ۲۰۰۶ء

۷۷۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۸ فروری ۲۰۰۶ء

۷۸۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، عالمی رہنماؤں کے نام خصوصی مراسلہ بعنوان ''دنیا کو تہذیبی تصادم سے بچایا جائے''۔

۷۹۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۴ فروری ۲۰۰۶ء

۸۰۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۳ فروری ۲۰۰۶ء

۸۱۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۲۰ فروری ۲۰۰۶ء

۸۲۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۲۱ فروری ۲۰۰۶ء

۸۳۔ روزنامہ جنگ، ۱۶ فروری ۲۰۰۶ء

۸۴۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۸ فروری ۲۰۰۶ء

۸۵۔ پروفیسر خورشید، ''شیطانی کارٹون-تہذیبی کروسیڈ کا زہریلا ہتھیار''، ماہنامہ ترجمان القرآن، مارچ۔

۸۶۔ روزنامہ جنگ، ۱۵ فروری ۲۰۰۶ء

۸۷۔ روزنامہ جنگ، ۸ فروری ۲۰۰۶ء

۸۸۔ ڈیلی ٹیلی گراف ۴ فروری ۲۰۰۶ء

۸۹۔ گوگل سرچ انجن میں (Manuel II Paleologus) ٹائپ کریں گے تو اسکی سوانح حیات پر مزید تفصیلات سمیت آپ کو اسکی کتاب کا مکمل متن بھی مل جائے گا۔

۹۰۔ پوپ کی تقریر کا مکمل متن انٹرنیٹ پر ویٹی کن کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔

۹۱۔ بی بی سی ویب سائٹ، بمطابق تاریخ ۸ نومبر ۶۰۰۲ء

۹۲۔ بی بی سی ویب سائٹ، بمطابق تاریخ ۸ نومبر ۶۰۰۲ء

۹۳۔ بی بی سی ویب سائٹ، بمطابق تاریخ ۸ نومبر ۶۰۰۲ء

۹۴۔ بی بی سی ویب سائٹ، بمطابق تاریخ ۸ نومبر ۶۰۰۲ء

۹۵۔ بی بی سی ویب سائٹ، بمطابق تاریخ ۸ نومبر ۶۰۰۲ء

۹۶۔ بی بی سی ویب سائٹ، بمطابق تاریخ ۸ نومبر ۶۰۰۲ء

۹۷۔ باربرا وکٹر، دی لاسٹ کروسیڈ، ص ۲۵۷

۹۸۔ ایضاً، ص ۵

۹۹۔ نوائے وقت ۱۵ ستمبر ۲۰۰۶ء

۱۰۰۔ روزنامہ جنگ، ۱۷ ستمبر ۲۰۰۶ء

۱۰۱۔ کیرن آرمسٹرانگ، محمد ﷺ: ایک سیرۃ النبی، پیش لفظ، ص ۴، مطبوعہ فینکس پریس لندن ۱۹۹۱

۱۰۲۔ مثنوی، دفتر اول

حرفِ آخر

عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِاللّٰه

قَالَ كُنَّا نَعُدُّ الْاٰيَاتِ بَرَكَةً وَّاَنْتُمْ تَعُدُّوْنَهَا تَخْوِيْفاً

ہم برکت (محبت) والے معجزات کو گنتے رہے،

جبکہ تم خوف دلانے والے معجزوں کو شمار کرنے میں لگے رہتے ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

(بخاری شریف، کتاب الانبیاء، حدیث ۷۹۰)

☆

اور کوئی خوف کرنے والا محبت میں کامل نہیں ہوا

(۱-یوحنا ۴: ۱۸)

کیا جو تو پڑھتا ہے اسے سمجھتا بھی ہے؟

﴿جو تو پڑھتا ہے اسے سمجھتا بھی ہے؟﴾ (۱) یہ وہ سوال تھا جو آج سے تقریباً ۲۰۰۰ سال پہلے حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کے ایک پیروکار فلپس (Philips) نے ایک یہودی حبشی خوجے سے کیا تھا۔ یہ سوال ہمارے ان رویوں کی نشان دہی کرتا ہے جن کے متعلق یسوع علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے (۲)۔

آج ہم سمجھنے کے لیے نہیں پڑھتے بلکہ وراثت میں ملی ہوئی "سمجھ" کی تصدیق ڈھونڈنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ حق کی تلاش میں سب سے بڑی رکاوٹ شیطان نہیں بلکہ ہمارے وہ منفی رویے ہیں کہ جن کی موجودگی میں شیطان کو بھی اپنی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ہم سے تو وہ یہودی حبشی اچھا تھا کہ جس نے فلپس کے سوال کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر خدا کے کلام کی سمجھ اور روح کہیں سے بھی مل جائے تو یہ کائنات کی عظیم ترین خوشی ہوگی۔ حبشی خوجہ خوش نصیب تھا کہ اس کا رویہ اس کا سب سے عظیم دوست نکلا، وگرنہ وہ یسوع مسیح علیہ السلام کی شخصی عظمتوں اور پیغامِ محبت سے آشنا نہ ہو پاتا۔

یہ سوال بنیادی طور پر اس رویہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو معاملات زندگی کو حل کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، اور وہ ہے "احساس کم علمی"۔ علم میں یہ خوبی ہے کہ اس میں جس قدر پختگی اور گہرائی حاصل کی جائے یہ اتنا ہی کم علم ہونے کا احساس بڑھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عجز و انکساری ایک حقیقی عالم دین کا وصف خاص ہے۔ کیونکہ اس کے علم کی پختگی و گہرائی نے اس کے علم کے کم ہونے کے احساس کو اور بھی پختہ کر دیا ہے لہٰذا علم کی معراج یہی ہے کہ "مجھے علم نہیں"۔ یہی رویہ انسان میں تلاشِ حق کی طلب اور جستجو پیدا کرتا ہے۔ انہی منفی رویوں کی نسبت قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ سورۃ بقرہ، آیت ۲۶

"گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو"

گمراہی قرآن سے نہیں ملتی بلکہ گمراہی انسان کی نیت میں ہوتی ہے جس کا اظہار وہ اپنے رویے سے کرتا ہے۔ جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے، حقیقت کی جستجو نہیں رکھتے، ان کی نگاہیں تو بس الفاظ میں اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے الٹ نتائج نکال کر حق سے اور زیادہ دور چلے جاتے ہیں۔ نیت گندی ہو اور خواہش نفس ہی مقصد حیات ہو تو ایسی جگہ پر اللہ کے کلام کا فیض نہیں ٹھہرتا۔ اس کے برعکس جو حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں۔ ان کو انہی باتوں میں حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہو سکتی ہیں۔ اللہ کے کلام سے فیض حاصل کرنے کے لیے نیت کی درستگی، دل کا اخلاص اور درست طریقہ مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ساری بات رویوں ہی کی ہے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے آج اسلام کی تبلیغ (presentation) کی بنیاد خوف پر ہے۔ جبکہ حضور ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجتے وقت ہدایت فرمائی تھی کہ (وبشرا) لوگوں کو میرے دین کا پیغام خوشخبریوں کے ساتھ پہنچانا (۳)۔ حضور ﷺ نے اپنی پوری سیرت طیبہ میں تبلیغ اسلام کی بنیاد ''محبت الٰہی'' اور دیدار الٰہی'' پر رکھی تھی۔ جبکہ ہمارے نظام تبلیغ کی بنیاد ''دیدار الٰہی'' کی بجائے ''موت کا منظر'' پر ہے۔ ہم محبت الٰہی اور محبت رسول ﷺ کے پیغام کی قوت سے معاشرے کو تبدیل کرنے کی بجائے اسلامی سزاؤں کے نفاذ سے خوف کی کیفیت پیدا کر کے برائی کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ معاشرے میں برائی اور جرائم کے جراثیم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے بیج بونے سے ختم ہوتے ہیں۔ اسلامی سزائیں شریعت اسلامیہ کا حصہ ضرور ہیں مگر اس کی بنیاد نہیں۔ پھانسی دینے سے مجرم تو ختم کیا جا سکتا ہے، جرم نہیں۔

اسلام کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ اسلام محبت الٰہی کے بیج بونے سے پھیلا ہے، خوف الٰہی سے نہیں۔ خوف الٰہی تو وہ پھول ہے جو محبت الٰہی کے بیج سے پیدا ہوتا ہے۔ دل میں محبت نہ ہو تو نہ کوئی خوف رہتا ہے نہ کوئی ڈر۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عَلْقَمَة سے معجزات نبوی ﷺ کے حوالہ سے فرمایا:

﴿عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِاللهِ قَالَ كُنَّا نَعُدُّ الْاٰيَاتِ بَرَكَةً وَّاَنْتُمْ تَعُدُّوْنَهَا تَخْوِيْفًا﴾

ہم برکت (محبت) والے معجزات کو گنتے رہے، جبکہ تم خوف دلانے والے معجزوں کو شمار کرنے میں لگے رہتے ہو۔ (۴)

دونوں اقسام کے معجزات برحق ہیں مگر اسلام نے اپنے پیغام اور نظام حیات کی بنیاد محبت اور پیار

پر رکھی ہے۔ جب محبت الٰہی اور محبت رسول ﷺ کا بیج دل میں بو دیا جائے تو خوف الٰہی وہ کیفیت بن جاتی ہے جو اس محبت کو جلا بخشتی ہے۔ اس لیے یسوع مسیح علیہ السلام نے انسان کے اعمال کی بنیاد محبت الٰہی کو بنایا ہے۔ آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿جس کے پاس میرے حکم ہیں اور وہ ان پر عمل کرتا ہے وہی مجھ سے محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ میرے باپ کا پیارا ہوگا اور میں اس سے محبت رکھوں گا اور اپنے آپ کو اس پر ظاہر کروں گا﴾ یوحنا ۱۴:۲۱

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

﴿اگر تم میرے حکموں پر عمل کرو گے تو میری محبت میں قائم رہو گے جیسے میں نے اپنے باپ کے حکموں پر عمل کیا ہے اور اس کی محبت میں قائم ہوں۔﴾ یوحنا ۱۵:۱۰

یسوع علیہ السلام نے اتباع شریعت کی بنیاد ''محبت الٰہی'' پر رکھی ہے کیونکہ اسی سے تعمیر شخصیت ہوتی ہے اور دنیا میں انقلاب بھی اسی سے آتے ہیں۔ یوحنا بھی اپنے پہلے خط میں لکھتے ہیں کہ انسان کے اعمال کی بنیاد محبت الٰہی ہے۔

﴿اور خدا کی محبت یہ ہے کہ ہم اس کے حکموں پر عمل کریں اور اس کے حکم سخت نہیں﴾
۱-یوحنا ۵:۳

محبت جب کامل ہوتی ہے تو خوف کو دُور کر دیتی ہے چنانچہ یوحنا لکھتے ہیں:

﴿محبت میں خوف نہیں ہوتا بلکہ کامل محبت خوف کو دُور کر دیتی ہے کیونکہ خوف سے عذاب ہوتا ہے۔ اور کوئی خوف کرنے والا محبت میں کامل نہیں ہوا۔﴾ ۱-یوحنا ۴:۱۸

یہ محبت جب کامل ہوتی ہے تو خدمتِ خلق میں بدل جاتی ہے۔

﴿اگر کوئی کہے کہ میں خدا سے محبت رکھتا ہوں اور وہ اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو جھوٹا ہے۔ کیونکہ جو اپنے بھائی سے جسے اس نے دیکھا ہے محبت نہیں رکھتا وہ خدا سے بھی جسے اس نے نہیں دیکھا محبت نہیں رکھ سکتا۔ اور ہم کو اس کی طرف سے یہ حکم ملا ہے کہ جو کوئی خدا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنے بھائی سے بھی محبت رکھے۔﴾ ۱-یوحنا ۴:۲۰-۲۱

اسی لیے ہم نے اس کتاب کا نام ''مکالمۂ محبت'' رکھا ہے تا کہ باہمی تعلقات اسلام اور مسیحیت کے متفقہ پیغامِ محبت پر رکھیں اور خوفِ الٰہی کی کیفیت سے اس جذبہ محبت کو پروان چڑھائیں۔

بقول تاجدارالاحسان، حضرت ابوانیس محمد برکت علی لدھیانویؒ: انشاء اللہ! دنیا وہ وقت بھی دیکھے گی جب پاکستان کی ''ہاں'' اور ''نہ'' پر قوموں کی تقدیر کے فیصلے ہوا کریں گے۔ پاکستان پر یہ وقت تب تک نہیں آئے گا جب تک ہم اپنے آپ کو اس عظیم ذمہ داری کے لیے تیار نہیں کریں گے اور انشاء اللہ پاکستان پر یہ وقت ضرور آئے گا۔ یہ فیصلہ اب ہمیں کرنا ہے کہ ہم اپنے اعمال وافکار کی سمت درست کر کے یہ وقت اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتے ہیں یا اپنے آنے والی بعد کی نسلوں کے مقدر میں لکھنا چاہتے ہیں۔

دلوں میں ولولہ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہان پیر کی موت
اقبال، ضرب کلیم

﴿حوالہ جات﴾

۱۔ اعمال ۸:۳۰
۲۔ متی ۱۳:۱۳
۳۔ الصحیح البخاری، کتاب الجهاد والسّیر، حدیث:۲۸۶
۴۔ الصحیح البخاری، کتاب الانبیاء، حدیث۷۹۰

﴿ضمیمہ﴾

تعلیم یافتہ نظر آنے کے جدید طریقے

(طنز ومزاح)

☆

گدھا اگر امریکہ جا کر اپنی جنس تبدیل کروا لے اور پھر شیر بن کر پاکستان واپس آ جائے تو پھر بھی اپنی آواز سے فوراً پہچانا جائے گا اور اگر اپنی آواز بھی تبدیل کروا لے تو کم از کم اپنی دولتی مارنے والی عادت سے تو ضرور ہی پکڑا جائے گا۔ اس لیے کہ گدھا اپنی شکل وصورت اور آواز تو تبدیل کروانے میں کامیاب ہو سکتا ہے مگر فطرت تبدیل کرنے کا کوئی آلہ ابھی تک امریکہ ایجاد نہیں کر سکا۔

آج شیر کی شکل وصورت اور شیر کی آواز میں بے شمار گدھے تعلیمی درسگاہوں میں لیکچرز دینے میں مصروف ہیں۔ اہل علم وصحبت ان کی دولتی مارنے والی فطرت سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

﴿نعیم مشتاق﴾

موجودہ فضیلت بھی کوئی ہے کہ نہیں
تعلیم سے نسبت بھی کوئی ہے کہ نہیں
پوشاک تو قیمتی پہن لی تو نے
اپنی تیری قیمت بھی کوئی ہے کہ نہیں؟

پیر نصیرالدین نصیر

﴿پیش لفظ﴾

پاکستانی معاشرے کی بے شمار معاشرتی بیماریوں میں سے ایک بیماری جو آج کل عروج پر جا رہی ہے کہ انگریزی زبان کے چند جملے بولنے کی صلاحیت حاصل کر لینے اور انگریزی ادب کی چند کتب پڑھ کر ہم لوگ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

چنانچہ ہمارا تعلیم یافتہ [illegible] طبقے پر طنز اور تنقید کرنا اپنا علمی حق سمجھتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم جدید تعلیم حاصل کر کے اپنے دین دار طبقے کے تعلیمی نظام اور ماحول کو بہتر بنانے میں مدد کرتے، ہم احساسِ برتری کا شکار ہو گئے۔ یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی کہ بے شک مذہبی قیادت کی اکثریت بے کردار لوگوں پر مشتمل ہے مگر سب ہی بُرے تو نہیں۔

آج ہمارے فریب نفس کا یہ حال ہے کہ چند جملے لکھنے آ جائیں تو خود کو غزالی اور رازی اور چند آنسو آنکھوں سے ٹپک پڑیں تو اپنے آپ کو رومی و عطار سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔

تربیت جگہ اور ماحول کی محتاج نہیں ہوتی۔ تربیت علم و فکر کے حامل افراد کی صحبت سے ملتی ہے۔ جگہ اور ماحول ثانوی درجے کی ضروری چیزیں ہیں۔ گدھا اگر امریکہ جا کر اپنی جنس تبدیل کروالے اور پھر شیر بن کر پاکستان واپس آ جائے تو پھر بھی اپنی آواز سے فوراً پہچانا جائے گا اور اگر اپنی آواز بھی تبدیل کروالے تو کم از کم اپنی دولتی مارنے والی عادت سے تو ضرور ہی پکڑا جائے گا۔ اس لیے کہ گدھا اپنی شکل و صورت اور آواز تو تبدیل کروانے میں کامیاب ہو سکتا ہے مگر فطرت تبدیل کرنے کا کوئی آلہ ابھی تک امریکہ ایجاد نہیں کر سکا۔ آج شیر کی شکل و صورت اور شیر کی آواز میں بے شمار گدھے تعلیمی درسگاہوں میں لیکچرز دینے میں مصروف ہیں۔ اہل علم و صحبت ان کی دولتی مارنے والی فطرت سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

ہم نے اپنے اس مضمون میں اس ''تعلیم یافتہ دولتی مار طبقہ'' پر طنز کیا ہے جو دوسروں کی خامیوں کو اپنی خوبیاں سمجھتا ہے جو مشکلات کے حل میں مدد کی بجائے محض ان کو اچھال کر اپنی دکانداری چمکا رہے ہیں۔

اس مضمون میں مزاح کم اور طنز زیادہ ہے اس لیے کہ ''یہ دولتی مار تعلیم یافتہ طبقہ'' مزاح سے زیادہ طنز کا حقدار ہے۔ یہ مضمون ہمارے عملی مشاہدات کا نچوڑ ہے۔

﴿ مولویوں کو اکثر بُرا بھلا کہا کریں، تا کہ روشن خیال نظر آئیں ﴾

وہ دور گیا جب روشن خیالی علم اور فکر سے منسلک سمجھی جاتی تھی۔ ''جدید سائنسی اور معاشرتی ترقی'' نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ روشن خیالی بے بنیاد تنقید کا نام ہے۔

بے بنیاد تنقید کے کئی فوائد ہیں۔ مثلاً لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ نے موضوع گفتگو پر کافی تحقیق کی ہوئی ہے۔ پھر تنقید سے آپ کا کردار دوسروں کی نظروں میں مزید بلند ہو جاتا ہے، وہ آپ کو مزید عزت سے نوازتے ہیں۔

مولوی حضرات کی ایک خامی آپ کی خوبی بن سکتی ہے اور وہ یہ کہ مولوی حضرات حق اور سچ بات کو جدید طرز گفتگو کے انداز میں نہیں کر پاتے۔ انگریزی ویسے ہی نہیں آتی لہٰذا ان پر آپ کی تنقید کے چند جملے اگر انگریزی زبان میں ہوں تو اس سے آپ کا IMAGE مزید بہتر بنے گا۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ بوقت تنقید آپ کا حلیہ مولویوں جیسا نہ ہو۔ ٹائی اور کوٹ پہن کر تنقید کریں گے تو اس سے آپ کی شخصی وجاہت اور مردانہ حسن میں چار چاند لگ جائیں گے۔

تنقید میں ایک اور خصوصی خیال رکھیں کہ مولویوں پر تنقید میں سب کو شامل کر لیں یعنی لفظ مولوی سے علماء اور صوفیاء اسلام کے تمام طبقات مراد لیں بلکہ اس میں مذہب کے تصور کو بھی شامل کر لیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو خطرہ ہے کہ سامعین میں سے کوئی کوئی سمجھدار شخص یہ کہہ دے کہ جناب ایک طبقے کی غلطیوں کی سزا دوسرے طبقات کو کیوں دے رہے ہیں؟ یوں آپ کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا خیر و عافیت اسی میں ہے کہ آپ محمود کی ٹوپی ایاز کے سر پر رکھ دیں۔ دورانِ تنقید صرف لفظ مولوی استعمال کریں مگر دلیل کے ڈنڈے سب پر برسائیں۔

اس حقیقت کی کون پرواہ کرتا ہے کہ بُرے لوگ تو ہر شعبہ زندگی میں ہوتے ہیں خواہ یہ دین داری کا معاملہ ہو یا دنیاداری کا، سیاست، کاروبار، سپورٹس وغیرہ کوئی بھی شعبہ بُرے لوگوں کے وجود سے پاک نہیں مگر مولویوں پر دورانِ تنقید اس حقیقت کی قطعاً پرواہ نہ کریں اور اُن پر کھلی تنقید ہر پہلو سے جائز سمجھیں۔ یہاں اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ مولویوں کے طبقہ کے علاوہ دوسرے تمام طبقات میں اچھے اور بُرے لوگوں میں امتیاز قائم رکھیں۔ مثلاً سیاست اور کاروباری طبقے ہی لیں، بھول کر بھی ان پر تنقید مت کریں کیونکہ اس طرح آپ کے تعلقات سیاسی اور کاروباری حلقوں سے خراب ہو سکتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں آپ معاشی پریشانیوں کا شکار ہو سکتے ہیں جبکہ مولویوں سے آپ کو سوائے خطاب اور ثواب کے

علاوہ اور کیا ملے گا؟

مولوی حضرات پر تنقید تو تعلیم یافتہ طبقہ کا بنیادی حق ہے۔ مشہور و معروف یونیورسٹیوں میں پڑھ کر اگر ہم مولویوں پر تنقید کرنا نہ سیکھیں تو ہماری تعلیم سے ہمیں کیا حاصل ہوا؟ کیا یہی ہماری قابلیت ہے؟ کیا اسی لیے ہمارے والدین نے قربانیاں دے کر ہمیں اتنی مہنگی تعلیم دلوائی؟ افسوس ہے ایسی تنگ نظر تعلیمی قابلیت پر۔

اگر کبھی ہم ''کلین شیو اہل علم'' سال میں معاشرتی دباؤ کے تحت ایک آدھ مرتبہ نمازِ جمعہ پڑھنے کے لیے چلے بھی جائیں تو داڑھی کی فضیلت پر اس قدر زوردار تقریر کرتے ہیں کہ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش مسجد میں آنے سے پہلے ٹوپی کی بجائے بازار سے، دس روپے کی نقلی داڑھی خرید لی ہوتی۔ یوں شرمندگی اور ندامت کے ساتھ جمعہ پڑھنے سے قلب و باطن میں جو انقلاب برپا ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ لہٰذا جمہوریت کے جدید تصورات کے نقطۂ نظر سے ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ جب بھی ہمیں موقعہ ملے ہم بھی اپنی تنقید میں ان سے اپنی بے عزتی کا دل کھول کر بدلہ لیں۔

مگر اس ساری تنقید کے باوجود جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو کبھی کبھار مسجد یا مذہبی جلسے جلوسوں کے لیے دس پندرہ روپے چندہ بھی دیتے رہنا چاہیے تا کہ ہمارا ضمیر بھی مطمئن رہے اور امت مسلمہ بھی ہماری احسان مند رہے۔

﴿ ٹائی اور کوٹ کی علمی وفکری اہمیت ﴾

اکثر و بیشتر پینٹ، شرٹ، ٹائی اور کوٹ پہنا کریں تا کہ خاموش رہنے کے باوجود تعلیم یافتہ نظر آئیں۔ شلوار قمیض علمی نہیں بلکہ عوامی لباس ہے۔ چونکہ غریبوں کی اکثریت اسے ستر ڈھانپنے کے لیے استعمال کرتی ہے اس لیے اب اس لباس کی علمی وفکری حلقے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رہی۔ اہل علم تو ہمیشہ سے ٹائی اور کوٹ استعمال کرتے آئے ہیں۔ دنیا کے معروف و مشہور سائنس دان، مفکر اور سیاست دان ہمیشہ سے اسی لباس کو شلوار قمیض پر ترجیح دیتے آئے ہیں بلکہ ان کے ہاں تو شلوار قمیض کا تصور ہی نہیں جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ خالصتاً ہماری تخلیق ہے۔

ہمارا معاشرہ سائنسی ترقی میں دوسری قوموں سے اس لیے پیچھے رہ گیا ہے کہ ہم لوگ ابھی تک شلوار قمیض سے چھٹکارا نہیں پا سکے جبکہ دنیا ٹائی اور کوٹ پہننے کی بدولت چاند پر جا چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ٹائی اور کوٹ کی اہمیت پر ایک خصوصی نصاب مرتب کر کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جائے ایسی تعلیم کا کیا فائدہ جس سے انسان ٹائی اور کوٹ کی قدر و قیمت اور اہمیت

ہی نہ پہچان سکے؟

﴿مغربی تحقیقات کو اسلامی تحقیقات بنا کر پیش کریں﴾

اس فن میں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ شہرت حاصل کرنا ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے بہت وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ اہلِ دانش وقت کی قدر و قیمت جانتے ہیں اسی لیے وہ ہمیشہ سے دوسروں کی محنت اور تحقیقات کے بل بوتے پر شہرت حاصل کرتے آئے ہیں۔

ویسے بھی ہمارے معاشرے میں شہرت اور مقام (status) کی زیادہ قدر و قیمت ہے علم کی نہیں، لہٰذا کسی ایسی چیز کے لیے وقت برباد کرنا دانشمندی نہیں جو قابلِ عزت نہ سمجھی جاتی ہو۔ پیسہ علم سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر یہ جیب میں ہو تو احمق صورت انسان بھی دیکھنے والے کو عالم فاضل نظر آتا ہے۔ باطن کی بات تو ہم تب کریں جب یہ دور اہلِ باطن کا ہو۔

وہ زمانہ گیا جب لوگ کردار نظریات سے انسان کی قدر و منزلت کا اندازہ لگاتے تھے (آج کل انسان کی شخصی عظمت کا اندازہ اس کی شہرت سے لگایا جاتا ہے اس کے کردار سے نہیں۔ جو جتنا مشہور ہے وہ اتنا ہی عظیم سمجھا جاتا ہے)۔ انسان اگر مشہور ہو تو لوگ بالخصوص پیروکار اس کے غلط جملوں کو بھی مثبت انداز سے پیش کرتے ہیں خواہ کہنے والا خود اپنی غلطی تسلیم کر چکا ہو۔

اس جدید سائنسی ترقی کے دور میں ہمارے معاشرے نے بھی لاجواب ترقی کی ہے کہ دوسروں کی شخصیت پرکھنے کا آسان فارمولا ایجاد کر لیا ہے (پرانے وقتوں میں یہ ایک دقت طلب کام تھا) اس ایجاد کا سہرا ہم پاکستانیوں کے سر ہے کہ ہم لوگوں کے ظاہری حلیے سے ان سے بات کیے بغیر ان کے اندر کی چھپی ہوئی صلاحیتوں اور کمالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم جلد یہ ٹیکنالوجی امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کو ایٹمی ٹیکنالوجی کے بدلے بیچ سکیں گے۔

بہرحال بات ہو رہی ہے کہ کس طرح مغربی تحقیقات کو اسلامی تحقیقات بنا کر پیش کریں! طریقہ بڑا سادہ ہے مگر اس کے لیے تھوڑی سی عقل چاہیے۔ آپ متعلقہ موضوع پر مغربی مصنفین کی کتب پڑھ کر (منفی سوچ کے حامل لوگ اس کو ادبی چوری کہتے ہیں) اس سے اپنا لیکچر تیار کر لیں۔ پھر دوران لیکچر ایک یا دو گھنٹے گفتگو کے بعد قرآن پاک کی کوئی ایک آیت یا حدیث نبوی ﷺ بیان کر دیں۔ اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگ یہ سمجھیں گے کہ آپ قرآن و حدیث کے علم کے بھی ماہر ہیں۔ پھر قرآن مجید اور حدیث نبوی ﷺ کے بیان کی برکت سے سارا لیکچر بھی اسلامی ہو جائے گا۔

لوگوں کو تو یہ پتہ ہی نہیں چلے گا کہ جس نے تحقیق کی ہے اس نے تو ساری عمر قرآن و حدیث نہیں پڑھی، بلکہ حالت کفر ہی میں مرا۔ اس نے زندگی کے حقائق محض سائنسی بنیادوں پر اخذ کیے ہیں۔ آپ کا کمال یہ ہوگا کہ کسی غیر مسلم کی تحقیق کو آپ نے اسلامی تحقیق بنا ڈالا۔ بھلا اس سے بڑھ کر اسلام کی خدمت اور کیا ہوگی؟

﴿بغیر محنت ماہر نظر آنے کا طریقہ﴾

اس کا بہت آسان طریقہ ہے۔ جاہل لوگ خواہ مخواہ اپنی پوری زندگی علم حاصل کرنے پر لگا دیتے ہیں جبکہ علم کی گہرائی میں تو ایک دن میں بھی جایا جا سکتا ہے۔

آپ جس موضوع پر ماہر کہلوانا پسند کریں۔ کتابوں کی بڑی سی دوکان پر جا کر اس موضوع پر کتب دیکھ لیں۔ یہاں کتب دیکھنے سے ایک خاص عمل مراد ہے۔ سب سے پہلے آپ کتابوں کے عنوانات یاد کر لیں اگر یہ ممکن نہ ہو تو دکاندار سے آپ یہ بہانہ کر سکتے ہیں جناب ہم نے اپنی لائبریری کے لیے چند کتب خریدنی ہیں، لہٰذا فہرست بنانے کی اجازت فرمائیں۔ دکاندار لائبریری کے لیے کتابیں بیچنے کی خواہش میں نہ صرف آپ کو فہرست بنانے کی اجازت دے گا بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کو ایک کپ چائے بھی پلائے۔ یوں آپ کے پاس نہ صرف مفت میں کتابوں کی فہرست آ جائے گی بلکہ آپ چائے کے 5 روپے بھی بچا لیں گے جو بعد ازاں آپ ویگن کے کرایہ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

بہرحال! کتب کی فہرست بنانے کے ساتھ ساتھ کتاب کے چیدہ چیدہ مقامات بھی پڑھتے جائیں تاکہ بوقت ضرورت آپ کتاب پر 5 یا 10 منٹ کی گفتگو بھی کر سکیں۔ اس سارے عمل پر (چائے پینے کا وقت نکال کے) تقریباً ایک گھنٹہ لگے گا۔ اب اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اس شدید محنت اور مشقت سے حاصل کیے ہوئے علم کو آپ کس طرح بیان کریں کہ لوگ آپ کو موضوع پر ماہر سمجھیں اور اپنی کم علمی کے باعث آپ کی تجزیاتی اور تحقیقی صلاحیتوں پر شک نہ کریں۔

گفتگو میں ماہر نظر آنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دورانِ گفتگو مخاطب سے زیادہ سے زیادہ سوالات پوچھیں اس کے بنیادی طور پر دو فائدے ہیں ایک تو اس سے دوسرے کی انا کو بھی تسکین ملے گی کیونکہ اس معاشرے میں سب لوگ توجہ کی کمی کا شکار ہیں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سارے وقت میں گفتگو کا دارومدار دوسرے کے خیالات و نظریات کے اردگرد گھومے گا اور یوں لوگ آپ کے علم کی گہرائی تک پہنچنے سے قاصر رہیں گے۔

﴾صرف لیکچر دیں اور سوالات و جوابات سے سخت پرہیز کریں﴿

علمی وفکری تصورات کی حیثیت ان ہیروں کی سی ہوتی ہے جو تازہ تازہ کان سے نکالے جائیں پھر ان ہیروں کو اگلے مرحلہ میں تراش خراش کے عمل سے گزارا جاتا ہے جس سے پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس عمل سے گزرنے کے بعد اس کی کرنوں میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے کنجوس کی جیب خالی کروا سکتے ہیں۔

سوالات و جوابات کا سیشن اس مرحلہ کی حیثیت رکھتا ہے جہاں تصورات کے ہیروں کو سوالات کے آلات سے مزید نکھارا جاتا ہے تاکہ سب واضح طور پر اس کی شعاعوں کو دیکھ سکیں اور کسی کو ان علمی و فکری تصورات کے ہیرا ہونے پر شک وشبہ نہ رہے۔

ہم سوالات کے مرحلہ کی تب اجازت دیں جب ہمارے پاس ہیرے ہوں۔ اس جدید سائنسی دور میں کس جاہل کے پاس اتنا وقت ہے کہ پہلے تو وہ کان تلاش کرے پھر وہاں سے ہیرے نکالے اور پھر انہیں تنقید کے پیچیدہ عمل سے گزارے۔ اہل دانش ہمیشہ سے دوسروں کی تحقیق چرا کر شہرت حاصل کرتے آئے ہیں مگر اس جاہل معاشرے میں کس کو سمجھ ہے؟

لیکچر دینے کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس امید پر آپ کی بات سنتے چلے آتے ہیں کہ سوالات و جوابات کے مرحلہ میں سمجھ میں نہ آنے والے جملوں کی وضاحت سن لیں گے۔ اہل عقل سوالات و جوابات کے مرحلہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ تو پھر ہم بے وقوف لوگوں کو سوالات کرنے کا موقعہ کیوں دیں؟

سوالات و جوابات کے سیشن بعض اوقات خطرناک بھی ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ہم نے خود کونسی تحقیق کی ہوتی ہے۔ (انسان کے عالم فاضل ہونے کا پول سوالات و جوابات کے مرحلہ میں کھل جاتا ہے لہٰذا اس مرحلہ سے سختی کے ساتھ پرہیز لازمی ہے)۔ اس میں کسی ایسے سوال سے بھی سامنا ہو سکتا ہے جس کا جواب نہ آتا ہو۔

اگر خدانخواستہ کبھی کسی ایسے سوال سے سامنا ہو بھی جائے تو اس صورت حال پر قابو پانے کا ایک آسان طریقہ ہے کہ آپ سوالی سے یہ کہہ دیں اس موضوع پر یا اس سوال کے جواب پر میرا اگلا لیکچر آ رہا ہے آپ تفصیل سے وہ سن لیجیے گا یا پھر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے لہٰذا آپ میٹنگ برخاست ہونے کے بعد مجھ سے مل لیجیے گا۔ پورے مجمع کی نسبت اکیلے آدمی کو بیوقوف بنانا قدرے آسان ہے آپ خود اعتمادی سے جھوٹ بھی بولیں گے تو اکیلے آدمی کے لیے انکار کرنا مشکل ہو گا۔ اکیلے میں اور علیحدگی میں بات کرنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے۔

﴾خواہ مخواہ انگریزی بولا کریں﴿

یہ بات درست ہے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے مگر اس کا استعمال صرف اسی وقت فائدہ مند ہے جب آپ قوم سے مخاطب ہو رہے ہوں، خواہ آپ کو ٹھیک سے اردو بولنا بھی نہ آئے (محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کا پہلا قوم سے اردو میں خطاب، اور اس خطاب میں آپ نے اردو زبان کی جو ''خدمت'' فرمائی تھی وہ کیا آپ کو اب تک یاد ہے؟)

خواہ مخواہ انگریزی بولنے کے کئی فوائد ہیں۔ مثلاً لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ پنجاب یونیورسٹی کی بجائے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس لیے آپ کی بات دوسروں کی نسبت زیادہ دھیان سے سنتے ہیں۔ آج کل تو ویسے بھی ہمارے ہاں تعلیم کا معیار اس طرح سے پرکھا جاتا ہے کہ تعلیمی سرگرمیاں انگریزی ہوتی ہیں یا اردو زبان میں۔ بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ انگریزی بولنے کے سبب لوگ آپ کو ''سمجھدار اور سیانا'' سمجھتے ہیں۔

ایک اور اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ گفتگو میں اخلاقی حدوں کو پار کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے انگریزی میں بولنا مفید رہتا ہے۔ اردو میں گفتگو کریں گے تو لوگ آپ کو ''لچا اور لفنگا'' سمجھیں گے اور آپ کی گفتگو فحش سمجھی جائے گی مگر یہی گفتگو اگر آپ انگریزی میں کریں گے تو لوگ آپ کو عصر حاضر کے نازک مسائل پر اتھارٹی سمجھیں گے۔

انگریزی لڑائی جھگڑے میں بھی بہت کام آتی ہے۔ اردو اور پنجابی زبان کی گالیاں اب کثیر استعمال کے سبب عام ہو گئی ہیں۔ اب ان میں جدت نہیں رہی جبکہ ہالی وڈ کے زیر سایہ انگریزی زبان میں گالیوں کے ذخیرہ نے کافی ترقی کر لی ہے۔ انگریزی میں گالیاں دینے سے سننے والا ایک تو جواب دینے سے قاصر رہے گا اور اگر اردو یا پنجابی میں جواباً گالی بھی دے تا تو نفسیاتی اعتبار سے آپ سے کمتر ہی ٹھہرے گا اور یوں آپ خواہ مخواہ انگریزی بولنے کے سبب درست نقطہ نظر کے حامل قرار پائیں گے۔

انگریزی زبان میں گندی گندی گالیاں دینے کے قابل ہو جانا، اس سے بڑھ کر آپ کے تعلیم یافتہ ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

تقریظات

☆

اپنے آپ کو ویسا ہی ظاہر کرو جیسے کہ حقیقت میں تم ہو،
ورنہ پھر لوگ تم کو ویسا ہی دکھائیں گے جیسے کہ تم ہو گے۔

حضرت خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

☆

۱۔ڈاکٹر انوار حسین صدیقی: صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۔ڈاکٹر محمد خالد مسعود: چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

۴۔پروفیسر محمد الیاس اعظمی: کالج آج شریعہ منہاج یونیورسٹی-لاہور

۸۔خالد رحمٰن: ڈائریکٹر جنرل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

۵۔تنویر احمد خان: مصنف، شاعر، نیشنل یوتھ ایوارڈ ۲۰۰۴ برائے حقوق انسانی وسماجی بہبود

۷۔احمد سلیم: مصنف نقاد، ریسرچ اسکالر

ڈاکٹر انوار حسین صدیقی

صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

آج کل کے بین الاقوامی حالات میں دہشت گردی، عراق اور افغانستان میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کی چڑھائی، فلسطین میں اسرائیلیوں کے ظلم وستم کے تناظر میں مغربی طاقتور اور مسلمانوں میں ایک شدید کشمکش اور تناؤ کی کیفیت ہے۔ اس تناؤ کو کم کرنے اور ہم آہنگی کی فضا قائم کرنے کے لیے، آج کل بین المذاہب مکالموں پر بہت زور دیا جارہا ہے۔ اگرچہ یہ کشمکش زیادہ تر سیاسی اور معاشی وجوہ کی بناء پر ہو رہی ہے، لیکن صلح جو بین الاقوامی حلقوں اور رہنماؤں کی جانب سے بین المذاہب مکالموں اور خصوصاً مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان افہام وتفہیم پر زور دیا جارہا ہے۔

ان حالات میں ڈاکٹر نعیم مشتاق صاحب کی تصنیف ''مسیحیت، اسلام اور مکالمۂ محبت'' ایک انتہائی بروقت اور قابل قدر کوشش ہے۔ بین المذاہب مناظروں کی تاریخ پرانی ہے، لیکن تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ان مناظروں سے بین المذاہب ہم آہنگی بڑھنے کی بجائے، نفرتیں اور غلط فہمیاں اسی طرح قائم رہیں، بلکہ اور بڑھتی گئیں۔ منصف نے بڑی عرق ریزی سے مناظروں اور مکالموں کا فرق واضح کیا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ اگر نیک نیتی سے ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے یا کم کرنے کے ارادے سے یہ مکالمہ کیا جائے تو اس سے دنیا میں تناؤ اور فساد کم کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر نعیم مشتاق صاحب نے اپنی کتاب کے عنوان کو مکالمۂ محبت کے نام سے معنون کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا مقصد اقوام اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان محبت اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ آپ نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر بین المذاہب مکالمے نیک نیتی سے کیے جائیں تو یہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

میں ڈاکٹر نعیم مشتاق صاحب کو ان کی اس علمی کاوش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو محبت اور رواداری کے ساتھ رہنے کا طریقہ سکھانے میں مددگار ثابت ہوگی اور مذہبی منافرت کی آگ بجھانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

آج کل بین المذاہب ہم آہنگی اور مکالمہ بین المذاہب غالباً سب سے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ بن گئے ہیں۔ کسی لفظ کے کثیرالاستعمال ہونے سے یہ لازم ہوتا ہے کہ اس سے وابستہ فکر یا معانی بھی مقبول یا ہر دلعزیز ہوں۔ خاص طور پر ان الفاظ کا جھنڈا اٹھانے والے لوگوں میں جب ایسے حضرات بھی شامل ہوں جو نہ تو لفظ و معنی کی ہم آہنگی کے قائل ہوں اور نہ اس کی پروا کرتے ہوں بلکہ ایسے بھی جو مکالمہ (باہمی گفت وشنید) کی بجائے مگالمہ (باہم گالی گلوچ) سے مسائل حل کرنے کے عادی ہوں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ کوئی تجزیہ نگار لفظ اور معنی کے اس رشتے کو پھر سے استوار کرے۔ ڈاکٹر نعیم مشتاق کی کتاب ''مسیحیت، اسلام اور مکالمۂ محبت'' ایسی ہی تجزیاتی کوشش ہے۔

پاکستان بہت سے مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ کئی مذاہب کے مقدس یادگاریں اس سرزمین پر موجود ہیں۔ ڈاکٹر نعیم مشتاق نے مسیحیت کا خصوصی انتخاب اس لیے کیا ہے کہ گزشتہ صدی میں پاکستان کی آزادی کی تحریک میں اور اس ملک کی بقا اور سالمیت میں پاکستانی مسیحیوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ قائداعظم کا منشور تھا کہ مذہب کے اختلاف کے باوجود سب پاکستانی اس ملک کی تعمیر و ترقی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ قائد کا مکالمہ بین المذاہب کا یہی تصور اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔ یہ مکالمہ عقائد کی تنگنائیوں سے نکل کر اخوت انسانی کے جذبے پر استوار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نعیم نے مکالمے کی اس تعریف اور تشریح کے لیے قرآن مجید، بائبل مقدس، حدیث نبی کریم ﷺ، صوفیائے کرام کے ساتھ پاکستان کے قابل احترام علماء کی کتابوں سے جا بجا حوالے دیے ہیں۔

آج کے دور میں انسان ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ جنگوں اور فتوحات کا دور ختم ہوتا جا رہا ہے تاہم آج بھی مغرب میں اور مشرق میں بعض ممالک قوت، غلبے اور جنگ کے لیے مذاہب کی زبان استعمال کر رہے ہیں۔ اس فضا میں یہ کتاب غلبہ اور فتح کی بجائے محبت کے مکالمے کی دعوت دیتی ہے۔ حالیہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جنگ وجدل اور تصادم سے مسائل حل کرنے کا نظریہ اپنی موت آپ مر رہا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ مکالمے سے، گفت وشنید سے اور افہام وتفہیم سے مسائل حل کیے جائیں۔ بین المذاہب ہم آہنگی صرف خوشنما نعرہ نہیں آج کی ضرورت ہے۔ کل تک مکالمہ کا مطلب

مناظرہ، غلبہ اور تبدیلی مذہب سمجھا جاتا تھا۔ آج کا مکالمہ مذاہب سے آگاہی، احترام اور مسلمہ دینی اقدار کے لیے جدوجہد میں اشتراک کا نام ہے۔

ڈاکٹر نعیم مشتاق نے اس کتاب میں مکالمے کے فکری اور تاریخی پس منظر کا تعارف پیش کرنے کے بعد پاکستان میں مکالمہ محبت کی راہ میں رکاٹوں کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم کردار کی بجائے شکل وصورت، خدا کی بجائے جماعت گروہ بندی اور فکر وعمل کی بجائے شخصیت، وسعت کی بجائے تنگ نظری اور کلام الٰہی کی بجائے نصابی کتابوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

آخر میں انہوں نے محبت کے چار تصورات پیش کیے ہیں:

۱۔ انسان خدا کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے۔

۲۔ الہامی کتابوں کے نزول کا مقصد انسانیت اور طمانیت قلب ہے۔

۳۔ طعن فی الدین ممنوع ہے۔

۴۔ کرامت انسانیت۔

پوری کتاب مکالمے کے انداز میں ہے۔ روایتی مکالمے کے طور پر نہیں جس میں سوال وجواب کا پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے، بلکہ یہ ایسا مکالمہ ہے جس میں نعیم مشتاق قاری سے مخاطب ہیں اور اس پورے خطاب میں قاری خود کو شریک گفتگو سمجھتا ہے۔

ہمارے خیال میں ڈاکٹر مشتاق کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں، لیکن یہ قوی امید ہے کہ اس کتاب سے قاری کے دل ودماغ میں خود اپنے آپ سے مکالمے کی چنگاری پھوٹے گی، کیونکہ یہیں سے مکالمہ محبت کی ابتداء ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پروفیسر محمد الیاس اعظمی

کالج آف شریعہ منہاج یونیورسٹی-لاہور

آج کا دور جس میں ہم زندگی گزر بسر کر رہے ہیں یہ سائنسی اور علمی دور کہلاتا ہے اور اسے دلیل کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات درست ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج چاند کو مسخر کرنے کے بعد زہرہ کو زیر دام لانے کے لیے سیارہ گانِ فلکی پر کمندیں ڈالنے کی خواہش رکھنے والا انسان اپنی ذاتی زندگی اور عملی اعتبار سے انسانیت کے زیور سے عاری ہو چکا ہے۔ اخلاق نام کی کوئی چیز آج معاشرتی زندگی میں نہیں پائی جاتی۔ مادیت اور مادہ پرستی نے انسان کو اپنے چنگل میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ مذہب اور مذہبی نظریات کی کوئی قدر اس کی نگاہوں میں باقی نہیں رہی۔ روشن خیالی، اعتدال پسندی وسعت نظری ایسی خوش کن مگر بے روح اصطلاحات اسی طرز عمل کا نتیجہ ہیں مگر اس کے باوجود دنیا میں اضطراب بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

موجودہ مادیت پرستی کے سب سے زیادہ اثرات مذہب پر مرتب ہوئے ہیں۔ تاریخ انسانی میں مذہب ہمیشہ ایک ایسے عنصر کے طور پر موجود رہا ہے جس کے باعث معاشرے میں اخوت و محبت اور ایثار کے جذبات پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن مذہبی اقدار کے بندھن کو توڑ کر نئے نئے تصورات زندگی اور مزعومہ جدید نظریات کے باعث انسان عداوتوں میں بدل چکے ہیں۔ ہر مذہب جو اپنے پیروکاروں کو انسانی ہمدردی اور قوت برداشت کا درس دیتا تھا مذہبی اقدار کے مٹنے کے باعث وہ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ احوال زمانہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان اخلاقی و مذہبی اقدار کو پھر سے بحال کے جائے تا کہ اس آتش کدہ جہاں کو ایک مرتبہ پھر سے بہشت نشاں بنایا جا سکے۔

کرۂ ارضی پر بسنے والے انسانوں کی اکثریت بلاشبہ الہامی مذاہب کی پیروکار ہے جب کہ غیر الہامی مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد تھوڑی ہے اور پھر الہامی مذاہب یہودیت، مسیحیت اور اسلام میں سے عددی اعتبار سے اکثریت مسیحیت سے وابستہ ہے جبکہ مسلمان تعداد کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہیں۔ اندریں صورت دنیا کے اندر امن و آشتی پیدا کرنے کے لیے زیادہ ذمہ داری بھی انہی دونوں مذاہب اور ان کے ماننے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات تمام دنیائے انسانی اور بالخصوص مسلمانوں اور

مسیحی حضرات کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ جب تک یہ دونوں مذاہب اپنا کردار ادا نہیں کریں گے اس وقت تک دنیا کو امن کا گہوارہ نہیں بنایا جا سکتا مگر افسوس صد افسوس کہ اس وقت صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ عالمی سطح پر سیاسی واقتصادی طور پر تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں پر اگر غور کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عالم یہودیت اور مسیحیت باہمی گٹھ جوڑ کے ذریعہ صفحۂ ہستی سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کے درپے ہیں جس کے ردِ عمل کے طور پر پوری دنیا بلکہ اسلامی ممالک میں بھی مسلمان اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور اپنے دین و ایمان کی بقاو حفاظت کے لیے دفاعی جنگ کر رہے ہیں جس میں کہیں اعتدال اور کہیں افراط و تفریط بھی پائی جاتی ہے جس کے باعث کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونا ایک یقینی امر ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان معاشروں میں پایا جانے والا اضطراب بلا سبب نہیں ہے بلکہ اس کی واضح وجوہات موجود ہے۔ جب تک ان وجوہات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لے کر انہیں ختم نہیں کیا جاتا اس لمحہ تک امن عالم کا قیام ایک خواب تو ہو سکتا ہے مگر وہ حقیقت کا روپ کبھی نہیں دھار سکتا۔

ہمارے انتہائی مہربان محترم ڈاکٹر نعیم مشتاق جو اپنے سینہ میں ایک حساس دل رکھتے ہیں قسیم ازل سے انہیں وسعت ذہنی کے ساتھ راست فکری کی دولت گراں مایہ بھی نواز رکھا ہے۔ انہیں یہ اعزاز شرف بھی حاصل ہے کہ وہ موجودہ دور میں جب کہ عالمی سطح پر مذہبی میدان میں مکالمہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، بلکہ بہت سی نامور شخصیات کی طرف سے باقاعدہ اس کے لیے عملی اقدامات کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے اس ماحول میں ڈاکٹر نعیم مشتاق ایک معتدل مسلم سکالر کے طور پر سامنے آ رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ''مسیحیت، اسلام اور مکالمۂ محبت'' ان کی راست فکری، اعتدال پسندی کی واضح دلیل ہے۔ پوری کتاب معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اسلوب نگارش بڑا ہی دلچسپ اور دل موہ لینے والا ہے۔ کتاب پڑھ کر قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مصنف نے اپنے موقف کو انتہائی قرینے سے دلائل و براہین کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ان کے موقف اور استدلال سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس کی بڑی گنجائش بھی موجود ہے مگر ان کے حسن نیت اور دین اسلام سے لگن میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔

محترم نعیم مشتاق صاحب سے راقم کی شناسائی کا زمانہ تقریباً ڈیڑھ دہائی پر مشتمل ہے۔ اس دوران طویل و قلیل متعدد ملاقاتیں بھی ہوئیں بلکہ گزشتہ تقریباً آٹھ سال سے منہاج القرآن علماء کونسل فیصل آباد کے زیر اہتمام بغدادی جامع مسجد گلبرگ میں تقابل ادیان کے حوالے سے مطالعہ مطالعہ قادیانیت و مسیحیت کورس میں بالخصوص مسیحیت کے موضوع پر ان کے تحقیقی و تجزیاتی اور فکری لیکچرز سننے کا بھی موقع ملتا ہے۔ میں نے ہر مقام اور ہر ملاقات پر موصوف کو متانت، سنجیدگی، علم و تحقیق اور سب سے بڑھ کر ایک

اچھے اخلاق کا انسان پایا ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کا دھیما پن ہمیشہ جذبات پر غالب رہتا ہے۔ نعیم مشتاق کی یہ شخصی خوبی ان کی زیر نظر تحریر میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

مکالمہ بین المذاہب کے موضوع پر موصوف نے اپنے اس علمی صحیفہ کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے قاری کے لیے مزید سہولت پیدا کر دی ہے۔ مصنف نے مناظرہ اور مکالمہ میں فرق واضح کرنے کے بعد ۱۸۵۷ء و مابعد کے ہندوستان کے مناظراتی دور کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر بھی تبصرہ کیا ہے اور آخر میں موجودہ حالات سے نجات پانے کے رہنما اصول کی بھی نشان دہی کی ہے۔ اسلام اور مسیحیت دونوں مذاہب کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کسی بھی مرحلہ پر اسلام کی صداقت وحقانیت سے بھی روگردانی نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء ہے کہ وہ ذاتِ قدوس مصنف کی اس علمی کاوش اور خدمتِ دینی کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے۔ اور انہیں مزید توفیقات ارزانی کرے تاکہ یہ اسی طرح دینی وعلم خدمات سرانجام دیتے رہیں۔ **آمین بحرمة سيدالاولين والآخرين محمد خاتم النبيين صلى عليه رب اللعالمين .**

۴ مارچ ۲۰۰۷ء

(۱۴ صفر المظفر ۱۴۲۸ھ)

☆☆☆☆☆☆☆☆

خالد رحمٰن

ڈائریکٹر جنرل

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

انسان کو عام طور پر سماجی حیوان قرار دیا جاتا ہے جو دراصل اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ میل جول اور ربط وتعلق اس کی فطری ضروریات ہیں جن کو پورا کرنا ممکن نہ ہو تو اس کے لیے زندگی نہایت اذیت ناک ہو جاتی ہے۔ دوسری جانب انسانوں کی اپنی اپنی شناخت ہوتی ہے۔ یہ شناخت ان کے تعارف کا ذریعہ بنتی ہے اور تنوع کی صورت میں انسانی زندگی کو حسن بھی فراہم کرتی ہے۔ یہی تنوع انسانی تمدن اور تخلیق کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے تحریک فراہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خالق کائنات نے انسانوں کو ارادہ اور عمل کی آزادی دی ہے تو یہ ان کی آزمائش ہے کہ جہاں وہ اس آزادی کو اپنے حق میں استعمال کریں، وہیں دوسروں کے لیے بھی اس حق کا احترام کریں۔ شناخت اور عمل کی اس آزادی کو متوازن طور پر استعمال کیا جائے تو دنیا محبت اور امن وسکون کا گہوارہ بن سکتی ہے تاہم اگر شناخت تعصب میں ڈھل جائے اور فکر وعمل کی بنیاد یہی تعصب بن جائے تو انسانوں کو ایک دوسرے کے لیے گوارا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور مسیحیت دونوں الہامی مذہب ہیں۔ اسلام پر تو ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک حضرت عیسیٰ سمیت تمام انبیاء پر ایمان نہ لایا جائے۔ دونوں مذاہب اپنی تعلیمات کے اعتبار سے عدل وانصاف، تحمل وبرداشت، رواداری، انسانوں کی عزت واحترام اور خدمت کی تلقین کرتے ہیں تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر مذہب کے پیروکاروں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو تعصب کی بناء پر عدل وانصاف کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر قیادت کے منصب پر فائز ہوں تو اس طرز عمل کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں اور قیادت کا یہ منصب جس قدر بلند اور بڑی سطح سے متعلق ہو منفی اثرات اتنے ہی شدید اور وسیع تر دائرے میں ہوتے ہیں۔

آج کی دنیا کا المیہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر اعلیٰ ترین قیادت پر وہ لوگ فائز ہیں جو تہذیبی تصادم اور اقدار کے اختلاف کے عنوان سے اندھا دھند اقدامات کے ذریعہ دنیا کو جنگ وجدل، دہشت گردی اور تصادم کی جانب دھکیل رہے ہیں۔ اس عمل میں ان کے سیاسی مفادات اور مذہبی تعصبات اس طرح یکجا

ہو گئے ہیں کہ دونوں کو علیحدہ علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ یہ وہ صورتحال ہے جہاں ردِعمل بھی کسی ایک دائرے میں محدود نہیں رہ سکتا۔ سو اس کے مظاہر بھی دنیا بھر میں نظر آ رہے ہیں چنانچہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔

بلاشبہ یہ ایک سنگین صورتحال ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لیے مذاہب کی حقیقی تعلیمات اور ان پر عمل درآمد کی جانب انسانوں کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ احساس تازہ کرنا کہ نفرت، نفرت کو جنم دیتی ہے اور جنگ وجدل سے انسانوں کو جسمانی طور پر تو فتح کیا جا سکتا ہے، دلوں کو نہیں جیتا جا سکتا۔ چنانچہ دلوں کو جیتنے یعنی اپنے نظریات کو آگے بڑھانے کے لیے بھی ناگزیر ہے کہ انسانوں سے محبت کی جائے اور باہم احترام، تبادلۂ خیال اور مکالمہ کا ماحول پیدا کیا جائے۔

نعیم مشتاق صاحب نے ''مسیحیت، اسلام اور مکالمۂ محبت'' میں یہی پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ ہر انسانی کوشش میں بہتری کی گنجائش ہوتی ہے اس اعتبار سے نعیم مشتاق صاحب کی اس کوشش کو بھی حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم ایک اہم اور حساس موضوع پر جس پیش قدمی کا انہوں نے آغاز کیا ہے اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کوششوں میں انہیں کامیابی عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تنویر احمد خان

مصنف، شاعر

نیشنل یوتھ ایوارڈ ۲۰۰۴ برائے حقوقِ انسانی وسماجی بہبود

اکیسویں صدی اپنے ساتھ تضاد، تصادم اور تشدد کے نئے رجحانات لے کر آئی ہے۔ دنیا بھر میں رجحان ساز قوتیں اور ادارے جنگوں کے جواز پر اپنی تمام تر قوتیں صرف کر رہے ہیں۔ طاقت کی عالمی بساط میں سیاسی مہرے تو پہلے ہی عدم برداشت کی چالوں کے عادی تھے لیکن اب سیاست کے ساتھ ساتھ صحافت، تعلیم، ادب اور مذہب کے ادارے عدم رواداری اور انتہاپسندانہ رجحانات کا شکار ہو چکے ہیں۔ الیکٹرانک ہو یا پرنٹ میڈیا، دو دہائیوں میں دونوں نے انسانیت کو قریب لانے کی بجائے دوریاں ہی پیدا کی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں محققین نے امن کے امکانات کی بجائے تباہی اطوار پر تحقیق کی۔ ادھر محبت اور مذہب کے نمائندوں نے دیگر مذاہب کے لیے نفرت، دل آزاری اور تضحیک پر مبنی رویوں کی حوصلہ افزائی کی۔ نتیجتاً تہذیبوں کے تصادم کے اس موڑ پر انتشار اور خلفشار کے علاوہ نہ کچھ سجھائی دیتا ہے نہ دکھائی۔

ایسے میں کہ جب ہر کوئی دوسرے کو غلط ثابت کرنے پر لگا ہوا ہے مسجد، کلیسا، قلم اور کتاب، مورچے اور بندوقیں بن چکے ہیں ڈاکٹر نعیم مشتاق کی یہ جرأت مندانہ کاوش حبس زدہ ماحول میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس ہوتی ہے۔ تندئ بادِ مخالف میں اڑنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے فولادی ارادوں اور مضبوط پروں کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نعیم مشتاق کی یہ کوشش ان کے ارادوں کی مضبوطی اور مقصد کی لگن کا واضح ثبوت ہے۔ ایسے وقت میں یہ جسارت اور بھی حساس ہو جاتی ہے کہ جب آپ کا اپنا تعلق مظلوم اور متاثرہ فریق سے ہو اور آپ اپنے ہی لوگوں کو امن کی بات کر رہے ہوں۔ آج دنیا بھر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات، حیات، تعلیمات اور امت سب ہی سازشوں کا شکار ہیں۔ کشمیر، فلسطین، عراق، افغانستان، چیچنیا، سوڈان، صومالیہ اور دیگر بہت سے ممالک صرف کلمہ گو ہونے کی وجہ سے براہ راست جنگوں کی زد میں ہیں جبکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی بچھائی گئی بساط پر یورپ امریکہ اور ایشیا سمیت دنیا بھر کے تمام مسلمان انسانیت کے لیے غیر اعلانیہ طور پر مشکوک قرار دے دیے گئے ہیں۔ اگر ہر عمل کا ردِعمل ہے تو ظلم وجبر کا ردِعمل یقیناً انتہاپسندانہ ہی ہوگا۔ سمجھنے کی بات یہی ہے کہ بعض دفعہ وہی

انتہا پسندانہ ردعمل ہی تو مطلوب ہوتا ہے تا کہ مزید جبر کی بنیاد باندھی جاسکے۔ لیکن یہ بات بہت مشکل ہے کہ آپ کو زخم تو آئے مگر تکلیف کا احساس ظاہر نہ ہو۔ اسی ڈاکٹر نعیم مشتاق نے شاید دانش مندانہ ضبط کا مظاہرہ کیا ہے۔

حملے کے جواب میں حملہ فطری امر ہے۔ لیکن بعض اوقات بغیر منصوبہ بندی کے کوئی بھی اقدام آپ کے اپنے مفادات کو متاثر کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ وقت جنگ کا نہیں مکالمے کا ہے اور شاید مکالمے کا بھی نہیں بلکہ مکالمۂ محبت کا ہے۔

اگر ہم نے انسانیت کو کسی انتہائی اور مسلسل تباہی سے بچانا ہے تو برداشت اور رواداری پیدا کیے بغیر یہ ممکن نہیں ہوگا۔ اور اس کے لیے اولین مخاطب ہمیں خود ہونا ہے۔ ''مکالمۂ محبت'' بھی ڈاکٹر نعیم مشتاق کا ایک ایسا ہی بصیرت افروز اقدام ہے۔

ڈاکٹر نعیم منفرد طرزِ کلام کی حامل شخصیت ہیں۔ وہ کئی عالمی مباحثوں میں شریک ہو چکے ہیں لیکن کبھی انہوں نے کسی مباحثے کو میدان جنگ نہیں بنایا جس میں کسی کو ہرانا اور خود جیتنا مقصود ہو بلکہ انہوں نے تقسیم کی بجائے تفہیم کو اپنا مقصود بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ، یورپ اور ایشیا بھر میں ڈاکٹر نعیم مشتاق کو اصلاح پسند حلقے خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مسیحیت اور مکالمہ محبت میں ڈاکٹر صاحب اس حساس وقت میں نازک ایشوز کو بہت حد تک کامیابی کے ساتھ زیر بحث لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ کہیں کہیں دکھ کی تلخی ڈاکٹر صاحب کے تبصروں میں جھلکتی ہے لیکن پھر بہت جلد وہ اپنے حکیمانہ اسلوب کو اپنے اظہار میں سمو لیتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کاوش مذہبی اور تہذیبی رواداری کی بنیاد میں ایک گراں قدر کاوش ہو اور اس چراغ سے مزید چراغ بھی روشن ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

احمد سلیم

(مصنف نقاد، ریسرچ اسکالر)

پاکستان میں جہاں ایک طرف من مانی مذہبی توجیہات اور تشریحات کے باعث انتہاپسندانہ رجحانات میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہیں بین المذاہب مکالمے نے ایک سنجیدہ معاشرتی عمل کی بجائے مقبول عام فیشن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں انتہاؤں کے یہاں گہری علمی بصیرت کا فقدان ہے اور اس کی بجائے جذباتی اور ہیجان انگیز نعرے بازی اور کھوکھلی منطق کا غلبہ نظر آتا ہے۔ یہ خلاصہ ہے ڈاکٹر نعیم مشتاق کے فکر انگیز مطالعے ''مسیحیت، اسلام اور مکالمۂ محبت'' کا جس میں انہوں نے دونوں مذاہب کے حقیقی اور جعلی مکاتب فکر کا الگ الگ تجزیہ کر کے صورت حال کو واضح کیا ہے۔ یہ مطالعہ ایک علمی محاکے کی بجائے حق کی تلاش و جستجو کی ایک مخلصانہ کوشش نظر آتی ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ڈاکٹر نعیم مشتاق نے بین المذاہب مکالمے کی بجائے مکالمۂ محبت کی اصطلاح استعمال کی ہے جو اس مکالمے کی سچی بنیاد ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے چونکانے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسئلے کے بنیادی پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔

زیر نظر تحقیق مقدمے، چار ابواب اور حرفِ آخر پر مشتمل ہے اور اس کا انتساب ہر محب وطن پاکستانی کے نام ہے خواہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم ڈاکٹر نعیم کے نزدیک پاکستانی ہونے کی شرط مسلمان ہونا نہیں بلکہ حب وطن ہے۔ خواہ آپ کا تعلق کسی بھی عقیدے، مسلک یا سلسلے سے ہو اور یہ وہی فکر ہے جس کا اظہار قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی کے خطاب میں کیا تھا۔ یہ مطالعہ فکر قائد کی ایک طرح سے تشریح و توضیح ہے۔

مقالہ نگار نے کسی ایک مسلک یا عقیدے کی حمایت کرنے کی بجائے معروضی انداز اختیار کیا ہے اور دونوں ادیان کے رہنماؤں کی غلطیوں کو یکساں تنقید کی نظر سے دیکھا ہے۔ اپنے مقدمے میں مصنف نے اس امر سے بحث کی ہے کہ مناظرہ سے مکالمہ اور مکالمہ سے محبت تک کا سفر کیسے طے کیا جائے۔ کہیں بھی انہوں نے اسلام کی حقانیت سے روگردانی نہیں کی ہے اور نہ ہی مسیحیت کے مثبت پہلوؤں سے پہلوتہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے باب میں وہ ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے نوآبادیاتی ہندوستان میں ہونے والے مناظروں کی بحث کو سمیٹتے ہوئے موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔

دوسرا باب اس سوال سے عبارت ہے کہ ہماری موجودہ معاشرتی صورتِ حال میں مکالمۂ محبت کی راہ میں کون سی رکاوٹیں ہیں۔ اس ضمن میں وہ چھ رکاوٹوں سے بحث کرتے ہیں۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے کہ کردار پرستی کی جگہ ہم حلیہ پرستی کا شکار ہیں۔ خدا پرستی کی جگہ ہم نے جماعت پرستی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ فکر پرستی کی بجائے شخصیت پرستی ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ قابلیت پرستی سے روگردانی کر کے ہم عنوان پرستی کی علت کا شکار ہیں۔ اجتہاد کی جگہ کورانہ تقلید نے ہماری معاشرتی صورت حال میں بگاڑ پیدا کر دیے ہیں۔

ڈاکٹر نعیم مشتاق تقلید اور تقلید پرستی میں بھی فرق واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ''تقلید تو یہ کہتی ہے کہ موجودہ مسائل کے حل ماضی کے بزرگوں کے علمی وفکری کارناموں اور اجتہادی اصولوں کی روشنی میں دوبارہ قرآن وسنت اور بائبل مقدس سے دریافت کیے جائیں جبکہ تقلید پرستی ماضی کو حال اور مستقبل پر زبردستی مسلط کرنے کا نام ہے''۔ معاشرتی بگاڑ کا چھوٹا سبب یہ ہے کہ ہم کلام پرستی کی جگہ نصاب پرستی سے چپکے ہوئے ہیں۔ تیسرے باب میں ڈاکٹر نعیم حقیقی اور موثر مکالمۂ محبت کے چار بنیادی تصورات سے بحث کرتے ہیں جس سے خدا اور بندے اور خود بندوں کے مابین رشتے کی وضاحت ہوتی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر نعیم مشتاق نے جن دو امور کو وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، انہیں اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو مکالمۂ محبت کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

۱۔ افراد کی خرابیاں، دین کی خرابیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے اپنے کردار اور عمل کی خرابیاں ہیں۔ اگر ''راہبوں اور دیگر مسیحی پیشواؤں کے گھناؤنے کردار کو، ان کے مذہبی نظریات وعقائد کی بگاڑ کا نتیجہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر اسے دنیا بھر کے اسلامی معاشروں اور مسلمانوں پر لاگو کرنے میں کبھی کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ .... جس منطقی اصول کے تحت مسیحیت باطل قرار پاتی ہے اس سے اسلام بھی (معاذ اللہ) باطل مذہب ٹھہرتا ہے۔

۲- مکالمہ کے لیے ضروری ہے کہ اسلام اور مسیحیت دونوں کی متفقہ تعلیمات کو اہمیت دی جائے اور اختلافی امور دائرہ اخلاق میں رہ کر بیان کیا جائے۔ ''اختلافی مسائل پر مکالمہ کا آغاز کر کے مکالمہ کے عمل کا صرف بیڑہ غرق کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک مکالمہ، اعتقادی اختلافات کی بجائے باہمی متفقہ عقائد ونظریات پر فوکس کرنے کا نام ہے....''۔

ڈاکٹر نعیم مشتاق کی زیر نظر کتاب توازن، تحمل اور استدلال کا خوبصورت امتزاج ہے جس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

﴿مصنف کی دیگر کُتب﴾

☆

حدیث نبوی ﷺ

﴿من یرد اللہ به خیرا یفقهُ فی الدین، و انما انا قاسم و اللہ یعطی﴾

اللہ جس کا بھلا چاہتا ہے اسے دین کا فہم بخش دیتا ہے،

میں تو بانٹنے والا ہوں، دینے والا تو اللہ ہے۔

(الصحیح البخاری، کتاب العلم، حدیث ۷۱)

﴿مصنف کی دیگر کتب﴾

۱۔ تفسیر اناجیل اربعہ: اسلامی نقطہ نظر سے۔
۲۔ انجیل برنباس: ایک علمی و تحقیقی جائزہ۔
۳۔ تصور امن: اسلامی اور مسیحی تعلیمات کی روشنی میں۔
۴۔ اسلام، مسیحیت اور مقصد حیات۔
۵۔ اسلام، مسیحیت اور تصور محبت۔
۶۔ عہد نامہ جدید: ایک تعارف۔
۷۔ بائبل مقدس: ایک تعارف۔
۸۔ مسیحی مسلم مکالمہ اور بنیادی انسانی حقوق۔
۹۔ قرآن مجید اور بائبل مقدس کے تراجم میں بنیادی فرق۔
۱۰۔ مقام عقل: یہودیت، مسیحیت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں۔
۱۱۔ شریعت الٰہی یا فضل الٰہی۔
۱۲۔ کیا شریعت محمدی کے بعد گذشتہ شریعتیں منسوخ ہوگئیں؟
۱۳۔ عقیدہ تحریف بائبل: قرآنِ مجید اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں۔
۱۴۔ مسیحی مشنریوں کے علمی ونفسیاتی حربوں کا سامنا کس طرح کریں۔
۱۵۔ قانون توہینِ رسالت: بائبل اور مغربی تاریخ کی روشنی میں۔
۱۶۔ روح اللہ و کلمۃ اللہ: ہم مسلمان حضرت عیسیٰ کو روح اللہ و کلمۃ اللہ کیوں کہتے ہیں؟
۱۷۔ نغمہ رومی: حیات وتعلیماتِ رومیؒ۔
۱۸۔ اسلام ومسیحیت کے تقابلی مطالعہ پر تحقیق کے درست طریقے
۱۹۔ اسلام میں توریت، زبور اور انجیل کا تصور۔
۲۰۔ ہمارے اسلاف کی علم دوستی اور شان خوداری۔
۲۱۔ صلیبی جنگیں اور مسیحی مسلم مکالمہ۔
۲۲۔ اکیسویں صدی میں دعوت اسلام اور ہماری ذمہ داریاں۔

۲۳۔موروثی گناہ: قرآن مجید اور بائبل مقدس کی روشنی میں۔

۲۴۔معجزاتِ نبوی ﷺ پر مسیحی اعتراضات کا ایک جائزہ۔

۲۵۔عصمتِ انبیاء علیہم السلام از روئے قرآن اور بائبل۔

۲۶۔اسلام کا تصورِ جہاد اور مسیحی و مغربی اعتراضات کا جائزہ۔

English Books/Papers (Religion)

1. *The reality of America's war on Terrorism.*

2. *Introducing Human Rights Education In Inter-Faith Dialogue.*

2. *Bediuzzaman Nursi and The Purpose of life.*

3. *Islam, Christianity and Modern Management Sciences.*

4. *Interfaith Dialogue for Community Cohesion.*

5. *The Concept of Peace in Interfaith Dialogue.*

6. *Concept of Love in Islam and Christianity.*

7. *Christianity, Islam and the Development of Personality*

8. *Christianity, Islam and the Purpose of Life.*

8. *Jesus Christ in Islam.*

10. *Islam and Christianity.*

11. *Islam, Christianity and Dialogue of love.*

12. *The Song of Rumi: Life and Teachings of Mevlana Rumi*

English Books/Articles (Management)

1. *Understanding Work Ethics.*

2. *Stress Management at Workplace.*

3. *Understanding Change Management.*

4. *Leadership in Action.*

5. *Becoming a Professional Hotelier.*

6. *Understanding Performance Management.*

7. *What is Management and Who are Managers?*

8. *Understanding and Developing Positive Attitude.*

9. *Understanding Supervision.*

10. *Understanding Time Management.*

11. *Office Politics or Team Ethics: Managing with Principles.*

12. *The Psychology of Motivation.*

13. *Understanding Team Management.*

14. *Understanding Delegation.*

15. *Goal Setting Techniques.*

16. *Understanding Creativity.*